قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
مئی 2016، قیمت -/15₹
ماھنامہ
اُردو دُنیا
دھلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
BBC
اردو
Voice of America
ریڈیو نشریات اور اُردو
ON AIR

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

کہکشاں ♦ سیاحتی مقامات

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے   سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:18،شمارہ:5،مئی 2016

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88،اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II،نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے   سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 9/33، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ،
نئی دہلی-110025
فون:49539000   شعبۂ ادارت:49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم نئی دہلی۔110066
فون: 26109746،   فیکس:26108159
ای میل:sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ:22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون:040-24415194

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

مصاحبہ
قرۃالعین حیدر سے گفتگو — آصف جیلانی 7

رپورٹ
ممبئی میں 'اردو صحافت کے دو سو سال:
مہاراشٹر کے حوالے سے' سمینار — جاوید جمال الدین 10

ریڈیو اور اردو نشریات
سدھو بھائی شاہین کلب والے — رضا علی عابدی 13
امین سایانی سے انٹرویو — صدر عالم گوہر 19

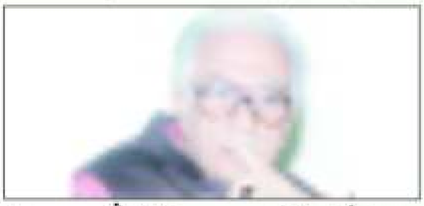

بیرونِ ہند کی اردو نشریات — سہیل انجم 22
معاشرے کی بیداری میں
ریڈیو کا رول — افتخار الزماں 26
کمیونٹی ریڈیو کی تحریک اور امکانات — حسام الدین فاروقی 28
نئے زمانے کا ریڈیو: ایف ایم ریڈیو — تنزیل اطہر 30
بہار میں اردو کے
ریڈیائی ڈرامے: 1980 کے بعد — زین رامش 32
ریڈیو اور موجودہ سماج — محمد اخلاق 35

ادبی مباحث
سائے کا قتل اور روشنی کی آواز — محمد عارف اقبال 37
حالی اور برکھا رت — جگر تجمل اسلام 40

سلسلۂ صحافت
اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد
'ادب لطیف' (لاہور)، 'شاعر' (ممبئی) — احمد سہیل 42

خراج عقیدت
انور سدید: احوال و آثار — چودھری ابن النصیر 45
ادب کا رجل رشید — منور حسن کمال 49
فوزیہ چودھری کی آخری ساعتیں — شائستہ یوسف 51
فوزیہ چودھری — وصی اللہ بختیاری 56

تہذیب و ثقافت
غالب کی حویلی — فیروز بخت احمد 58

سائنس
قرانِ عطارد — انیس الحسن صدیقی 61

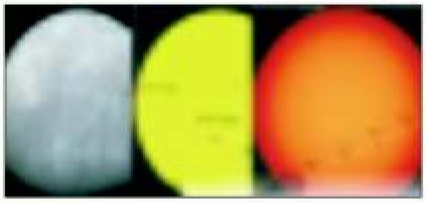

کوئز
ادبی کوئز — امتیاز احمد الائی 63

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 65

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 76

ہماری بات

تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

صادق حسین صادق نے یہ شعر کسی بھی تناظر میں کہا ہو مگر اس شعر میں بڑی سچائی ہے کہ کبھی کبھی نامساعد حالات انسانی حیات کے لیے بڑے محرک ثابت ہوتے ہیں۔ عام حالات میں جن کارناموں کا تصور ناممکن ہوتا ہے وہ ایسی صورت میں انجام پا جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں آندھی میں چراغ جلانے والے ہی حوصلہ مند کہلاتے ہیں۔

ہمارے بزرگوں نے ماضی میں ایسے کتنے چراغ جلائے ہیں۔ ان چراغوں کی روشنی آج بھی قائم ہے۔ انھوں نے اندھیروں میں اپنے حصے کی شمع جلا کر معاشرے کو روشن کرنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بزرگ آج بھی ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور ان کے افکار سے ہم کسب نور کرتے رہتے ہیں۔

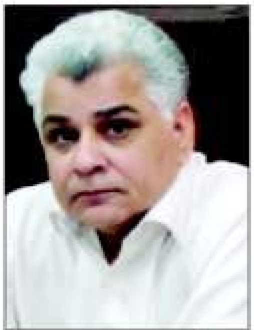

تاریخ کے صفحات پر بہت سے ایسے واقعات روشن ہیں۔ آزادی کی تحریک پر ہی نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مجاہدین آزادی نے اسیری کے دوران اپنے قیمتی لمحات کو اپنی قوم اور ملک کے لیے وقف کیا اور دنیا کو روشن تحریریں دیں۔ زندانی ادب کا ایک بڑا سرمایہ انھی مجاہدین آزادی کے فیض سے ہم لوگوں تک پہنچا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی 'غبارِ خاطر' ہو، حسرت موہانی کی 'مشاہداتِ زنداں'، مولانا ظفر علی خان کی 'قیدِ فرنگ' ہو یا سجاد ظہیر کی 'نقوشِ زنداں' انھوں نے جیل میں رہ کر ایسی تحریریں دیں کہ آج بھی ان کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ اگر یہ مجاہدین حالات سے گھبرا جاتے، مایوسی یا افسردگی کے شکار ہو جاتے تو جرأت اور حوصلہ مندی سے بھرپور یہ تحریریں ہمارے سامنے نہیں آتیں۔ ہمارے ان اکابر نے بادِ مخالف میں بھی اپنے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا بلکہ بڑی استقامت کے ساتھ ناموافق حالات کا مقابلہ کیا اور بعد کی نسلوں کو یہ سبق دیا کہ وہ ایسے حالات سے ملول خاطر نہ ہوں بلکہ ان سے سبق لے کر اپنے اندر عزم اور حوصلہ پیدا کریں تو راستے کی ساری رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی۔

ان اکابر کی زندگیوں میں ہمارے لیے بہت بڑا سبق ہے مگر ہم میں سے بیشتر لوگ ان مجاہدین کی قربانیوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ خاص طور پر نئی نسل ان کی جدوجہد سے نابلد نظر آتی ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی مٹی اور ملک کی محبت میں جو قربانیاں دی ہیں اس سے نئی نسل کو واقف کرانا ہم سب کی ذمے داری ہے۔ گذشتہ دنوں ممبئی میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'اردو صحافت کے دو سو سال' سمینار سے خطاب کرتے ہوئے مہاراشٹر کے گورنر عزت مآب سی ودیا ساگر راؤ نے یہ اشارہ دیا کہ جو تحریک آزادی ہند کے سرخیل رہنما ہیں ان کی قربانیوں سے ہندوستان کا عام آدمی ناواقف ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ قومی ہم آہنگی اور اتحاد کے لیے جو کوششیں ان مجاہدین کی ہیں انھیں عوام تک پہنچانا آج کے عہد میں بہت ضروری ہے۔ ان کے اس خیال کی روشنی میں دیکھا جائے تو حقیقت یہی ہے کہ ان مجاہدین آزادی کی قربانیوں سے ایک بڑا طبقہ ناآشنا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ان مسلم مجاہدین کے بارے میں اردو کے علاوہ ہندوستان کی دیگر زبانوں میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف ہندی انگریزی ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی دیگر علاقائی زبانوں میں بھی ان کی خدمات اور کارناموں کے تعلق سے کتابیں لکھی جائیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ ان مجاہدین کے کارناموں اور قربانیوں سے آگہی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کا عام آدمی آزادی کی تحریک میں اردو کے کردار سے بھی واقف ہوگا۔ اردو کی شیرینی اور اس کی مٹھاس سے بھی آگاہ ہوگا اور انھیں احساس ہوگا کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جس نے ہندوستان میں قومی ہم آہنگی اور اتحاد کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے اور حب الوطنی اس زبان کے خمیر میں شامل ہے۔

'زندانی ادب' کے ساتھ اردو نے نشریاتی ادب کا بھی ایک بیش بہا ذخیرہ ہمیں دیا ہے۔ اس تعلق سے اردو دنیا کے اس شمارے میں ریڈیو نشریات کے حوالے سے کچھ تحریریں شامل کی جا رہی ہیں۔ اردو زبان کے فروغ میں ریڈیو کا بہت اہم کردار رہا ہے۔ خاص طور پر ریڈیو نے ابتدائی دور میں جو معیاری پروگرام پیش کیے ہیں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ عوام سے اردو کا رشتہ جوڑنے میں ریڈیو ایک بہت مؤثر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ اردو کے بڑے بڑے ادیبوں کی ریڈیو سے وابستگی رہی ہے۔ آپ کو ان مضامین سے اندازہ ہوگا کہ اردو زبان نے کس کس طرح ارتقائی سفر طے کیا ہے اور آج 'زندہ زبان' کی حیثیت سے کثیر لسانی معاشرے میں اسے ایک معتبر مقام بھی حاصل ہے۔

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

'اردو دنیا' اپریل کا شمارہ ملا۔ امریکہ سے بیگم کی بڑی بہن اور ان کی بیٹی اور دوسری بھانجی اور اس کی بیٹی مانچسٹر سے آئے ہوئے ہیں۔ ایسے میں فوراً رسالہ پڑھنا مشکل ہے۔ میں مارچ کا شمارہ بھی ٹھیک سے نہیں مطالعہ کرسکا۔ فرصت ملی تو اردو کانفرنس کی رپورٹ اور چیدہ چیدہ مضامین پڑھوں گا، بظاہر پرچہ بہتری کی طرف مائل پرواز ہے۔

مقصود الٰہی شیخ: بریڈفورڈ، انگلینڈ

اپریل ماہ 2016 کے شمارے کے آغاز میں ہی انگریزی ناول نگارہ جین آسٹین کے ناول 'پرائڈ اینڈ پریجڈس' سے محولہ ایک فقرے کے یہ صحیح الفاظ اشاعت کے لائق تھے۔

"If there is a real superiority of mind, pride will be always under good regulation."

نثار احمد صدیقی صاحب کا حمایت علی شاعر جیسے بلند پایہ شاعر و مختلف الجہات ادیب پر مبنی مشافہہ قابلِ ستائش ہے۔ اس میں صفحہ 7 پر 'خم و پیچ' الفاظ کی بجائے اردو زبان میں رائج 'پیچ و خم' درکار تھے۔ ص 9 پر بھی تیسرے کالم میں 'اگر' لفظ کی جگہ 'اس لیے' یا 'پھر' 'لہٰذا' لفظ چاہیے تھا۔ مضمون میں اس عظیم شاعر کے مزید اشعار کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا۔ ویسے اس مشافہے میں جتنے معقول سوالات ہیں، اتنے ہی مناسب و موزوں جوابات بھی ہیں۔

یوپی کے امروہہ جیسے شہر سے مصحفی، کمال امروہی، جیسے متعدد شعرا کی ہی مانند زبیر رضوی بھی اسی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے زریں دستخط بھی اردو ادب کی تاریخ میں مرتسم ہو چکے ہیں۔ ان کی غزلیات سے متعلق بھی مزید ایک مضمون شائع ہونا اس دورِ حاضر کی مانگ ہے۔

انفرادی حیثیت کے حامل شاعر ندا فاضلی کے لاتعداد اشعار عوام الناس کو ضرب المثل کی مانند ازبر و حفظ ہو چکے ہیں۔ وہ بھی شاعر کے بقیدِ حیات رہتے ہوئے۔

ڈاکٹر بی محمد داؤد محسن صاحب نے سنیما کے تناظر میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے پر معیاری مضمون لکھا ہے۔ اس میں یہ شعر ''دن بھر دھوپ کا پربت کاٹا، شام کو پینے نکلے ہم....'' ہدایت کار جے پرکاش چوکسے کی بنائی فلم 'شاید' کے ایک نغمے کا ہے۔ ندا فاضلی نے یہ سطور ''دن بھر دھوپ کا پربت کاٹا، شام کو پینے نکلے ہم....'' تیار کی تھیں۔ اس نغمے کے گلوکار منا ڈے تھے اور دھن مانس چکرورتی کی بنائی ہوئی تھی۔ مقالے میں صفحہ 60 پر فلم 'ساتھی' کے نغمے ''تو ہی نظروں میں۔'' دوسری مرتبہ 'نظروں' لفظ کے بجائے 'نظاروں' درکار تھا۔ فلم 'جس دیس میں....'' بول میں 'دیس' کی جگہ 'دیش' لفظ چاہیے تھا۔ ندا صاحب سے آخری مشافہہ شائع کرنا اسی جریدے کا حصہ ہوسکتا تھا۔

کرشن بھاوک: A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ

'اردو دنیا' مارچ 2016 کا شمارہ اپنی امتیازی خوبیوں اور حسن طباعت و کتابت کے ساتھ ساتھ مشمولات سے مزین و مرصع موصول ہوا۔ اس کے حسب ذیل بیش بہا مضامین زیادہ پسند آئے اور ان کے پڑھنے سے اپنے محدود علم میں اضافہ ہوا۔

اردو صحافت کے دوسو سال ماضی، حال اور امکانات، اقلیتی درس گاہوں کا نظام تعلیم: نصاب کی جدید کاری کی ضرورت، علوم و فنون کی اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز: شہر حیدرآباد، ادبی رسائل سے ممبئی کا اٹوٹ رشتہ، بیسویں صدی کا ایک گم نام شاعر: علیم اختر مظفرنگری، اردو کا نسائی ادب اور خواتین قلم کار، تصوف و بھکتی کی تحریک: اشتراک و اختلاف کے پہلو، صحت کے تحت پپیتا: طبی افادیت سے بھرپور ایک خوش ذائقہ پھل اور تبصرے۔ نسائی ادب کے ضمن میں نذر سجاد حیدر اور مسرور جہاں کا ذکر بھی ہونا چاہیے۔

محمد ہاشم قدوائی: سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

اردو کے تعلق سے پروفیسر ارتضیٰ کریم کا اداریہ بہت معلومات افروز ہے۔ یہ سچ ہے کہ اردو زبان ایک بھرپور رواں دواں تہذیب ہے اور یہ زبان کئی زبانوں کو اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے اور اس میں اور بھی جذب کرنے کی مزید وسعتیں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کا خیال ہے کہ اردو زبان کسی بھی سرکار کی محتاج نہیں ہے۔ کیونکہ یہ گھر گھر کی زبان ہے اور اس کے اندر نمو کی فطری صلاحیت ہے۔ اسے نہ کوئی پھیلنے سے روک سکتا ہے اور نہ تعصب کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ سکتا ہے۔

تازہ شمارے میں خبرنامہ کے تحت تمل ناڈو کے اردو مسائل کے تعلق سے ایک جلسے کی روداد شائع ہوئی ہے جس میں دو تین کالج اور یونیورسٹی کے پروفیسروں اور اسکالروں کے نام درج ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اردو کی حرمت کے یہ احباب کہاں تک محافظ ثابت ہوتے ہیں اور اس کے پنپنے میں نیک نیتی اور اردو دوستی کا کہاں تک ثبوت دیتے ہیں۔ پروفیسر مجید بیدار کا مضمون 'اشاعتی سرگرمیوں کا مرکز حیدرآباد' بھرپور معلومات سے مزین ہے۔ موصوف کے بعض بیانات تاریخی شواہد کے پیش نظر شکوک کے در وا کرتے ہیں جس کی تفصیل یہاں ممکن نہیں ہے۔

علیم صبا نویدی: ٹرپلی کین ہائی روڈ، فلیٹ نمبر 16، چنئی

مارچ 2016 کا تازہ شمارہ ملا۔ زیرنظر شمارے میں اردو عالمی کانفرنس کی روح پرور کامیابی پر اردو صحافت کی چشم دلبری آپ کو ہمیشہ بنظر استحسان دیکھے گی۔ نیشنل کونسل کی اس تنظیم آرائی کا سراپا ممنون ہوں۔ 'ہماری بات' میں آپ کا دلنشیں اداریہ جس میں اردو کا نقش جاوداں فلک

بوس حقیقتوں کے پیرہن میں پڑھ کر میرے احساسات و جذبات مسرت سے پرآب ہوگئے۔

محترمہ ترنم ریاض کا ناول 'برف آشنا پرندے' قابل توجہ ہے۔ ویسے تو یہ ناول میری نظروں سے نہیں گزرا پھر بھی ناول کے نام سے ایسا لگتا ہے کہ ناول کی نفسیات میں حقیقت نوازی کی سرگوشیاں جھلکتی ہوں گی۔ شاذلی حسن خان کی تحریر اقلیتی درس گاہوں میں تعلیم کے نظام جمال میں جدید کاریوں کی آبیاری اور شادابی کے لیے تامل ناڈو میں ایسا کوئی مسیحا نہ پیدا ہوا ہے اور نہ پیدا ہوگا! انتظار حسین کی مغربی تہذیب کی مخالفت کا میں بھی قائل ہوں۔ اسی طرز فکر کا میرا چوتھا ناول 'شاخِ حنا' زیر طباعت ہے۔ محمد مستمر کا مقالہ 'بیسویں صدی کا ایک گمنام شاعر علیم اختر' کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بے نقابی آپ کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے۔ 'پپیتا' کو دکنی زبان میں ''پپائی' کہتے ہیں۔ عبدالناصر فاروقی نے اس پھل کی طبی افادیت پر بہت خوب لکھا۔ بنگال کے حضرت مخدوم جہاں شرف الدین یحییٰ منیری پر محمد منصور عالم کا مضمون پرتاثیر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنارگاؤں کے تہجد گزاروں کی روحانیت کا یہ جذبہ ان کا تاریخ ساز طرۂ امتیاز ہے۔ طلعت عزیز ایک باشعور اہل زبان گلوکار ہیں اور طلعت محمود مرحوم میری پسند ہیں۔ اردو دنیا میں خاص کر عالمی روزنامہ، کونسل کا اہم کالم ہے۔

ڈاکٹر ظہیر آفاق: سکریٹری تامل ناڈو اردو اکادمی

اردو دنیا مارچ 2016 کے مضامین مختلف عنوانات پر مشتمل ہیں۔ تعلیم، تصوف، نسائی ادب، فلم، صحافت، صحت وغیرہ پر کچھ ادھورے کچھ سیر حاصل مضامین دیکھنے کو ملے۔ انیس امروہوی کا ساحرلدھیانوی کی حیات وفن پر ان کے اپنے ذاتی تجربات کے ساتھ مضمون پڑھ کر ساحر کی زندگی کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوگئیں۔ ان کی موت 57 سال کی عمر میں نہیں بلکہ 59 سال کی عمر میں ہوئی۔ (پیدائش: 1921، موت: 1980) ساحر لدھیانوی کے ساحر تخلص اختیار کرنے کی وجہ جو میرے مطالعے میں آئی وہ یہ ہے کہ جب علامہ اقبال کا یہ شعر ان کی نظروں سے گزرا تو وہ مبہوت ہوگئے:

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سیکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی

اس شعر میں لفظ ساحر سے وہ اتنے متاثر ہوئے کہ اسے اپنے تخلص کے طور پر اختیار کرلیا۔ ساحر زن بیزار تو نہیں تھے پھر بھی نہ جانے کیا وجوہات تھیں کہ انھوں نے شادی نہیں کی؟ مضمون میں ان کی شراب نوشی کا ذکر رہ گیا۔ آخر آخر وہ خوب پینے لگے تھے اور ان کی یہی عادت موت کا سبب بنی۔ اردو شعر و ادب نیز فلموں کو انھوں نے اپنے قلم سے جو کچھ دیا ہے وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ایم رفیق: نظام ہاؤس، ڈانگ پورہ یاول، مہاراشٹر

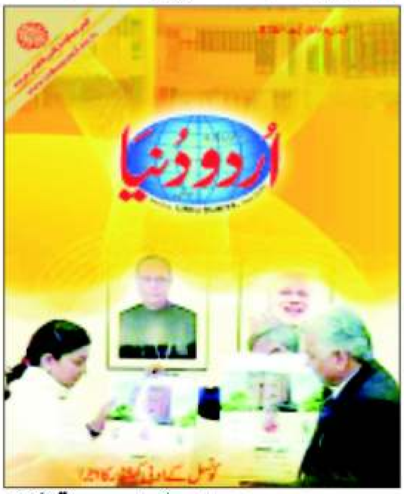

تازہ 'اردو دنیا' ملا تو اس کی خوب صورتی دیکھ کر آنکھیں پھیل گئیں اور مضامین کا تنوع دیکھ کر جی بھی خوش ہوگیا: نظر لگے نہ کہیں تیرے دست و بازو کو۔

بہت مناسب ہوگا اگر ہر شمارے میں ایک ایک صفحے پر ایک مشہور ادبی شخصیت کا تعارف، ایک مشہور کتاب کا تعارف اور اردو سے دوسری زبانوں میں ترجمہ شدہ دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ شدہ کتابوں کا تعارف پیش کیا جاتا رہے۔

ایس اے ابن غوری: فلیٹ نمبر 301، امتیاز ریزیڈنسی، حیدرآباد

رسالہ 'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' اردو رسائل کے سامنے ایک نیا معیار و حسن پیش کرنے کی تاریخ مرتب کررہے ہیں۔ آپ لوگوں کی مساعی جمیلہ تحسین کی حقدار ہے۔ اللہ کرے، زور جنوں اور زیادہ۔

عطا عابدی: انتظامی افسر (اردو) بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ

'اردو دنیا' فروری 2016 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ اداریے میں آپ نے بہت اہم باتوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اردو داں طبقہ خاص طور سے دیہی علاقے میں اردو پڑھنے والے لوگوں کو آج تعلیم کی ضرورت و اہمیت سے روشناس کرانا۔ آج تک جو بھی اردو ماہنامہ منظر عام پر آیا ہے وہ سبھی ادب کو بنیاد بنا کر نکالا جارہا ہے۔ ان سبھی رسالوں میں اردو ادب یعنی افسانہ، غزل، نظم، شاعر کی زندگی ان کے کارنامے اور ان کی تخلیق کے سلسلے میں ہی لکھا جاتا ہے۔ جبکہ آپ نے اردو دنیا میں صحافت، طب یونانی، سنت کبیر اور داوود یال کے کلام، موسیقی، فنون لطیفہ، لائف سائنس وغیرہ کو بھی ترجیحات میں شامل کیا ہے جو اردو پڑھنے والی ہماری بہنوں اور بچوں کو فائدہ پہنچا رہا ہے۔

اشفاق علی: وہائٹ ہاؤس، کمپاؤنڈ، گیا، بہار

'اردو دنیا' جنوری کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ مدیر صاحب نے اداریے میں اردو کے تعلق سے نئے سال کی آمد کے موقعے پر نیک خواہشات و توقعات کا اظہار کیا ہے اور جدید اور نئی تجاویز اردو کی نشو ونما کے لیے پیش کی ہیں۔ ایسی تجاویز پر مباحثے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ کوئی مثبت نتیجہ نکل کر آئے۔ اردو میں یہ طاقت و توانائی ہے کہ وہ خود سے زندہ رہ سکتی ہے لیکن پھر بھی حکومت اور سماج کی مدد ناگزیر ہے تاکہ اردو آگے ترقی کے زینے طے کرسکے۔ اس شمارے کے دیگر مشمولات جو تنقید، فکشن اور اردو تحقیق کے مسائل وغیرہ پر مشتمل ہیں قاری کو ادبی اور تنقیدی و تحقیقی شعور عطا کرتے ہیں اور مسائل سے آگاہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، نظام آباد

گزارش

قلمکار خواتین و حضرات سے گزارش ہے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا مختصر تعارف، بایوڈاٹا (Biodata)، مضمون کے غیر مطبوعہ ہونے کا تصدیق نامہ، پن کوڈ کے ساتھ مکمل پتہ، فون/موبائل نمبر اور پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر ضرور ارسال کریں۔

(ادارہ)

آصف جیلانی

قرۃ العین حیدر سے گفتگو

قرۃ العین حیدر ایک لجنڈ فکشن نگار تھیں۔ آگ کا دریا، گردشِ رنگِ چمن وغیرہ ان کی شناخت کے روشن حوالے ہیں۔ عینی آپا کی شخصیت پر بہت سی کتابیں اور مقالے تحریر کیے جاچکے ہیں۔ بہت سے ادیبوں نے ان سے انٹرویوز بھی لیے اور ادبی مسائل و مباحث پر ان سے پرمغز گفتگو بھی کی۔ بیشترانٹرویو کتابی شکل میں شائع ہوچکے ہیں۔ آصف جیلانی نے بھی عینی آپا کی وفات سے دو سال قبل لندن میں ایک انٹرویو لیا تھا جو بی بی سی پہ نشر ہوا۔ یہ انٹرویو کسی بھی رسالے یا کتاب میں ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے۔ آصف جیلانی نے بطور خاص اِسے اردو دنیا کے لیے ارسال کیا ہے۔ شکریے کے ساتھ انٹرویو قارئین کی نذر ہے۔ (ادارہ)

اردو کی ممتاز ناول نویس اور افسانہ نگار قرۃ العین حیدر کو ہم سے جدا ہوئے 8 سال گزر گئے۔ انھوں نے اردو میں ناول نگاری کو ایک نئی جہت، وسعت اور گہرائی کے ساتھ ایک نیا اسلوب بخشا ہے۔ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ وہ چھ دہائیوں سے زیادہ عرصے تک اردو ادب کے افق پر چھائی رہیں۔ ان کا تخلیقی سفر 1944 سے شروع ہوا تھا جبکہ ان کا پہلا افسانہ رسالہ ہمایوں میں شائع ہوا تھا اور اس کے تین سال بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ستاروں سے آگے' منظر عام پر آیا۔

1949 میں ان کا پہلا ناول 'میرے بھی صنم خانے' شائع ہوا اور سنہ 59 میں ان کے ناول 'آگ کا دریا' نے دھوم مچا دی جو اردو میں ناول نگاری کے ایک نئے عہد کا نشان مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد ناول 'آخرِ شب کے ہم سفر'، 'کارِ جہاں دراز ہے'، 'گردشِ رنگِ چمن' اور 'چاندنی بیگم' قرۃ العین حیدر کے تخیل کی تازہ کاری نئے انداز اور نئے تجربات کا پتہ دیتے ہیں۔

برصغیر کی تاریخ کے مختلف ادوار میں عورت کی سماجی حیثیت اور جاگیردارانہ دور سے لے کر اب تک عورت کے استحصال کے جو روپ بدلے، ان کا ادراک اور اظہار قرۃ العین حیدر کے ناولوں سے پہلے اردو ادب میں نمایاں نظر نہیں آتا۔

قرۃ العین حیدر اردو کی پہلی خاتون ادیبہ ہیں جنھیں سنہ نواسی میں ہندوستان کا سب سے اعلیٰ ادبی اعزاز 'گیان پیٹھ دیا' گیا۔ انھیں 1984 میں پدم شری اور 2005 میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔

قرۃ العین حیدر انتقال سے دو سال پہلے جب لندن آئی تھیں تو بی بی سی اردو سروس کے ثقافتی پروگرام 'سب رس' میں ان سے روایتی انداز سے ذرا ہٹ کر میں نے ان سے اس بات پر گفتگو کی کہ وہ اپنے ناولوں کے لیے مواد کس طرح جمع کرتی ہیں اور ناول لکھنے کے سلسلے میں کن مراحل سے گذرتی ہیں۔

اس گفتگو کا آغاز میں نے اس سوال سے کیا تھا کہ اپنے ناول کے بنیادی خیال کو کاغذ پر منتقل کرنے تک کتنا عرصہ لگتا ہے؟ جواب میں انھوں نے کہا۔ یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ اس لیے کہ جسے Creative process کہا جاتا ہے اس کا آپ تجزیہ نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ کوئی بلیو پرنٹ نہیں بنا سکتے۔ غالباً اب لوگ کمپیوٹرائز کر رہے ہیں اور کمپیوٹر میں ڈال کر ناول لکھے جائیں گے۔ یہ سب نہیں ہوتا۔ کم از کم اکثر ادیب ایسا نہیں کرتے اور میں تو بالکل نہیں کرتی کہ پہلے سے کوئی پلان بناؤں۔ سوچوں پہلے سے کہ اس پر کام کروں گی۔ یہ سب میکینکل ہوتا ہے یہ فلم کے اسکرپٹ رائٹنگ میں تو ہوتا ہے یا ٹی وی کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن ہم جو لکھ رہے ہیں اور لکھنے کا جو عمل ہے وہ تخلیقی عمل ہے جو بڑا Haphazard ہوتا ہے۔ کچھ لکھنا شروع کر دیا پھر تین چار مہینے کے لیے بھول گئے۔

اس لیے یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ کب سوچا اور کب لکھا۔

میں نے پوچھا کہ آپ نہیں سمجھتیں کہ ناول لکھنے کے لیے تو ڈسپلن کی ضرورت ہے اور تواتر سے لکھنا ضروری ہے۔ انگریزی کے ممتاز ادیب گراہم گرین نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ وہ ڈسپلن کے ساتھ لکھتے ہیں اور اس کے تحت ہر روز لازماً پانچ سو الفاظ لکھتے ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا ڈسپلن ہے؟

جواب دیا: ابھی عرض کیا کہ میں نہیں لکھتی تو مہینوں نہیں لکھتی اور لکھتی ہوں تو لکھتی چلی جاتی ہوں۔ میرے ہاں کوئی ڈسپلن نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستان اور پاکستان میں ادیب اتنے منظم نہیں ہیں۔ سب Haphazard طریقے سے لکھتے ہیں۔ مغرب میں جو ادیب ہے اس کا تو پورا پروفیشن ہے۔ اس کے سیکریٹری اور ایجنٹس ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں کے ادیب تو روٹی روزی میں لگے رہتے ہیں۔ ان کو جب وقت ملتا ہے وہ لکھ لیتے ہیں۔

میں نے پوچھا کیا آپ کو کوئی خاص وقت ہے لکھنے کا۔ علی الصبح یا رات دیر گئے؟

جواب دیا: نہیں ایسا کچھ نہیں۔ مجھے لکھنے کے لیے ایسے ماحول کی ضرورت نہیں کہ چاند نکلا ہے۔ باغ میں شاخ پر بلبل بیٹھی ہے اور آپ بیٹھے لکھ رہے ہیں۔ نہیں ایسا کچھ نہیں۔ مجھے جب وقت ملا لکھ لیا۔

ناول کے پہلے مسودے کے بعد آپ کتنی بار اس میں ردوبدل کرتی ہیں۔ میں نے پوچھا۔

ان کا جواب تھا: نہیں صاحب میں تبدیلی تو کرتی ہوں۔ میرے لیے میرے ناول ایک طرح کی موزیکل کمپوزیشن ہے۔ مجھے موسیقی سے گہرا لگاؤ ہے۔ اسی لیے میں کوئی چیز لکھنے کے بعد جب یہ محسوس کرتی ہوں کہ یہ بے سری چیز ہے اور سر میں نہیں بیٹھی ہے تو میں اسے دوبارہ لکھتی ہوں۔

میں نے کہا کہ مغرب میں ناول نگار اپنے موضوع کی تلاش میں دور دراز کے مقامات کا سفر کرتے ہیں اور خاص طور پر اپنے ناولوں کے پس منظر اور کرداروں کے لیے مختلف علاقوں کی چھان بین کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو میں ایسی کوئی روایت نہیں۔ آپ نے مختلف مقامات کا سفر کیا ہے اور اپنے ناولوں میں ان جگہوں کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً چائے کے باغات اور لندن۔ تو کیا آپ نے عمداً سفر کیا ہے ان جگہوں کا اپنے ناولوں کے پس منظر اور کرداروں کی تلاش کے لیے؟

انھوں نے جواب میں کہا: نہیں یہ محض اتفاق ہے۔ جہاں چلے گئے وہاں کسی بات نے اسٹرائک کیا اس کے بارے میں لکھ لیا۔ خاص طور پر ناول لکھنے کے لیے سفر نہیں کیے۔ میں نے کوئی پروگرام نہیں بنایا۔ یہ نہیں کہ میں ناول لکھنے کے لیے یوگوسلاویہ جا رہی ہوں یا جاپان جا رہی ہوں۔ نہیں چلے گئے کوئی بات اسٹرائک کی وہ لکھ دی۔ نہیں میں پلان بنا کر ناول لکھنے کے لیے کسی ملک میں نہیں جاتی۔ یہ نہیں کہ البانیہ جا کر ناول لکھوں گی یا فرانس جا کر لکھوں گی۔ گئے ہیں گھومتے پھرتے تو ظاہر ہے پس منظر مل جاتا ہے۔ مثال کے طور پر میری ایک کہانی ہے کارمین۔ تو میں جب جاپان سے لوٹ رہی تھی تو میں منیلا میں ٹھہری تھی۔ ہوٹل میں بکنگ نہیں ہوئی تھی اس لیے میں وہاں YWCA میں ٹھہری۔ وہ YWCA کا پورا کا پورا ماحول ہے اس کہانی میں۔ مجھے setting مل گئی۔ میں

نے پلاٹ بنادیا اور کردار بنا دیے۔ setting مل جاتی ہے اور بعض اوقات کیریکٹرس بھی مل جاتے ہیں تھوڑے سے باقی ان کو بناتے ہیں اور جو جی چاہے کریں آپ ان کے ساتھ۔

میں نے سوال کیا کہ یہ تو آپ کو یاد ہوگا کہ کون سا ناول آپ نے کم سے کم مدت میں لکھا اور کون سا ناول لکھنے میں بہت دیر لگی۔

کہنے لگیں کہ یہ کہنا بڑا مشکل ہے۔ لیکن کچھ ناول ایسے ہیں جن کے لیے میں نے ریسرچ کی۔ بعض کے لیے میں نے بہت جلد ریسرچ کر لی وہ میں نے جلد مکمل کر لیے بعض میں دیر لگی اور تین سال لگے ان میں۔ مثلاً 'آگ کا دریا' مجھے پتہ ہے کہ اس کے بارے میں سوال کرنے کے لیے آپ تلے بیٹھے ہوں گے۔ لیجیے میں آپ کو مطمئن کیے دیتی ہوں۔ 1956 میں میں نے اس کے بارے میں پڑھنا شروع کیا اس کے پس منظر کے لیے۔ کچھ پہلے سے تھا میرے دماغ میں۔ تو ایک سال میں میں نے یہ ناول ختم کر لیا اس کے بعد اس کا مسودہ ایک سال تک پڑا رہا گھر پر۔ ایک سال اس کے چھپنے میں لگا۔ میرے خیال میں ایک اور بڑا ناول جو میں نے کافی ریسرچ کے بعد لکھا وہ ہے 'گردش رنگ چمن'۔ اس کی ریسرچ کے لیے میں رام پور گئی اور اپنے عزیزوں کے ساتھ رہی تھی۔ وہاں رضا لائبریری میں ریسرچ کی پھر مجھے تھوڑی سی ریسرچ کی ضرورت تھی سو میں یہاں لندن آئی۔ میں نے انڈیا آفس لائبریری سے کچھ میٹریل لیا۔ میٹریل کیا گوہر جان کی والدہ کے دیوان کی تصویر بنوائی۔ اس کے بعد میں نے ناول لکھا۔ وہ بھی سال چھ ماہ میں مکمل ہو گیا۔

میں نے کہا کہ بہت سے لوگوں کے نزدیک آگ کا دریا آپ کا بنیادی کام ہے اس لحاظ سے کہ پہلی بار اردو ناول میں تاریخیت کا رجحان آپ نے شروع کیا۔ او رجیسے کہ گردش رنگ چمن کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں تاریخیت اتنی حاوی نہیں جتنی کہ آگ کے دریا میں ہے تو آپ سمجھتی ہیں کہ آپ تاریخیت کے رجحان سے دور جا رہی ہیں یا یہ رجحان بدل رہا ہے۔

کہنے لگیں کہ دیکھیے کوئی ضروری نہیں کہ میں ہر کتاب ایک ہی طرح کی لکھوں۔ ہر کتاب کا ایک ہی نسخہ ہو ایک ہی سانچہ ہو۔ اور اب تاریخیت کیا۔ یہ الگ الگ کہانیاں ہیں۔ اب مثال کے طور پر میرا تازہ ناول چاندنی بیگم ہے وہ بالکل مختلف انداز کا ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ہر چیز کو ایک ہی طریقے سے لکھتے چلے جائیں۔ اب بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے چاندنی بیگم میں اس طرح کیوں لکھا اور آپ نے چاندنی بیگم کو مار کیوں دیا۔ ارے بھئی چاہیے تھا اسے مارنا تو مار دیا۔ تو آپ بتائیے کہ اس کے لیے میں کیا صفائی پیش کروں۔

میں نے پوچھا کہ گردش رنگ چمن میں بہت سے

لوگوں کو یہ بات عجیب سی لگی کہ مسز عندلیب بیگ بہت جدت پسند ہیں جب کہ ان کی بیٹی عنبرین بہت قدامت پسند ہے۔

کہنے لگیں کہ: ایسا تو ہوتا ہے۔ یہ تو وہ خود عنبریں کہتی ہے کہ میں والدہ کے ری ایکشن میں قدامت پسند ہوں مذہبی ہوں۔

تو آپ یہ کہہ رہی ہیں کہ پرانے لوگ جدیدت کے زیادہ قائل ہیں۔ میں نے سوال کیا

جواب میں انھوں ے کہا کہ بھئی یہ الگ الگ کیریکٹرس ہیں۔ حد ہوگئی کہ آپ اس کو جنرلائز کر رہے ہیں۔ یہ مختلف کیریکٹرس ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک کیریکٹر کی بنیاد پر فیصلہ کرلیں۔ مسز عندلیب کی زندگی Confused تھی۔ وہ باغی تھیں۔ پریشان حال تھیں۔ ایک شخصیت کی بنیاد پر یہ نہیں کہہ سکتے کہ سب ایسے ہوتے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ لاہور میں ایک انٹرویو میں آپ نے کہا تھا کہ آگ کا دریا آپ کا بنیادی کام نہیں ہے۔ تو آپ کس ناول کو اپنا بنیادی کام سمجھتی ہیں۔

جواب میں ان کا کہنا تھا: بنیادی کام کیا ہوتا ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مجھے کوئی Contract دیا گیا تھا کہ میں GPO کی بلڈنگ بناؤں تو میں نے یہ بلڈنگ بنادی تو یہ میرا بنیادی کام ہوگیا۔ نہیں بھئی ایک رائٹر ہے وہ لکھ رہا ہے، ممکن ہے کہ کوئی اچھی چیز لکھ لے جو ہم سمجھیں وہ بہتر ہے۔ آگ کے دریا کے ساتھ یہ ہوا کہ وہ مختلف وجوہ کی بنا پر مشہور بہت ہوگیا۔

میں نے کہا کہ اس کا کینوس بہت بڑا تھا۔

وہ بولیں کہ جی ہاں اس کا کینوس بہت بڑا تھا۔ اب ضروری نہیں کہ میں ہر مرتبہ اسی طرح لکھتی چلی جاؤں۔

میں نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ لوگوں کو اس وجہ سے تعجب ہوا کہ آپ کی پہلی جو کتابیں تھیں وہ مختلف تھیں جن میں مغربیت زیادہ تھی۔

وہ بولیں۔ اب مغربیت کیا ہوتی ہے۔ لوگ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جو کتاب میں نے اٹھارہ یا انیس سال کی عمر میں لکھی تھی تیس سال کے بعد تو میں ویسی کتاب نہیں لکھوں گی۔ تیس سال میں مجھ میں زیادہ عقل آجائے گی نا۔ کچھ تجربہ آجائے گا کچھ میچوریٹی آجائے گی تو میں ذرا مختلف لکھوں گی۔ جو میں لکھ رہی تھی انٹ سنٹ بی اے میں جب میں لکھ رہی تھی۔ اس کے تیس سال بعد تو میں پچاس سال کی عمر میں وہ نہیں لکھوں گی جو میں اکیس سال کی عمر میں لکھا تھا۔ ایک ادیب میں نے آخر تھوڑا بہت Developement ہوتا ہے۔ تو اس کے لحاظ سے اس کا اسٹائل بھی بدلتا ہے اور میچوریٹی آتی ہے۔ مختلف چیزیں اس کی سمجھ میں آتی ہیں اور وہ بہتر سے بہتر لکھتا ہے۔

میں نے پوچھا تو آپ کہہ رہی ہیں کہ ابھی آپ کو اپنا شاہکار لکھنا باقی ہے۔

کہنے لگیں: شاہکار کیا ہوتا ہے۔ صاحب یہ بڑا کلیشے ہے۔ شاہکار کا لفظ مت کہیے۔ شاہکار واہکار کچھ نہیں ہوتا۔ جس کتاب سے رائٹر خود مطمئن ہو وہ ٹھیک ہے اور جسے لوگ سمجھیں ٹھیک ہے وہ ٹھیک ہے۔

میں نے سوال کیا کہ اردو میں ناول کی روایت کے بارے میں آپ کیا کہیں گی۔

انھوں نے کہا: اردو زبان میں ناول بہت لکھے گئے ہیں۔ نول کشور پریس کے زمانے میں ہزاروں ناول لکھے گئے تھے اور مقبول بھی ہوئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس زمانے میں لوگوں کے پاس ناول پڑھنے کے علاوہ اور کوئی انٹرٹینمنٹ کا ذریعہ نہیں تھا۔ صرف ناول ہی ایک ذریعہ تھا۔ ایک زمانے میں ہمارا پورا دور ناول کا گزرا ہے۔ اب آج کل ماحول بدل گیا ہے۔ معاشرہ بدل گیا ہے۔ پہلے لوگ گرامفون سنتے تھے پھر ریڈیو آیا اور پھر ٹی وی آیا۔ ٹی وی کے ساتھ پورا سانچہ ہی بدل گیا۔ نظریات کا، انٹرٹینمنٹ کا، پورے تصورات بدل گئے۔ پھر ویڈیو آگیا۔ لہٰذا اب ناول کوئی بیٹھ کر نہیں پڑھتا افسوس کی بات ہے۔ اور پرابلم یہ ہے کہ بچوں میں پڑھنے کا شوق کم ہوگیا ہے۔ پچھلے زمانے میں بچوں کے لیے پورا لٹریچر تھا۔ پہلے بچوں کے لیے رسالے نکلتے تھے۔ کہانیاں ہوتی تھیں۔ بچے پڑھتے تھے۔ اب بچے پڑھتے نہیں۔ بچے ویڈیو دیکھتے ہیں اسی طرح ناول بھی نہیں پڑھے جاتے۔ ہمارے ہاں لٹریسی اتنی کم ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو ناول پڑھتے ہیں۔ پھر ناول بھی فقط ایک ہزار چھپتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ چار پانچ ہزار سے زیادہ لوگ ناول نہیں پڑھتے۔ اس کا مقابلہ آپ مغرب سے نہیں کر سکتے یہاں دس دس لاکھ سے زیادہ کتابیں چھپتی ہیں اور بڑی تعداد میں لوگ یہ کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمارے ہاں پڑھنے کی عادت کم ہوتی جارہی ہے۔ اور ظاہر ہے افسانے کا زمانہ ختم ہوتا جارہا ہے۔ پھر ڈائجسٹ آگئے ہیں۔ اچھے ناول کا حلقہ بہت محدود رہتا ہے۔ ہاں رضیہ بٹ کو لاکھوں لوگ پڑھیں گے ہمارے ہاں ہندوستان میں گلشن نندا بھی بہت مقبول ہیں۔ اسی طرح کے ناول بہت مقبول ہیں لیکن وہ ناول بہت محدود ہیں جو ذہن پرست طبقہ پڑھنا چاہتا ہے۔

میں نے کہا کہ ہندوستان میں اردو کی کتابیں اچھی خاصی تعداد میں چھپ رہی ہیں اور اس سلسلے میں سرکاری تنظیموں کی طرف سے مالی اعانت مل رہی ہے۔ تو کیا آپ مطمئن ہیں۔

ان کا کہنا تھا جی ہاں اردو اکادمیوں کی مالی اعانت کی وجہ سے اردو کی اچھی خاصی کتابیں چھپ رہی ہیں مضامین سنجیدہ ہیں۔ تحقیق، تنقید، کے ساتھ دینیات اور اسلام پر کافی زور ہے۔ ہر ریاست میں اردو اکادمیاں ان کتابوں کی اشاعت میں بڑے پیمانے پر مالی مدد دیتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کتابیں تو بہت چھپ رہی ہیں لیکن آپ پرسنٹیج کی بات کریں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ساؤتھ ایشیا میں ادب عوامی دلچسپی کی چیز ہے اور جس طرح مغرب میں کتابیں شائع ہوتی ہیں اور پڑھی جاتی ہیں ان کا ہم یہاں مقابلہ نہیں کر سکتے۔

شکریہ!

■

Asif Jilani

رپورٹ

جاوید جمال الدین

ممبئی میں اُردو صحافت کے دو سال

مہاراشٹر کے حوالے سے' سمینار

دائیں سے ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی، پدم شری مظفر حسین، گورنر شری سی - ودیا ساگر راؤ، اسپیکر مہاراشٹر شری ہری بھاو باگڑے اور این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم

ممبئی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے زیر اہتمام انجمن اسلام کریمی لائبریری میں ملک میں 'اردو صحافت کے 200 سال مہاراشٹر کے حوالے سے' عنوان پر منعقد دوروزہ سمینار کا شاندار انعقاد ہوا اور مشہور و معروف صحافیوں اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ شخصیات نے اردو صحافت کی ترقی، مسائل اور بہتری پر مقالات پیش کیے۔ سمینار کا افتتاح مہاراشٹر کے گورنر سی ودیا ساگر راؤ نے کیا جو کہ حیدر آباد سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے اہل خانہ اردو داں ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ اردو داں حضرات نے ملک کی آزادی کے لیے جو قربانی دی ہے، اُسے عوام تک پہنچانا ضروری ہے اور راج بھون کے دروازے ہمیشہ اردو داں طبقے کے لیے کھلے رہیں گے جبکہ گوا کی گورنر محترمہ مردلا سنہا نے اختتامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے جس انداز میں گفتگو کی، اُس نے سب کا دل جیت لیا۔ انھوں نے اردو کو ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی علامت قرار دیا ہے۔

اس موقعے پر مہاراشٹر کے گورنر سی ودیا ساگر راؤ نے کہا کہ ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو ذرائع ابلاغ اور مسلم مجاہدین آزادی کی قربانیوں کے بارے میں ہندوستان کا عام آدمی لاعلم ہے اور ان کی خدمات اور ملک میں قومی ہم آہنگی اور اتحاد کی کوششوں کو عوام تک پہنچانا انتہائی ضروری ہے۔ اپنے انگریزی خطبے کے دوران ہندوستانی میں گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے 1857 کی پہلی جنگ آزادی اور 1947 کی آزادی کی جدوجہد اور حیدر آباد لبریشن میں اردو اخبارات اور صحافیوں کے رول پر بھرپور روشنی ڈالی اور اس بات کا اظہار کیا کہ ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو ذرائع ابلاغ نے جو قربانیاں دی ہیں، ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی ضرورت ہے تاکہ ان مجاہدین کو فراموش نہ کیا جاسکے۔

گورنر ودیا ساگر راؤ نے مزید کہا کہ ہمیں اس

ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو ذرائع ابلاغ نے جو قربانیاں دی ہیں، ان کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی ضرورت ہے تا کہ ان مجاہدین کو فراموش نہ کیا جا سکے: ودیاساگر راؤ

اردو وہ زبان ہے جس نے قومی ہم آہنگی اور اتحاد کو برقرار رکھا ہے اور یہی ہماری گنگا جمنی تہذیب کو استحکام بخش رہی ہے: مردلا سنہا

مفروضے کو بھی غلط ثابت کرنا ہوگا کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اس کی ترقی وفروغ میں تمام مذاہب کے ماننے والوں اور فرقوں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ یہ بھی سچائی ہے کہ اس کی مٹھاس کے سبھی قائل ہیں اور اس میں خود ان کے اہل خانہ شامل ہیں اور ان کے دو بڑے بھائیوں کی تعلیم بھی اردو میڈیم سے ہوئی تھی۔

گورنر نے حیدرآباد لبریشن میں حصہ لینے والے ایک مسلم صحافی شعیب اللہ کا ذکر کیا، جس نے اپنی تحریک سے اخبار امروز جاری کیا۔ اس صحافی کا مجسمہ حیدرآباد کے پتر کار بھون میں نصب ہے اور تلنگانہ سرکار نے بھی ایک مجسمہ اہم مقام پر نصب کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔

دوروزہ سمینار کے پہلے اجلاس کی ابتدا میں مہاراشٹر اسمبلی کے اسپیکر ہری بھاؤ باگڑے نے کہا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے اور اس کی ترقی وفروغ ہم سب کی ذمے داری ہے۔ مشہور شہر اورنگ آباد اور خطہ مراٹھواڑہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مذکورہ علاقے میں ہی نہیں بلکہ ریاست مہاراشٹر میں اردو کو کافی اہمیت حاصل ہے اور یہاں ہزاروں اسکولوں میں لاکھوں بچے زیر تعلیم ہیں۔ مہاراشٹر اردو کے لیے ایک زرخیز خطہ رہا ہے۔ اسپیکر نے یقین دلایا کہ اردو زبان کی ترقی کے لیے سابقہ اٹل بہاری واجپئی سرکار نے جو پیمانہ مقرر کیا تھا، اس پر عمل کیا جائے گا، لیکن اقلیتی فرقے کو بھی اس کی ترقی میں اہم رول ادا کرنا ہے۔

اس ابتدائی اجلاس کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری جناب مظفر حسین نے کی اور اس عزم کو دہرایا کہ این سی پی یو ایل کی جانب سے ملک بھر میں اردو کو فروغ دینے کے لیے کئی منصوبوں پر عمل کیا جائے گا اور ورک شاپ اور سمینار منعقد کیے جائیں گے۔ استقبالیہ تقریب میں کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضی کریم نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ اردو صحافت کے 200 سال مکمل ہونے پر جو اجلاس منعقد کیے گئے ہیں، ممبئی میں اس کا یہ آخری پڑاؤ ہے۔ جلد ہی بڑے پیمانے پر اردو کی تشہیر اور ترویج کے لیے دیگر پروگراموں کی شروعات کی جائے گی۔

پہلے اجلاس کے کلیدی خطبے میں سینئر صحافی جناب حسن کمال نے ماضی اور حال میں اردو صحافت کو درپیش مسائل پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اس سے چھٹکارا ملنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے اردو صحافت میں کارپوریٹ اداروں کے آنے کے عمل کو ایک خوش آئند باب قرار دیا۔

حسن کمال نے شمالی ہند میں بڑے پیمانے پر اردو اخبارات پر ہندی کے اثرات پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان علاقوں کے اخبارات میں جو طرز عمل اختیار کیا جاتا ہے، اس پر قدغن لگانا ضروری ہے۔ اس سے اردو صحافت کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو صحافت نے ہمیشہ حق گوئی و بے باکی اور قوم وملت کے مسائل کو پیش کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس

موقعے پرانجمن اسلام کے صدر ڈاکٹر ظہیر قاضی مہمان اعزازی نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

اس سمینار کے دوسرے اجلاس اور اختتامی اجلاس سے مہمان خصوصی گوا کی گورنر مردلا سنہا نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی ایک واضح علامت ہے اور یہ ایک ایسی زبان ہے، جو اپنے آپ میں کشش رکھتی ہے۔

گوا کی گورنر مردلا سنہا نے جو ہندی ادب میں اپنا علیحدہ مقام رکھتی ہیں، اپنے خطبے میں واضح طور پر کہا کہ اردو اس ملک کی زبان ہے اور اس کی ترقی وفروغ میں سبھی کا حصہ ہے، لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اردو کی ترقی میں رکاوٹیں ضرور پیدا ہوئی ہیں مگر حقیقت یہ بھی ہے کہ یہ صرف اردو کے ساتھ نہیں ہوا ہے بلکہ دوسری زبانوں کے ساتھ بھی اس کے جاننے والوں نے یہی سلوک کیا اور اس کا سبب انگریزی کو ترجیح دینا ہے۔

گورنر مردلا سنہا نے ملک کی جدوجہد آزادی میں اردو کے رول کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ زبان ہے جس نے قومی ہم آہنگی اور اتحاد کو برقرار رکھا ہے اور یہی ہماری گنگا جمنی تہذیب کو استحکام بخش رہی ہے۔ انھوں نے ہندی اور اردو کو ہندوستان کے جڑواں بچے قرار دیا۔ یہ بھی یقین دلایا کہ مستقبل میں اردو زبان کی بہتری اور ترویج واشاعت کے لیے ان سے جو کچھ ہوگا، وہ کیا جائے گا اور ریاست گوا میں بھی این سی پی یو ایل کسی پروجیکٹ پر مدد چاہتی ہے تو ہر ممکن تعاون دیا جائے گا۔

انجمن اسلام کی کریمی لائبریری میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام ملک میں 'اردو صحافت کے 200 سال، مہاراشٹر کے حوالے سے' عنوان پر منعقد دوروزہ سمینار کے پہلے اجلاس میں مجلس صدارت میں سینئر صحافی خلیل زاہد اور شمیم طارق شامل رہے اور مقالہ نگار مدیر انقلاب شاہد لطیف، سینئر صحافی جاوید جمال الدین، مشرف شمسی، احمد عثانی، ڈاکٹر ریحان انصاری، اور نذیر فتح پوری اور دوسرے اجلاس کی صدارت مدیر ہندوستان سرفراز آرزو، ڈاکٹر جلیس شیروانی اور ڈاکٹر رام پنڈت نے کی۔ مقالہ نگاروں میں خیال انصاری، شکیل رشید، فیروز اشرف، قطب الدین شاہد وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اس سے قبل کونسل کے نائب چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے گورنر کا تعارف پیش کیا اور ان کی آمد پر شکریہ ادا کیا۔

استقبالیہ تقریر میں ڈائرکٹر کونسل ارتضی کریم نے اردو صحافت کے 200 سال کے عنوان سے منعقدہ اس کامیاب اجلاس پر ممبئی کے اردو داں طبقے کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کا اختتام 'میں اردو ہوں' ڈرامے پر ہوا جوان فنکاروں کی اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔ اس ڈراما کو کافی سراہا گیا اور انجمن اسلام کے ڈاکٹر ظہیر قاضی نے یقین دلایا کہ جلد ہی اس ڈرامے کو شہر کے دوسرے علاقوں میں پیش کیا جائے گا جبکہ مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی نے پورے مہاراشٹر میں اس کو اسٹیج کرانے کا اعلان کیا، جن میں ممبئی کے ساتھ ساتھ پونے، سولا پور، ناگپور، اورنگ آباد، بھساول، جلگاؤں اور امراوتی شامل ہیں۔

■

Mr. Javed Jamaluddin
Roznama Rashtriya Sahara, 1st Floor
Ghanshyam Chamber, New Link Road
Andheri (W), Mumbai - 400 053 (MS)

رضا علی عابدی

سدھو بھائی شاہین کلب والے

یہ سنہ 1996 کی بات ہے، اپنے پروگرام ’ریل کہانی‘ کی ریکارڈنگ کے لیے کلکتہ جانے کی خاطر میں کوئٹہ سے بولان ایکسپریس میں بیٹھا۔ ٹرین کے عملے اور کئی دوسرے مسافروں کو معلوم تھا کہ میں گاڑی میں بیٹھا ہوں۔ کوئٹہ سے چل کر جب ٹرین آب گم کے اسٹیشن پر رکی تو عجب تماشا ہوا۔ ٹرین کی آمد کے وقت تفریح کے خیال سے شہر کے جولڑکے پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے ہیں، وہ جمع تھے کہ کسی طرح انھیں بھی معلوم ہوگیا کہ بی بی سی لندن کے بچوں کے مقبول پروگرام کے پروڈیوسر رضا علی عابدی اسی ٹرین میں بیٹھے ہیں۔ ذرا دیر میں میرے کمپارٹمنٹ کے آگے نوجوانوں کا مجمع لگ گیا۔ میں کھڑکی میں بیٹھا تھا۔ سارا مجمع پلیٹ فارم پر کھڑا تھا اور ذرا سوچیے کہ یہ مجمع مجھ سے شاہین کلب کے ہر دلعزیز کردار سدھو بھائی کے انتقال پر اظہارِ تعزیت کر رہا تھا اور سب کا ایک ہی سوال تھا: ’’بتایئے حقیقی زندگی میں سدھو بھائی کیسے تھے؟‘‘

بڑا مشکل سوال تھا کیونکہ حقیقی زندگی میں محمد علی شاہ مرحوم بی بی سی کی اردو سروس کے کلرک اور ٹائپسٹ تھے مگر ریڈیو پروگرام میں انھوں نے وہ دھوم مچائی تھی کہ ایک بار پاکستان کی فضائیہ کے کچھ ہواباز اپنے طیارے لے کر برطانیہ آئے ہوئے تھے۔ وہ فرصت ملتے ہی بی بی سی کی مشہور عمارت بش ہاؤس پہنچ گئے اور استقبالیہ پر جا کر وہاں بیٹھے ہوئے انگریز عملے سے کہا کہ ہم سدھو بھائی سے ملنا چاہتے ہیں۔ بیچارے عملے نے کبھی سدھو بھائی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ عمارت میں یہاں سے وہاں تک سدھو بھائی کی تلاش شروع ہوئی اور بالآخر اردو سروس والوں نے وطن کے سجیلے جوانوں کی پذیرائی کی اور کہا کہ اس وقت سدھو بھائی کا جو پروگرام نشر ہونے والا ہے، وہ پہلے سے ریکارڈ کیا ہوا ہے۔ آپ اسٹوڈیو میں بیٹھ کر اسے سنیے، البتہ محمد علی شاہ صاحب سے ملاقات کے لیے آپ کو کسی اور دن آنا پڑے گا۔

اردو سروس سے بچوں کا یہ پروگرام بیس سال سے زیادہ عرصے سے جاری تھا۔ مجھ سے کافی پہلے شاہین کلب کو فیض احمد فیض کی صاحب زادی سلیمہ ہاشمی اور ریڈیو پاکستان کے بدر عالم مرحوم پیش کیا کرتے تھے۔ ان کے بعد یہ فرض یونس واسطی مرحوم نے سنبھالا، پھر یہی پروگرام ظرافت اور لطافت کے استاد وسیم صدیقی کو سونپا گیا جس میں ان کے ساتھ ریڈیو کی مشہور فنکار سحاب قزلباش بھی تھیں جو سلطانہ باجی کہلاتی تھیں۔ یہ سب تھے لیکن بچوں کے پروگرام میں بچہ ایک بھی نہ تھا اور سوچیے یہ خلا کون پُر کر رہا تھا: محمد علی شاہ عرف سدھو بھائی جو اپنا پورا نام یوں بتایا کرتے تھے: افلاطون یار جنگ ارسطو عرف سدھو بھائی شاہین کلب والے۔

پروگرام میں یہ کردار یونس واسطی کے دور میں داخل ہوا۔ اس وقت کوئی صاحب تھے جو سدھو بھائی کا کردار ادا کیا کرتے تھے کیونکہ محمد علی شاہ تو سیکشن کے کلرک اور اردو ٹائپسٹ تھے اور مائیکروفون کو انھوں نے قریب سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایک روز یوں ہوا کہ یونس واسطی ریکارڈنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ کاسٹ کے باقی لوگ آئے تھے مگر سدھو بھائی کا کردار ادا کرنے والے صاحب لاپتہ تھے۔ یہاں تک کہ ریکارڈنگ کا وقت ہوگیا۔ اس وقت اتفاق سے شاہ صاحب وہیں کہیں گھوم رہے تھے۔ طے یہ پایا کہ کیوں نہ آج انھیں سدھو بھائی بنا دیا جائے۔ وہ بیچارے بلا کے شرمیلے تھے اور زبان میں تھوڑی سی لکنت بھی تھی جس کا انھیں بہت احساس تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا، شاہ صاحب رضا مند ہوگئے۔ اب جو ریکارڈنگ ہوئی اور ماسٹر صاحب (جنھیں وہ ماس ساب کہا کرتے تھے) اور سدھو بھائی کے مکالمے ریکارڈ ہوئے تو بڑی تالیاں بجیں۔ اتنی تالیاں کہ جو صاحب عام دنوں میں یہ کردار ادا کیا کرتے تھے، انھیں پیغام بھجوا دیا گیا کہ اب وہ بش ہاؤس آنے کی زحمت نہ کریں۔

یونس واسطی کے دور میں شاہین کلب بہت مقبول ہوا لیکن جب واسطی صاحب کا بی بی سی کنٹریکٹ ختم ہوا تو پروگرام کا سربراہ وسیم صدیقی کو بنایا گیا۔ وہ ٹھہرے بلا کے لطیفہ گو۔ ان کا حال یہ تھا کہ انھیں کتنا ہی اعلیٰ لطیفہ سناؤ، وہ ہنسنے کے بجائے ایک اپنا لطیفہ سنانے لگتے تھے۔ خیر! وسیم صدیقی نے سلطانہ باجی اور مشہور صداکار محمود خاں مودی اور سرکردہ گلوکارہ ناہید نیازی اور ان کے شوہر مصلح الدین کو ملا کر ایک ٹیم بنائی۔ مرکزی کردار سدھو بھائی ہی رہے۔ اس کے بعد شاہین کلب کی مقبولیت بڑھتی گئی۔

اب ہوا یہ کہ بی بی سی کے ساتھ وسیم صدیقی کا کنٹریکٹ بھی ختم ہوگیا۔ اب سوال یہ تھا کہ اتنی بلندی تک پہنچ جانے والے پروگرام کو کون سنبھالے؟ ذمے دار حضرات کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میرا معاملہ یوں تھا کہ میں شفیق الرحمٰن کو پڑھ کر جوان ہوا تھا اور مجھے احساس تھا کہ اچھا خاصا مزاح لکھ سکتا ہوں۔ جب بی بی سی میں تقرر ہونے لگا تو میں نے طے کیا کہ اپنی مزاح نگاری آئندہ کے لیے بچا کر رکھوں گا اور یہ سوغات بی بی سی کے حوالے نہیں کروں گا مگر پھر ہوا یہ کہ شاہین کلب جیسا مقبول پروگرام سنبھالنے یا نہ سنبھالنے کے لیے جب میرا عندیہ لیا گیا تو مجھے انکار کا کوئی سبب نظر نہیں آیا۔ اس طرح سدھو بھائی کا کردار لکھنے کا فرض مجھے سونپ دیا گیا۔

شاہین کلب کی عجیب روایت یہ تھی کہ اس میں کوئی بچہ شامل نہیں تھا۔ لندن میں صداکاری کرنے والا بچہ ڈھونڈنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ ہر ہفتے بچوں کو بش ہاؤس لانے اور پوری پوری شام نذر کرنے والے والدین بھی دستیاب نہیں تھے۔ اپنا روزگار چھوڑ کر کون آ سکتا تھا۔ اس لیے بچوں کا یہ پروگرام بچوں کی شرکت سے محروم رہا۔

اب رہ گئے سدھو بھائی جو پروگرام میں پوری ٹیم کے ساتھ شریک ہوتے تھے، بظاہر معمر تھے لیکن باتیں بچوں جیسی کرتے تھے اور وہ بھی اس شان سے گویا بچوں کا دل بہلانے کی خاطر خود بھی بچے بن گئے ہیں۔ حیرت انگیز طور پر اس کردار کے لکھنے میں بے شمار امکانات تھے اور اس میں لطیفہ گوئی کے کمالات دکھانے کی خوب خوب گنجائش تھی۔

جب یہ پروگرام ملا تو اس کے شرکا کی ٹیم منتشر ہو چکی تھی۔ میرے حصے میں سدھو بھائی، رضوانہ اور اکرم منہاس آئے۔ کچھ روز بعد پروین مرزا بھی آگئیں، پھر شاہدہ احمد بھی شریک ہوئیں اور بالآخر سحاب قزلباش عرف سلطانہ باجی بھی لوٹ آئیں۔ خواتین نے بچوں کی کمی کا احساس مٹا دیا اور شاہین کلب کی مقبولیت اور بڑھنا شروع ہوئی۔ اس کا اندازہ سننے والوں کے خطوط کی تعداد سے ہوتا تھا۔

جس وقت پروگرام میں میرے علاوہ صرف محمد علی شاہ، پروین اور شاہدہ شامل تھیں ان دنوں پروگرام کی تشہیر کے لیے ہم چاروں کا ایک پکچر پوسٹ کارڈ چھپوایا گیا اور ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ جسے درکار ہو وہ خط لکھ کر منگوالے۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ غضب ہوگیا۔ غضب یہ نہیں ہوا کہ سننے والوں کے ہزاروں خطوط کی جھڑی لگ گئی۔ غضب یہ ہوا کہ ان سب کو ایک ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیجنے پر جو ڈاک کا خرچ آیا اس سے اردو سروس کے بجٹ کی چولیں ہل گئیں۔ ہمیں ہدایت کردی گئی کہ بس! آئندہ شاہین کلب کا کوئی پوسٹ کارڈ نہیں چھپے گا۔

سدھو بھائی ہر ہفتے اپنا کوئی قصہ سناتے تھے جو ڈرامے کی شکل اختیار کرلیتا تھا۔ ادھر اسٹوڈیو میں ہم خود ہنستے ہنستے دہرے ہوجاتے تھے، ادھر سننے والے بھی لوٹ پوٹ ہوتے تھے جیسے ہنسنے کا مرض اڑ کر لگتا ہو۔ خود ہمارے ہنسنے کا یہ حال تھا کہ پروگرام یا ڈرامے کے اسکرپٹ میں کہیں نہیں تھا کہ ''سب ہنستے ہیں'' بلکہ وہ ہنسی صحیح جگہ اور بالکل فطری ہوتی تھی۔ یوں اسے ہنسی کہنا بھی درست نہیں، وہ تو قہقہوں کا فوارہ ہوتا تھا۔

ایک بار ایک پروگرام میں سدھو بھائی خود اپنا اور سلطانہ باجی کا قصہ سنا رہے تھے جس میں سلطانہ باجی کمرے کے بیچوں بیچ کرسی پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھیں۔ اتنے میں سدھو بھائی نے دروازے سے جھانک کر دیکھا اور کرکٹ کی طرح کمنٹری کرنے لگے:

''اب وہ دائیں بائیں دیکھ رہا ہے جیسے چھکا لگانے کی تیاری کر رہا ہو اور اب وہ ذرا پیچھے ہٹا اور اب تیزی سے آگے بڑھا اور اب ایسے لپک رہا ہے جیسے ایک رن لینے کی کوشش کر رہا ہو۔''

ادھر سدھو بھائی کی کمنٹری جاری تھی۔ ادھر سلطانہ باجی مسلسل پوچھے جا رہی تھیں ''کون؟ ارے بھئی کون؟ کدھر؟؟ کون کون؟؟؟''

سدھو بھائی نے انکشاف کردیا ''چوہا۔ آپ کی کرسی کے پائے پر۔''

یہ سننا تھا کہ سلطانہ باجی چیخ مار کر کرسی پر چڑھ گئیں۔ ادھر چوہے کی پیش قدمی جاری رہی۔ اسے بڑھتا دیکھ کر چیختی چلاتی سلطانہ باجی چھت کے پنکھے سے لٹک گئیں اور لگیں چلانے ''سدھو بھائی اس چوہے کے بچے کو ماریے۔'' اس پر سدھو بھائی اپنی بندوق اٹھا لائے۔ فرش پر رکھی ہوئی کرسی اور اس پر چڑھے ہوئے چوہے کو تاک کر نشانہ بنایا اور گولی چلا دی۔ نشانہ چوکا اور گولی جا کر چھت کے پنکھے کو لگی۔ پنکھا ٹوٹا۔ موٹی تازی سلطانہ باجی فرش پر گریں اور چوہا ان کے نیچے کچلا گیا۔

اس طرح سدھو بھائی نے چوہے کا شکار کیا۔

یہ سارا ڈراما بہت مزے کا تھا۔ خصوصاً سلطانہ باجی کا چھت سے لٹک کر شور مچانا بڑا لطف دے رہا تھا۔ ہم سب اپنے منہ میں رومال ٹھونسے ہنسی روک رہے تھے۔ اب یہ ہوا کہ جہاں سلطانہ باجی کو کہنا تھا ''سدھو بھائی اس چوہے کے بچے کو ماریے۔'' وہ بولیں ''سدھو بھائی! اس چوہے کے بچے کو بچایئے۔'' ان کا یہ کہنا تھا کہ ہم لوگوں کے منہ میں ٹھنسے ہوئے رومال نکل گئے اور ہنستے ہنستے ہم سب فرش پر لوٹنے لگے۔ ریکارڈنگ روکنا پڑی اور جب تک ہنسی کا دور پڑتا رہا، ریکارڈنگ رکی رہی۔ ہمارے انگریز انجینئر نے آ کر ہم سب کو پانی پلایا اور بڑی مشکل سے حالات معمول پر آئے۔ کچھ عرصے بعد ہم نے اپنے سننے والوں کو ہنسی کے دورے کی ریکارڈنگ بھی سنوائی۔ اسے سن کر سامعین پر ہنسی کا دورہ پڑا اور کئی روز اس ڈرامے کا ذکر رہا۔

سلطانہ باجی عرف سحاب قزلباش ریڈیو پاکستان کے ڈراموں کی مشہور صداکارہ تھیں۔ میں تو انھیں بچپن

سے سنتا آرہا تھا۔ جب وہ آزادی سے پہلے آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے بچوں کے پروگرام میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ بڑی ہوکر وہ ڈراما آرٹسٹ بنیں اور مجھے کراچی ریڈیو کے جشنِ تمثیل کا ڈراما 'غبارہ' یاد ہے جو شوکت تھانوی مرحوم نے لکھا تھا جس کا منظر یہ تھا کہ سحاب ایک راکٹ میں بیٹھ کر خلا میں چلی جاتی ہیں جہاں ان پر دہشت طاری ہوتی ہے۔ وہ اپنے وائرلیس پر چیختی چلاتی ہیں اور زمین پر ان کے ابا جان (خود شوکت تھانوی) اسی وائرلیس پر انھیں مطمئن کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔

کچھ ایسی ہی صورت حال اس روز شاہین کلب میں تھی۔ اس کے کچھ روز بعد مجھے کراچی جانے کا اتفاق ہوا۔ میں اپنے دوست افضال شیروانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ ہم دونوں دوست برآمدے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے اور افضال کی بیگم اندر باورچی خانے میں توے پر چپاتی ڈال رہی تھیں۔ کسی بات پر میں نے قہقہہ لگایا تو وہ چپاتی ہاتھ میں لیے لیے باہر آئیں اور بولیں ''اب یقین آگیا۔ شاہین کلب میں وہ قہقہے مصنوعی نہیں ہوتے۔''

اس دوران میں شاہین کلب سننے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بی بی سی والے اپنے سننے والوں کی تعداد جاننے کے لیے جو سروے کراتے تھے، ان میں چونکہ صرف بالغوں کو شمار کیا جاتا تھا، اس لیے یہ تو پتا نہ چل سکا کہ سامعین میں بچوں کی تعداد کتنی ہے لیکن سب اتنے زیادہ بڑے بھی شاہین کلب سننے لگے تھے کہ مجموعی تعداد میں بھاری اضافہ نظر آنے لگا۔

شاہین کلب لاکھ کہیں کہ بچوں کا پروگرام تھا لیکن حقیقت میں اسے پورے پورے کنبے ساتھ بیٹھ کر سننے لگے تھے۔ خطوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان میں دادا ابا اور نانا جان بھی برابر کے شریک ہوتے تھے۔ اِس نسل کو اُس پروگرام نے بہت محظوظ کیا جس میں سدھو بھائی کے دادا حضور کی سویں سالگرہ ہورہی تھی اور اس موقع پر کاٹنے کے لیے جو بڑا سا کیک بنوایا گیا تھا اس پر پوری ایک سو شمعیں روشن کی گئیں اور دادا ابا سے کہا گیا کہ ان سب کو پھونک مار کر بجھائیں۔ ان بیچارے کے منہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ بالکل پوپلے تھے۔ انھوں نے بہت پھونکیں ماریں مگر شمعوں کو نہ بجھنا تھا، نہ بجھیں۔ آخر سدھو بھائی کو ایک ترکیب سوجھی۔ انھوں نے دادا ابا کا منہ شمعوں کے قریب لے جاکر کہا ''اب کہیے پھوپھی پھوپھا۔ پھوپھی پھوپھا۔ پھوپھی پھوپھوپھوپھا۔'' یہی کیا گیا۔ دادا ابا کے پوپلے منہ سے ہوا کے ایسے جھونکے نکلے کہ شمعیں اڑ کر گئیں اور سامنے والی دیوار پر چپک گئیں۔

ہمارے بعض قارئین کو شہزادی عابدہ سلطان یاد ہوں گی جو ریاست بھوپال کے آخری فرمانروا حمیداللہ خان کی بڑی بیٹی تھیں اور اگر ریاستیں برقرار رہتیں تو وہ بھوپال جیسی عظیم ریاست کی حکمراں ہوتیں۔ شہزادی عابدہ سلطان بعد میں پاکستان چلی گئیں۔ ان کے بیٹے شہریار خاں پاکستان کے امور خارجہ کے سکریٹری تھے۔ بعد میں وہ ہائی کمشنر مقرر ہوکر برطانیہ آئے۔ اسی دوران شہزادی عابدہ سلطان بیٹے کے پاس لندن آئیں اور ہائی کمشنر سے دلچسپ فرمائش کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ بی بی سی لندن کی اردو سروس کے پروگرام شاہین کلب میں حصہ لینے والوں سے ملنا چاہتی ہیں۔ ہائی کمیشن نے بی بی سی سے پوچھا کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ جواب ملا: سر آنکھوں پر۔ ضرور تشریف لائیے۔ چنانچہ وہ شاہین کلب کے اسٹوڈیو میں آئیں اور پروگرام میں طویل انٹرویو دیا۔ سدھو بھائی نے ان سے ان کے بچپن کے بارے میں سوال کیے۔ مثلاً ان سے پوچھا کہ کیا آپ شرارتیں کرتی تھیں، اور یہ کہ بزرگوں نے کبھی آپ کی شرارتوں پر آپ کے کان کھینچے۔ انھوں نے مزے مزے کے جواب دیے اور بزرگوں کے ادب کے بارے میں سننے والوں کو بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔

بزرگوں پر یاد آیا کہ ان ہی دنوں مجھے سندھ کے بڑے شہر حیدرآباد جانے کا اتفاق ہوا اور مجھے اپنے وقت کے بڑے عالم علامہ غلام مصطفیٰ قاسمی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان کا علم نور بن کر ان کے چہرے سے پھوٹتا تھا۔ وہ شاہین کلب کے بڑے مداح نکلے۔ کہنے لگے کہ ہر ہفتے ضرور سنتا ہوں۔

میں نے کہا ''علامہ! وہ تو بچوں کا پروگرام ہے۔''

کہنے لگے ''میرے بچے سنتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ بیٹھ کر میں بھی اشتیاق سے سنتا ہوں۔''

میں نے کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اپنے بچوں سے مجھے بھی ملوائیے۔

علامہ نے فوراً آواز دے کر انھیں بلا لیا۔ ان میں غالباً دو ڈاکٹر اور ایک پروفیسر تھے۔

میں اپنے اسی دورے میں لاہور پہنچا اور وعدے کے مطابق لاہور کے نواحی گاؤں اجودھیاپور والوں سے ملنے گیا۔ وہاں رات کے کھانے کی دعوت تھی۔ ایک دیگ بھر کے چنے کی دال اور دوسری دیگ میں چاول پکے۔ گاؤں کی ساری آبادی جمع ہوگئی۔ بڑے دالان میں چارپائیاں ڈال دی گئیں اور اتنا بڑا مجمع مجھے گھیر کے بیٹھ گیا۔ اب امتحان کی کڑی گھڑی آن پہنچی۔ مجھ سے فرمائش ہوئی کہ شاہین کلب کا وہ واقعہ سنایئے جس میں آپ کی یادداشت کمزور ہوجاتی ہے اور سدھو بھائی بھولی ہوئی باتیں یاد کرنے میں آپ کی مدد کرتے ہیں۔

میں اس کے لیے قطعاً تیار نہ تھا۔ مجھے معلوم ہوتا تو پروگرام کا ٹیپ یا اسکرپٹ ساتھ لے جاتا۔ لاکھ معذرت کی لیکن گاؤں والوں نے میری ایک نہ سنی۔ تھک ہار کر میں نے اپنا اور سدھو بھائی کا وہ تاریخی واقعہ سنانا شروع کیا:

میں: ایک بار یہ ہوا کہ ایک خاتون کا وہ کنویں میں گر گیا... وہ... وہ...

سدھو: شوہر؟

میں: نہیں دوپٹہ۔

سدھو: اچھا۔ دوپٹہ۔

میں: تو دوپٹہ نکالنے کے لیے کنویں میں اسے اتار گیا... اُسے... اُسے...

سدھو: صدر ناصر کو؟

میں: جی نہیں... اسے... اسے

سدھو: دلیپ کمار کو؟

میں: جی نہیں۔ غوطہ خور کو۔

سدھو: اچھا غوطہ خور کو۔

میں: وہ کنویں میں اترا اور کچھ دیر بعد وہ نکال کے لایا...

وہ...وہ...

سدھو: جہاز؟

میں: جی نہیں...وہ...وہ...

سدھو: مگر مچھ؟

میں: جی نہیں۔ایک پرانا جوتا۔

سدھو: اچھا جوتا۔

میں: جی ہاں۔پھر کنویں میں وہ ڈالی گئی۔

سدھو: لتا منگیشکر؟

میں: جی نہیں...وہ...وہ...

سدھو: جیبی گھڑی؟

میں: جی نہیں۔لال دوا۔

سدھو: اچھا۔ لال دوا۔ اوہو، آپ کی یاداشت تو بہت کمزور ہوگئی ہے...وہ... کیا نام ہے آپ کا؟

میں سوچنے لگا کہ ان دور دراز دیہات میں رہنے والے یہ دن بھر کے تھکے ہارے غریب شام کو ریڈیو کے گرد جمع ہوکر ہمارا پروگرام سنتے ہوں گے تو کتنا جی بہلتا ہوگا اور ساری تھکن دور ہو جاتی ہوگی ان کی۔

اس پر اور اپنے قہقہے کی بات پر یاد آیا کہ مجھے کراچی سے کچھ دور ٹھٹھ کے ایک گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ گاؤں کے کچے پکے مکان تو اونچی جھاڑیوں کے گھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ان کا مہمان خانہ گاؤں سے باہر بنا ہوا تھا جہاں سرِشام چار پائیاں ڈال دی گئی تھیں۔لوگ مجھے گھیرے بیٹھے تھے اور مزے مزے کی باتیں ہورہی تھیں۔کسی بات پر میں نے قہقہہ لگایا۔بعد میں مجھے بتایا گیا کہ گاؤں کے اندر چار سال کا ایک بچہ میرا قہقہہ سن کر چونکا اور ماں سے اپنی سندھی زبان میں کہا کہ وہ ریڈیو والا آ گیا۔

جو لوگ خوشی کماتے ہیں، وہ خوش نصیب ہوتے ہیں اور جو لوگ خوشی بانٹتے ہیں، وہ بہت ہی خوش نصیب ہوتے ہیں۔

شاہین کلب کی چٹپٹی باتوں میں سدھو بھائی کا حلوے کا شوق بہت رنگ بھرتا تھا۔ان کے مکالموں میں حلوے کا ذکر ضرور آتا تھا۔کبھی کبھار کہتے:

اے حلوۂ دالِ چنا، دنیا کی رونق تجھ سے ہے

ایک بار ہندوستان یا پاکستان سے کسی نے حلوے کا پارسل بنا کر سدھو بھائی، معرفت بی بی سی لندن کے پتے پر بھیج دیا۔ پارسل کچھ ٹوٹا، کچھ پھوٹا مگر ڈاک خانے والوں نے ہزار جتن کر کے اسے بی بی سی کے دفتر میں پہنچا دیا۔ پوری عمارت میں تہلکہ مچ گیا کہ پارسل میں ایک عجیب و غریب چیز آئی ہے۔کسی ہندوستانی ملازم نے یہ یقین تو دلا دیا کہ اس میں بارود نہیں بلکہ ہندوستانی یا پاکستانی میٹھا حلوہ ہے۔اس کے بعد اس سے بھی بڑا سوال اٹھا۔اتنی بڑی عمارت میں کام کرنے والے تین ہزار افراد میں یہ مسٹر سدھو بھائی کون ہیں؟

خدا جانے کیسے افلاطون زمانہ، افراسیاب یار جنگ ارسطو عرف سدھو بھائی شاہین کلب والے کو ڈھونڈ نکالا گیا اور ان کا حلوہ انھیں پیش کر دیا گیا۔ پھر کیا ہوا، اس کے لیے اگلا قصہ سنیے۔

ہمارے ساتھی علی احمد خاں جب بی بی سی لندن میں ملازم ہوکر آئے اور ان کے بچے بھی لندن آئے تو بچوں نے اپنے ابا سے پوچھا کہ کیا ہم سدھو بھائی سے مل سکتے ہیں؟ علی احمد خاں نے کہا کہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟ انھیں کسی روز کھانے پر اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔سدھو بھائی کو دعوت دی گئی۔ان کے لیے مزے مزے کی چیزوں کے علاوہ بہت سا حلوہ پکایا گیا اور سدھو بھائی کے سامنے سجا دیا گیا۔تب یہ بھید کھلا کہ وہ ذیابیطس کے مریض ہیں اور حلوہ یا کوئی بھی مٹھائی نہیں کھا سکتے۔

بچوں نے حیران ہوکر پوچھا ''تو سدھو بھائی، پروگرام میں وہ سب کہنے کی باتیں تھیں؟''

کچھ جھینپ کر اور کچھ شرما کر بولے ''ہاں۔''

ایسی شخصیت تھی ان کی۔ایک بار بی بی سی کے حکام بالا نے کہا کہ وہ اتنے مقبول ہیں، کیوں نہ انھیں ہندوستان پاکستان کے دورے پر بھیجا جائے۔ یہ سن کر میں مچل گیا اور کہا کہ وہ بہت سیدھے ہیں۔اس لیے ان کا نام سدھو بھائی ہے۔لوگ ان سے لطیفوں اور قہقہوں کی توقع کریں گے۔ چنانچہ ان کے ساتھ پروگرام کے نہ صرف سارے کردار بلکہ سارے اسکرپٹ بھی بھیجنے پڑیں گے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرا دل تو بہت دکھا لیکن اگر وہ چلے جاتے تو خدا جانے ان کا دل کتنا دکھتا۔ان کا کمال مکالموں کی ادائیگی میں تھا۔ان کی زبان میں اک ذرا سی لکنت تھی جسے وہ اس خوبی سے چھپاتے تھے کہ ان کی باتوں میں ایک عجیب سا لطافت کا رنگ بھر جاتا تھا۔اسی بنا پر لاکھوں سننے والوں کے چہیتے تھے۔

ایک روز یہ ہوا کہ ان پر جنھیں ہم لوگ سدھو بھائی نہیں بلکہ شاہ صاحب کہتے تھے، فالج کا حملہ ہوا۔انھیں اسپتال پہنچایا گیا جہاں انھیں فالج کے تمام مریضوں کی طرح لٹا لیا گیا اور وہ پروگرام سے غیر حاضر ہوگئے۔ہم نے سننے والوں کو بتایا کہ سدھو بھائی پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور وہ اسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔

یہ اعلان ہونا تھا کہ سننے والوں خصوصاً بچوں کے خطوں کا تانتا بندھ گیا۔اتنی دعائیں، اتنی دعائیں کہ شمار کرنا دشوار ہوگیا۔ہم نے یہ کیا کہ ان خطوں کے تھیلے بھر بھر کر اسپتال پہنچانے شروع کر دیے۔شاہ صاحب بستر پر لیٹے لیٹے دن بھر وہ خط پڑھا کرتے۔دعاؤں کا یہ سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ادھر ڈاکٹروں نے محسوس کیا کہ شاہ صاحب کی حالت سنبھل رہی ہے۔

شاہ صاحب دو تین مہینوں کے اندر صحت یاب ہوکر کام پر واپس آ گئے۔ڈاکٹر حیران رہ گئے کہ اتنی تیزی سے صحت یابی کیسے ہوگئی۔ شاہ صاحب ایک سال بعد طبی معائنے کے لیے اسپتال گئے اور واپس آکر بتایا کہ جو مریض ایک سال پہلے داخل تھے، وہ اب تک داخل ہیں۔

شاہین کلب سننے والوں نے بڑی خوشیاں منائیں۔شاہ صاحب کو دفتر میں ہلکا پھلکا کام دیا جانے لگا۔ البتہ ریڈیو پروگرام میں انھیں دشواری ہونے لگی۔ فالج اپنے کچھ اثرات چھوڑ گیا تھا۔اس پر ہم نے یہ کیا کہ سدھو بھائی کے پرانے پروگراموں کی ریکارڈنگ اس طرح چلائی جیسے یہ نئے پروگرام ہیں لیکن وہ ذخیرہ بھی کچھ عرصے بعد ختم ہوگیا مگر ہم پروگرام کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔

پروگرام شاہین کلب میں بچوں کے گانے کی روایت پرانی تھی۔ نازیہ حسن اور ان کے بھائی پاکستان ٹیلی ویژن پر بچوں کے گیت گاتے ہوئے لندن آئے تھے، وہ دونوں شاہین کلب میں بھی گانے لگے۔ پھر مصلح الدین اور ان کی اہلیہ ناہید نیازی بھی پاکستان ٹیلی ویژن کی طرح بی بی سی سے بھی بچوں کے نغمے گانے لگے۔

جن دنوں میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش لائبریری میں انیسویں صدی کی بھولی بسری اور نایاب کتابوں کا مطالعہ کر رہا تھا بہت سی ایسی کتابیں ملیں جو اس زمانے کے بچوں کے لیے لکھی گئی تھیں اور میرے بچوں کے دادا نے پڑھی ہوں گی۔ اس پر 'دادا کی کتابیں' کے عنوان سے پروگرام شروع کیا گیا اور سننے والوں کو وہ قدیم کتابیں پڑھ کر سنائی گئیں جو ان کے دادا پر دادا پڑھتے ہوں گے۔ بعد میں محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد کی کتابوں سے انتخاب سنگِ میل پبلی کیشنز نے 'الٹا گھوڑا' اور 'ظالم بھیڑیا' کے عنوان سے شائع کیا۔

پروگرام 'شاہین کلب' کی ایک اور بے مثال کامیابی اس کے انعامی مقابلے تھے۔ چونکہ سننے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس لیے ان مقابلوں میں بلا مبالغہ ہزاروں بچے حصہ لیتے تھے۔ پروگرام کے دو مقابلے مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔

شاہین کلب میں ماں کی محبت کا ذکر بہت ہوتا تھا اور خلیل احمد کا بچوں کا کورس ''پیاری ماں مجھ کو تیری دعا چاہیے، تیرے آنچل کی ٹھنڈی ہوا چاہیے'' مسلسل آنے والی فرمائشوں پر نشر ہوا کرتا تھا۔ اسی مناسبت سے ہم نے سننے والوں کو دعوت دی کہ وہ ماں کی محبت کے بارے میں اپنی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ لکھ کر بھیجیں۔ یہ اعلان تو کمال کا ثابت ہوا۔ بچوں اور بڑوں سب نے ماں کی محبت کے بارے میں دل پر اثر کرنے والے ایسے ایسے واقعات لکھ کر بھیجے کہ انھیں اسٹوڈیو میں پڑھتے پڑھتے ہم سب کی آنکھیں بھیگ جاتی تھیں۔

اس مقابلے میں نو سو خط آئے۔ ان میں قابل غور خط چھانٹنے کا کام ہم سب نے آپس میں بانٹا اور پھر جو بہت اچھے خط چنے گئے ان میں سے انعام پانے والے دس بارہ خط چننے کا فرض ذرا سوچیے کسے سونپا گیا۔ اپنے وقت کی بہت بڑی ادیبہ قرۃ العین حیدر کو۔

شاہ صاحب کی علالت کے بعد پروگرام میں وہ پہلی سی آب وتاب نہیں رہی۔ سدھو بھائی کمزور ہوگئے اور ہر ایک کوشش کی تھی کہ ان پر کام کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ ہم پرانے ٹیپ چلا چلا کر ان کے قصے دہرا رہے تھے۔ وہ خود کہا کرتے تھے کہ عابدی بھائی میرا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے مجھے پروگرام میں شامل رکھتے ہیں۔ یوں بھی ہر ہفتے مزاحیہ خاکے لکھنا اگرچہ بہت مشکل نہیں لیکن لکھتے لکھتے آٹھ نو سال گزر جائیں تو مزاح کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ اب مجھے 'جرنیلی سڑک' اور 'شیر دریا' جیسے بڑے پروگرام ترتیب دینے کے لیے لمبے لمبے دوروں پر جانا تھا۔ میں شاہین کلب پیش کرنے کی ذمے داری سے عہدہ برآ ہوگیا۔

اس دوران مجھ سے یہ حماقت ہوئی کہ میں نے یہ سوچ کر کے اصل ریکارڈنگ کے ٹیپ تو محفوظ ہیں، میں نے مکالموں کے مسودے بچا کر نہیں رکھے۔ میں ریٹائر ہوگیا اور میری جگہ آنے والی نئی نسل کو ان ٹیپوں کی نہ تو اہمیت کا احساس ہے نہ ان کی قدر ہے۔ وہ اِدھر اُدھر رُل گئے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ہوا کہ سدھو بھائی، یعنی ہمارے محمد علی شاہ انتقال کر گئے۔ میرے کچھ ساتھیوں نے پروگرام زندہ رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن اب وہ بات آنی مشکل تھی۔

12 اکتوبر سنہ 1985 کو شاہین کلب کا ایک ہزاروان پروگرام نشر ہوا تھا جس کا ٹیپ مرے پاس محفوظ ہے۔ اس مقام پر اپنے قارئین اور شاہین کلب کے پرانے مداحوں کے لیے اس خصوصی پروگرام کا مسودہ پیش خدمت ہے۔ لیجیے، پڑھیے اور لطف اٹھائیے:

Shaheen Club

C 5 R77C1000X

12 October 1985

سب مل کر: السلام علیکم۔

عابدی: لو بھئی۔ یہ رہا ہمارا تمھارا شاہین کلب اور آج یہ اس کا ایک ہزاروان پروگرام ہے۔

سدھو: یعنی بوڑھا ہوگیا ہے۔

پروین: آپ کی طرح۔

آغا: آج ایک ہزاروان پروگرام ہے۔ مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے۔

پروین: مجھے یقین ہے کہ آج نہ صرف ہمارے نئے سننے والے بلکہ پرانے سننے والے بھی بہت خوش ہوں گے جو ایک ہزار ہفتے پہلے شاہین کلب سن چکے ہوں گے۔

سلطانہ: میری طرف سے ان تمام سننے والوں کو بہت بہت مبارکباد جو آج اپنے پروگرام شاہین کلب کا ایک ہزاروان ہفتہ منا رہے ہیں۔

سدھو: ارے صاحب، آپ لوگ ایک ہزار ہفتے کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے وہ دن نہیں دیکھا جب کرکٹ کے میدان میں میرے ایک ہزار رن پورے ہوئے تھے۔

سب: (حیرت سے) ایک ہزار رن!!

سدھو: جی ہاں۔ ذرا سوچیے۔ میں نے کس شان سے دایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر بلا گھمایا تھا۔ ہوا کٹنے کی آواز ہوئی تھی: شائیں! اور گیند نیلے آسمان کو چھوتی ہوئی میدان سے باہر چلی گئی تھی۔

سلطانہ: بڑی تالیاں بجی ہوں گی۔

سدھو: ارے صاحب۔ اتنی تالیاں بجیں کہ تین دن تک لوگوں کی ہتھیلیوں میں درد ہوتا رہا اور میرے کانوں میں...

پروین: اچھا سدھو بھائی۔ شاید اسی روز سے آپ اونچا سنتے ہیں۔

سدھو: جی! کیا کہا آپ نے؟

پروین: (چیخ کر) جی کچھ نہیں۔

عابدی: مگر سدھو بھائی۔ ایک ہزار رن بنانے کے لیے تو آپ کو بہت دوڑنا پڑا ہوگا۔ ٹانگیں شل ہوگئی ہوں گی۔

سدھو: (فخریہ) ہونہہ۔ آپ کا یہ بھائی کبھی دوڑ کر رن نہیں بناتا تھا۔ بس بلّا تھام کر وکٹوں کے سامنے جم کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ کھمبے کی طرح۔

سلطانہ: کتوں کو بہت آسانی ہو جاتی ہوگی۔

سدھو: جی؟ کچھ کہا آپ نے؟

عابدی: ہاں تو وہاں کھڑے کھڑے آپ چوکے اور چھکے مارتے رہتے تھے؟

سدھو: جی۔ بلکہ میرا مطالبہ تھا کہ چوکے اور چھکے کی طرح اٹھے بھی ہونے چاہئیں۔

پروین: وہ کب؟

سدھو: جب گیند شہر سے باہر نکل جائے۔

آغا: کمال ہے۔ آپ نے ایک ہزار رن بھی بنا لیے اور دوڑے بھی نہیں۔

سدھو: مگر اس روز جب میں نے تاریخی چھکا مارا تھا تو نہ صرف میں خود دوڑا بلکہ دونوں ٹیموں کے بائیس کھلاڑی، دونوں امپائر اور پانچ لاکھ کا مجمع بھی دوڑا۔

سلطانہ: (حیران ہوکر) پانچ لاکھ۔

پروین: سدھو بھائی۔ ٹھیک ٹھیک لگا لیجیے۔

سدھو: (جھینپ کر) میرا مطلب ہے پانچ سو۔

عابدی: مگر کیسے؟

سدھو: ارے صاحب۔ اس کا بھی بہت دلچسپ واقعہ

ہے۔

سلطانہ/ پروین: ہمیں بھی سنایئے۔

سدھو: سنیے۔ جب میرے ساڑھے نو سو رن ہوگئے تو سارے شہر کو اندازہ ہوگیا کہ آج ایک ہزار رن پورے ہوجائیں گے اور دنیا کے سارے ریکارڈ ٹوٹ جائیں گے۔ اب تو ہر جگہ دھوم مچ گئی کہ آج کرکٹ کی تاریخ میں بڑا کارنامہ ہونے والا ہے۔ عجائب گھر والوں نے اعلان کردیا کہ وہ آج کے میچ کی گیند پانچ لاکھ روپے میں خریدیں گے۔

سلطانہ: (حیران ہوکر) پانچ لاکھ؟؟

پروین: سدھو بھائی، ٹھیک ٹھیک لگا لیجیے۔

سدھو:: (جھینپ کر) میرا مطلب ہے ایک لاکھ۔

عابدی: اچھا پھر؟

سدھو: بس یہ اعلان کیا ہوا، سمجھیے غضب ہوگیا۔ ارے صاحب شہر کی ساری آبادی میچ کے میدان میں پہنچ گئی۔ ہر ایک نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ میری تاریخی گیند اُچک لے گا۔ میرے رن بنتے جارہے تھے۔ سارا مجمع زور زور سے گنتا جارہا تھا۔

سب مل کر: نوسو بیاسی۔ نوسو چھیاسی۔ نوسو نوے۔ نوسو چورانوے۔

پروین: کیا حالت ہوگی۔

سدھو: ارے صاحب لوگ اٹھ کھڑے ہوگئے۔ کسی نے جوتے اتار کر ہاتھوں میں لے لیے۔ کسی نے پتلون کے پائنچے چڑھائے۔ لوگوں نے دھوتیاں گھڑس لیں اور یوں تیار ہوگئے جیسے سیٹی بجتے ہی دوڑ پڑیں گے۔

سلطانہ: اور پھر وہ تاریخی چھکا لگا ہوگا۔

سدھو: جی ہاں اور لوگوں نے میرے رن گنے۔ نو سو چورانوے اور اگلی گیند پر میں نے چھکا لگایا تو...

آغا: لوگوں نے نعرہ لگایا ہوگا.... ایک ہزار!

سدھو: جی نہیں۔ انھوں نے گیند آسمان کی طرف جاتے دیکھ کر نعرہ لگایا: دوڑ بے دوڑ۔ سیکڑوں کا مجمع گیند کی طرف دوڑ پڑا۔ ارے صاحب، ایک لاکھ روپے کی گیند تھی وہ۔

پروین: سدھو بھائی۔ دوڑنے والوں میں سب سے آگے کون تھا؟

سدھو: جی۔ یہ آپ کا بھائی۔

سلطانہ: آپ تھے؟

سدھو: جی ہاں۔ گیند ہوا میں جارہی تھی اور سارا مجمع نیچے دوڑ رہا تھا۔ سب کی نگاہیں گیند پر جمی تھیں۔ آگے آگے میں تھا، کرکٹ کے لباس میں۔ البتہ میرے آگے امپائر جمشید تھے، امپائر کے لباس میں۔

پروین: ان سے بھی آگے کوئی تھا؟

سدھو: جی ہاں۔ بغیر ڈھکن کا گٹر۔

آغا: اُف بے چارے۔

سدھو: سارا مجمع دوڑ رہا تھا۔ گردنیں اوپر اٹھائے ہوئے۔ اچانک میرا پیر ایک کتے کی دم پر پڑا۔ کتا چیخ مار کر اچھلا اور میرے پیچھے آنے والے مولوی شیر علی کو بھنبھوڑنے لگا۔ مولوی شیر علی گرے تو ان کی ٹوپی دور گری جس میں خاں صاحب الجھ گئے۔ خان صاحب کے ہاتھ میں جو جوشاندے کی پڑیا تھی، وہ اچھل کر رشید صاحب کے منہ پر لگی۔ رشید صاحب کا چشمہ ہوا میں اڑا اور لالہ بنسی پرشاد کی بڑی سی ناک سے ٹکرایا۔ لالہ جی نے گالی دینے کے لیے جو منہ کھولا تو ان کی بتیسی نکل کر سائیکل پر دوڑنے والے محمد گل کی گود میں گری۔ محمد گل بوکھلا کر گرا تو حافظ عبدالرشید کی ٹانگ اس کی سائیکل کے پہیوں میں آگئی۔ حافظ جی اوندھے منہ گرے۔ ان کی صورت دیکھ کر نور محمد نے ہنسنے کے لیے اپنا پیٹ پکڑنا چاہا مگر ہجوم زیادہ تھا۔ غلطی سے اس نے غلہ منڈی والے لالہ جی کا پیٹ پکڑ لیا۔ انھوں نے شاید دھوتی کس کر نہیں باندھی تھی۔ لوگ منہ پھیر کر آگے نکل گئے۔ دور تک لالہ جی کی آواز آتی رہی: یہ بے ایمانی ہے، یہ بے ایمانی ہے۔

پروین: اور گیند کہاں گئی؟

سدھو: وہ تو ہوا میں چلی جارہی تھی۔ اچانک سفید داڑھی والے چاچا خیرالدین کہیں سے نکلے اور میرے آگے آگے دوڑنے لگے۔ ان کی نگاہیں بھی گیند پر جمی ہوئی تھیں۔ سامنے رنگریز کپڑے رنگنے کے لیے بڑے سے کڑھاؤ میں کالا رنگ پکا رہے تھے۔ چاچا خیرالدین اوندھے منہ رنگ میں گرے۔ ایک سال تک ان کی داڑھی کالی رہی۔ انھوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تین شادیاں اور کرلیں۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: وہ ہوا کے رخ پر چلی جارہی تھی۔ راستے میں ایک بارات جارہی تھی۔ آگے آگے بینڈ والے تھے۔ پیچھے پیچھے دولہا گھوڑے پر سوار تھا۔ جیسے ہی انھیں پتا چلا کہ گیند ایک لاکھ روپے کی ہے، بینڈ والے بھی گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ان کا خیال تھا گیند کو اپنے بھونپو میں کیچ کرلیں گے۔ ادھر دولہا نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اسے گیند کے پیچھے دوڑانے لگا۔ راستے میں اس کا چاندی کا سہرا بجلی کے تاروں میں الجھ گیا۔ سامنے محمد علی ہائی اسکول کی چھٹی ہورہی تھی۔ اس کے لڑکے نکل کر گیند کے پیچھے دوڑنے لگے۔ ہارون ٹیکسٹائل مل کے مزدور چھوٹ رہے تھے، وہ بھی دوڑ پڑے۔ اس روٹ کی بسیں بھی دوڑ میں شامل ہوگئیں اور مسجد کے لیے چندہ جمع کرنے والی ٹولی نے بھی یاہو کا نعرہ لگایا اور ریزگاری سے بھرے لکڑی کے ڈبے بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑنے لگی۔

آغا: بڑا مجمع دوڑ رہا ہوگا؟

سدھو: ارے صاحب اب تو سودا بیچنے والے بھی ساتھ دوڑنے لگے۔ کوئی پان لگا لگا کر دوڑنے والوں کو دے رہا تھا۔ کوئی بھنے ہوئے گرم گرم بھٹے دے رہا تھا اور ایک چاٹ والا تو دوڑتا جارہا تھا اور گول گپوں میں سونٹھ کا پانی بھر بھر کر اسکور لکھنے والے کو کھلاتا جارہا تھا۔

عابدی: اور گیند؟

سدھو: زنانٹے کے ساتھ اڑی چلی جارہی تھی۔ محلے میں کسی کے گھر بچہ ہوا تھا۔ باہر ایک ٹولی دوپٹے لہرا کر اور تالیاں بجا کر جیو جیورے للا۔ جیو جیورے للا گارہی تھیں۔ گیند کی خبر سنتے ہی وہ بھی تالیاں بجاتی ہوئی گیند کے پیچھے دوڑی۔ ان کی آواز آرہی تھی۔ (تالیاں بجاتے ہوئے) اے مردارو، ہٹو ہمارے سامنے سے، گیند میں پکڑوں گی۔

عابدی: اور سدھو بھائی آپ کہاں تھے؟

سدھو: سب سے آگے۔ میرے پیچھے امپائر ہارون تھے۔ ہماری نظریں گیند پر جمی ہوئی تھیں کہ اچانک گیند کی رفتار سست ہوئی۔ مجمع نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ اپنی رفتار بڑھا دی۔ امپائر ہارون مجھ سے آگے نکل گئے۔ گیند اور نیچے ہوئی اور بہت گہرے دریا کے پل پر گر کر ٹھہر گئی۔ امپائر ہارون لپکے۔ گیند نے مڑ کر پیچھے مجمع کو دیکھا۔ ایک فاتحانہ ہنسی ہنسی اور غڑاپ سے نیچے دریا میں جاگری۔ امپائر ہارون تن کر کھڑے ہوگئے اور اسکور لکھنے والے کی طرف دیکھتے ہوئے چلاّئے: چھکا۔

■

ماخذ: ریڈیو کے دن: رضا علی عابدی، سنہ اشاعت: 2012، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

منور حسن کمال

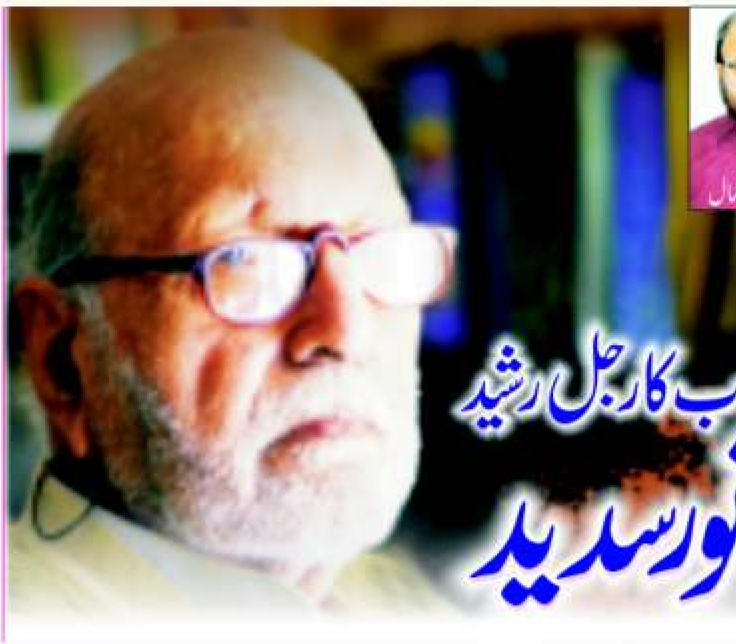

ادب کا رجل رشید
انور سدید

ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کے مختلف رنگ اور مختلف پہلو ہیں۔ وہ زندگی بھر ایک مشین کی طرح لکھتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے ادب کی طرف رغبت اور پھر صحافت کی خدمت تک ان کی زندگی کا کوئی گوشہ خالی نظر نہیں آتا۔ انور سدید کی عملی زندگی کا آغاز 1947 میں محکمہ آبپاشی میں -/35 روپے ماہانہ تنخواہ سے ہوا۔ بعد ازاں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کر کے 1948 میں محکمہ آبپاشی میں ہی میٹر کے عہدے پر مامور ہوگئے۔

انور سدید کو کہانیاں سننے کا شوق اپنی والدہ محترمہ کی سنائی گئی قصص الانبیاء کی کہانیوں سے ہوا۔ ذرا بڑے ہوئے تو اپنے بھائی معراج الدین کی 'ہوم لائبریری' سے بغیر اجازت کے راشد الخیری، پریم چند، خواجہ حسن نظامی، ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر معروف ادیبوں کے ناول اور افسانے پڑھ کر اپنے ادبی شوق کو پورا کرتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید کا تعلق ایک نومسلم راجپوت خاندان سے ہے۔ پہلے یہ خاندان سری نگر میں رہتا تھا اور ہندو مذہب سے وابستہ تھا۔ انور سدید کے خاندان کے ایک فرد میاں بشیر احمد کے مطابق آزادی سے قبل سری نگر سے ایک ہندو شجرہ نویس سرگودھا (پاکستان) آیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ان کے خاندان کی جنم پتریاں بھی تھیں۔ اس کی روایت کے مطابق اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان (انور سدید) کے خاندان کے ایک بزرگ نے کشمیر کے ایک ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کرلیا۔ ڈوگرہ راج میں یہ خاندان نقل مکانی کر کے گجرات کے راستے بھیرہ ومہانی پہنچا اور پھر یہیں آباد ہوگیا۔ (پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر انور سدید۔ شخصیت اور فن، پروفیسر سجاد نقوی، ص 13، اکادمی ادبیات پاکستان مطبوعہ 2010)

بھیرہ ومہانی قصبہ میں ہی 4 دسمبر 1928 کی ایک پرکیف اور نیک ساعت میں محمد انور الحق جو بعد میں انور سدید کے قلمی نام سے مشہور ہوئے، پیدا ہوئے۔ روایتی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خاں کے اسکولوں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی والدین کی خواہش کے مطابق انسان خود کو ڈھالنے، بنانے اور سنوارنے میں مصروف ہوجاتا ہے اور اپنی دلچسپی، رجحان اور طبعی میلان کو پس پشت رکھنا پڑ جاتا ہے۔ ایسا ہی انور سدید کے ساتھ بھی ہوا۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا انجینئر بنے، چنانچہ وہ انجینئر بنے اور اپنے ادبی رجحانات اور میلانات کو دبائے زندگی کے پیچ وخم سنوارنے میں مصروف ہوگئے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بچپن سے ہی انھیں افسانوی ادب نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ انھوں نے محکمہ آبپاشی میں ملازمت کے دوران بھی تعلیمی سلسلے کو برقرار رکھا... اور فاصلاتی تعلیمی نظام کے توسط سے بی اے اور ایم اے کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے 'اردو ادب کی تحریکیں' موضوع کا انتخاب کیا۔ اس سے قبل اس موضوع پر وہ ایک مفصل اور مبسوط مضمون قلم بند کر چکے تھے، جس کی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے نگراں ڈاکٹر وزیر آغا مقرر کیے گئے... اور انور سدید کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔

'اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید کی ایسی علمی، تحقیقی اور تفصیلی کتاب ہے، جو پہلی مرتبہ جب 1985 میں شائع ہوئی تو اردو ادبا اور ناقدین نے اس کتاب کی ایسی پذیرائی کی، جو اس سے قبل شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب کے اب تک کم وبیش ایک درجن ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام تحریکات کا احاطہ کیا گیا ہے، جن میں کسی نہ کسی طور ادب کی شیرینی وچاشنی پائی جاتی ہے۔ اردو دنیا حیران تھی کہ انور سدید نے کس خوبی سے کتنی محنت اور مطالعے اور تحقیق سے اس موضوع کو ایسا دلچسپ تر بنا کر پیش کیا کہ اس کے مطالعے کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری تصنیف کی گنجائش نہ کل تھی، نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ یہ بات یقین سے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب میں برصغیر کی قدیم تحریکیں، یوروپ کی تحریکوں کے تقابلی جائزے، سیاسی اور ادبی تحریکیں، رومانی اور کلاسیکی تحریکیں، قرون وسطی کی تحریکیں، تہذیبی ترقی کی روشنی میں دنیا کی قدیم تحریکوں کا مطالعہ، مسیحیت، اسلام، قرون وسطی، مغربی ادب کی تحریک، تحریک وجودیت، نفسیات، تجریدیت، علامت نگاری کی تحریکات، ریختہ کی پہلی تحریک، صوفیا کی تحریک، علی گڑھ، انجمن پنجاب کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ اقبال کی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک، تحریک ادب اسلامی اور پاکستان میں اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا جائزہ، کوئی ایسا موضوع تلاش بسیار کے بعد بھی شاید نہ ملے، جو چھوٹ گیا ہو۔ اس کتاب کو ایسے ادبی حوالے کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جو اپنی اولین اشاعت سے ہی اردو کے ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں کی رہنمائی کر رہی ہے۔

میں میدان ادب میں کسی بھی طرح کی گروپ بازی کا قائل نہیں رہا ہوں، لیکن انور سدید سے متعلق گروپ بازی میں شمولیت کے واقعہ نے اس جانب سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب نظر دوڑاتا ہوں تو دور تک بہت سی گروپ بازیاں نظر آتی ہیں، لیکن یہ بات سچ ہے کہ مشہور ادیب، افسانہ نگار اور ناقد احمد ندیم قاسمی سے انور سدید کی گروپ بازی علمی اور دانشورانہ وقار کے ساتھ جاری رہی۔ بقول سعید آسی: احمد ندیم قاسمی کے گروپ میں ہمیں عطاء الحق، امجد اسلام امجد، خالد احمد اور دوسرے ممتاز قلم کار نظر آتے ہیں، جبکہ وزیر آغا کے لیے تمام سوالوں کے جوابات کی کمان اکیلے انور سدید کے ہاتھ میں رہی ہے۔

ادبی گروپوں میں تفریق 'فنون' اور 'اوراق' کے ذریعے اجاگر ہوتی ہے۔ 'فنون' احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت نکلتا تھا اور 'اوراق' کی ادارت ڈاکٹر وزیر آغا اور پھر ڈاکٹر انور سدید نے سنبھال رکھی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید اس لیے بھی نمایاں مقام ومرتبہ رکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات کی تعداد 80 سے زیادہ ہے۔ اور یہ کتابیں اتنے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، جو دور تک کسی کے

جنرل تھے۔ وہ پاکستان چلے گئے اور وہاں وہ بن گئے پاکستان کے UNO کے نمائندے۔ چھوٹے بھائی ذو الفقار بخاری وہ بن گئے ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل۔ اس کے علاوہ اس وقت بہت بڑے رائٹرس...... میں ابھی نام بھول رہا ہوں۔

ص ع گ : راجیندر سنگھ بیدی، منٹو، کرشن چندر

امین سایانی : جی ہاں- بیدی، منٹو، کرشن چندر یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو کے لیے لکھا کرتے تھے۔ صرف اردو ہندی ہی نہیں بلکہ تمام زبانوں کے بڑے بڑے رائٹرس یہاں ریڈیو پر تھے۔ انگریزی میں ایک ڈیمیلو صاحب تھے۔ جب گاندھی جی کی ہتیا ہوئی تھی تو سات گھنٹے تک ریڈیو میں کامینٹری دی فی البدیہہ، رونگٹے کھڑے کر دینے والے۔ نام کیا بتاؤں بیسیوں ایسے نام تھے۔ جو اپنے فن میں ماہر تھے اور ریڈیو سے منسلک تھے۔ ریڈیو پر آنے کو لوگ فخر سمجھتے تھے۔ لیکن کسی بھی محکمے میں اگر کوئی غلط آدمی آ جاتا ہے تو سارا معاملہ چوپٹ ہو جاتا ہے۔

فلم سنگیت ہماری تہذیب کا نچوڑ ہے۔ آسان سے آسان ترین زبان میں ہر روز فرمائشی پروگرام ہوتے تھے۔ لمبی لائن ہوا کرتی تھی فلمی گانوں کے فرمائش کی۔

ہوا یہ کہ ایک صاحب آئے B.D.Keskar یہ شاید 50 سے پہلے کی بات ہے۔ انھوں نے فلم سنگیت BAN کر دیا۔ کہا کہ یہ بہت Vulgur ہے۔ کوئی خاص چیز نہیں ہے بند کرو اس کو۔ ہندوستان کی آل انڈیا ریڈیو کی لائبریری جو تھی وہ ساری دنیا میں سب سے بڑی لائبریری تھی، فلمی گانوں کی۔ جب انھوں نے فلمی گانے BAN کر دیے پھر اس کا اثر یہ ہوا کہ سارے گانے پھینک دیے گئے توڑ دیے گئے بیچ دیے گئے۔ سارے کو نیست و نابود کر دیا گیا اور بھی بہت کچھ ہوا ان ہی کی وجہ سے۔ آل انڈیا ریڈیو کی جو جان تھی جو شان تھی Interest value تھی وہ سب ختم ہوگئی۔ اگر کوئی کسی سیکشن میں بہت ہی اچھا آدمی تھا تو اس کو اٹھا کر ایسے سیکشن میں رکھ دیا جو اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہو۔

مثلاً ایک صاحب تھے ان کو اردو لکھنی نہیں آتی تھی۔ ان کو اردو کا انچارج بنا دیا گیا۔ عجیب عجیب سی چیزیں ہوئی تھیں اس زمانے میں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جتنی پاپولر لسننگ تھی آل انڈیا ریڈیو کی وہ ختم ہوگئی۔ تب جا کر ریڈیو سیلون شروع ہوا۔ وہاں کوئی خاص اناؤنسر بھی نہیں تھے۔ بمبئی میں ہی ریڈیو سیلون کی آل انڈیا ایجنسی شروع ہوئی۔ اس میں کچھ اچھے اچھے لوگ آئے جس کی وجہ سے پروگرام چل پڑا۔ گیت مالا جیسا پروگرام آیا۔ ہزاروں پروگرام آئے، انگریزی میں بھی ہندی میں بھی اور دوسری زبانوں میں بھی اور ریڈیو سیلون چل پڑا ریڈیو سیلون جب بہت چلا تو پھر انڈیا گورنمنٹ کو بھی ہوش آیا۔ دھیرے دھیرے پھر وودھ بھارتی کی ابتدا ہوئی۔ اور گانے واپس لوٹ آئے۔ نریندر شرما کا بڑا ہاتھ تھا وودھ بھارتی شروع کرنے میں۔ دھیرے دھیرے پھر گانے واپس آنے لگے۔ ایک چھوٹا سا واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ تحریک آزادی کی ایک بہت بڑی سولجر تھیں ارونا آصف علی۔ وہ انڈر گراؤنڈ موومنٹ کی بہت بڑی لیڈر تھیں۔ ہمارا خاندان تحریک آزادی میں بہت گہرا اترا ہوا تھا۔ 1942 کی موومنٹ میں وہ اکثر چھپ چھپ کر ہمارے یہاں آتی تھیں ہماری ایک پڑوسن تھی ان کے یہاں رہتی تھیں۔ تو جب میوزک واپس آیا وودھ بھارتی شروع ہوگئی تھی۔ بہت اچھے طریقے سے۔ لیکن ابھی کمرشیل نہیں شروع ہوا تھا اور ریڈیو سیلون وہاں دھوم مچا رہا تھا۔ بھارت آزاد ہو چکا تھا تو ایک بار ارونا خالہ پھر آئیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے، تم اتنے بڑے خاندان کے بیٹے ہو۔ تم وہاں ریڈیو سیلون میں دھوم مچائے ہوئے ہو۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے کچھ کیوں نہیں کرتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ تم ایک لیٹر بھیجو میں وہاں پارلیمنٹ میں رکھوں گی نہرو جی کے سامنے۔ دیکھیں گے شاید کمرشیل شروع ہو جائے۔ تو پھر میں نے ایک لیٹر دیا اور انھوں نے پارلیمنٹ میں اس کو رکھا، نہرو جی نے پاس کر دیا پھر یہاں سے کمرشیل شروع ہوگیا۔ اس طرح میری جدو جہد سے آل انڈیا ریڈیو میں بھی کمرشیل شروع ہوگیا۔ کمرشیل شروع ہونے کے بعد اسپانسر پروگرام نہیں شروع ہو رہے تھے۔ تو اس کے لیے بھی مجھے بڑی جدو جہد کرنی پڑی۔ پھر جا کے پہلا اسپانسر پروگرام شروع ہوا ''سیریڈون کے ساتھی''۔ یہ میرا ہی پروگرام تھا۔ یہ بات ہے جون 1970 کی۔ پھر یہاں بھی اسپانسر پروگرام زوروں میں شروع ہوگئے۔ یہاں بھی ریڈیو کافی چل پڑا۔ ریڈیو کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب جب ریڈیو کو اچھی طرح ٹریٹ کیا گیا یہ چل پڑا۔ تنگ نظری سے کوئی کام نہیں ہوتا۔ بڑے پیار سے فراخ دل سے اگر کسی کام کو کیا جائے تو اس میں کامیابی ضرور ملتی ہے۔ ریڈیو کو بڑھاوا دیا جانا چاہیے۔ میں نے یہاں بھی کام کیا آل انڈیا ریڈیو کے لیے بھی بہت سارا کام کیا۔ جب ریڈیو سیلون کا پرسارن خراب ہونے لگا تھا۔ تو میں نے ریڈیو سیلون کی طرح یہاں بھی کئی پاپولر پروگرام شروع کیے۔ جب اچھی پالیسی ہوتی ہے تو جس کام کو بھی شروع کیا جائے اس میں کامیابی ملتی ہے۔ یہاں بھی آل انڈیا ریڈیو بہت مقبول ہوا۔

ریڈیو کی خاصیت یہ ہے کہ یہ بڑا سستا ذریعہ ہے، چلانا بھی آسان ہے۔ عام آدمی تک اس کی پہنچ ہے۔ غریب آدمی بھی بہ آسانی خرید سکتے ہیں۔ سارے ہندوستان میں اپنی بات بہ آسانی پہنچائی جا سکتی ہے۔ ٹی وی کی طرح ریڈیو پر جم کے نہیں بیٹھنا پڑتا ہے۔ آپ کھانا کھا رہے ہوں۔ نہا رہے ہوں، کھیل کود میں مصروف ہوں، یہاں تک کہ امتحان کی تیاری کر رہے ہوں۔ ریڈیو آپ کو ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ آپ اپنا کام بھی کیجیے ریڈیو بھی سنیے۔ ریڈیو کے علاوہ اور کوئی دوسرا ذریعہ ایسا نہیں ہے جو آپ کو بغیر ڈسٹرب کیے اپنا کام کرتا رہے۔

آج کل FM ریڈیو آ گئے ہیں۔ اس کی مقبولیت بھی بہت زیادہ ہے۔ Independent ریڈیو آ گئے ہیں۔ Independent ریڈیو میں اتنا شور ہوتا ہے اتنی چلا چلی ہوتی ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر بیچ کیا رہے ہیں۔ کمرشیل بھی ہوتا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔

ریڈیو پر میں سات برس کی عمر سے کام کر رہا ہوں۔ انگریزی میں براڈ کاسٹ ہوتا تھا۔ حمید سایانی صاحب میرے بڑے بھائی میرے گرو تھے۔ تب ایسا ہوتا تھا کہ ہر ایک چیز لکھنی پڑتی تھی۔ جس سے فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ہر ایک چیز تراش خراش کر آتی تھی۔ اس میں غلطیاں نہیں ہوتی تھیں۔ آج کل Independent Radio میں ایسا ہو گیا ہے کہ بے دھڑک بولنا بغیر کسی لکھائی پڑھائی کے۔

پھر ایسا ہوا کہ سارے Independent Radio ایک ہی Type کے گانے بجاتے تھے۔ پھر میں نے کچھ لوگوں سے کہا کہ ہمارے گولڈن ایرا (سنہرے دور) نے کتنے اچھے گانے دیے ہیں۔ ان کو بھی بجایا کیجیے۔ FM آنے کے بعد All India Radio ذرا بیک گراؤنڈ میں چلا گیا تھا۔ لیکن FM کی جو ترقی ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔

FM پر بھی میرے کچھ پروگرام آئے تھے جسے لوگوں نے بہت پسند کیے۔ ایک پروگرام تھا، ''سنگیت کے ستاروں کی محفل''۔ یہ ریڈیو سٹی پر چلا تھا۔ دوسرا نیا ریواؤل پروگرام میں نے شروع کیا تھا، ''ستاروں کی جوانیاں'' یہ Interviews پر مشتمل تھا۔ جو BigFM پر چلا۔ اس پروگرام کے تحت بڑے بڑے اسٹارس کے انٹرویوز جو میں نے اس زمانے میں ریکارڈ کیے تھے جب وہ تھوڑے تھوڑے جوان تھے۔ آج بھی یہ پھر شروع ہونے والا ہے۔ ''سنگیت کے ستاروں کی محفل'' یہ ریڈیو سٹی پر شروع میں ہفتے

میں ایک بار بجتا تھا، پھر دن میں دو بار بجنے لگے۔ اور تقریباً چار برس تک چلے۔ پھر BigFM والے میرے پاس آئے اور مجھ سے کہنے لگے ''سنگیت کے ستاروں کی محفل'' مجھے بھی دیجیے۔ انھوں نے ہفتے میں پانچ بار بجانا شروع کیا۔ FM ریڈیو پر میرے کچھ اور پروگرام آنے والے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کو بھی میں چابھی لگا رہا ہوں کہ سارے پروگرام پہلے آپ کے یہاں آتے تھے اس کو شروع کیجیے۔

ص ع گ : امین سایانی صاحب کچھ سوالات جو مجھے پہلے پوچھنے چاہئیں وہ بعد میں پوچھ رہا ہوں کیونکہ آپ کو تو ساری دنیا جانتی ہے۔ آپ کا نام ہی کافی ہے آپ کے تعارف کے لیے۔ لیکن آپ کے بارے میں کم لوگوں کو تفصیل سے معلومات ہے اسی وجہ سے میں چند ابتدائی سوال پوچھتا ہوں جیسے اپنے بچپن کے بارے میں بتائیں؟ ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی؟ بچپن کیسے گزرا؟ اپنے والدین کے بارے میں کچھ بتائیے؟

امین سایانی : میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے ایک تعلیم یافتہ خاندان میں آنکھ کھولی۔ میرے والد کا نام جان محمد سایانی ہے جو ایک درد مند معالج تھے جنھوں نے تحریک آزادی میں اپنا فرض خاموشی سے ادا کیا۔ میری ماں کا نام کلثوم سایانی ہے۔ جو مہاتما گاندھی کے ساتھ کی سوشل ورکر بھی تھیں۔ سب سے بڑے بھائی ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں جو امریکہ میں رہتے تھے۔ اور استاد کی طرح میرے بڑے بھائی حمید سیانی صاحب تھے۔ حمید بھائی نے قدم قدم پر میری رہنمائی کی اور ریڈیو کی دنیا میں لانے والے وہی تھے۔

میری ابتدائی تعلیم گجراتی سے شروع ہوئی، بمبئی کے نیو ایرا اسکول، گوالیار کے سندھیا اسکول اور پھر بمبئی کے سینٹ زیویئرس کالج میں میری تعلیم سلسلے وار ختم ہوئی۔ حمید بھائی نے میری دلچسپی انگریزی میں پیدا کی۔

ص ع گ : آپ ریڈیو پر کیسے آئے۔ اور پہلا پروگرام کب پیش کیا۔

امین سایانی : میں 7 سال کی عمر سے ریڈیو سے جڑ گیا۔ میں نے پہلے انگریزی میں ریڈیو پروگرام میں حصہ لینا شروع کیا۔ اردو ہندی پروگرام کرنے سے پہلے میں انگریزی پروگرام ریڈیو پر کیا کرتا تھا۔ تقریباً بارہ سال تک انگریزی میں ریڈیو پروگرام دینے کے بعد میں نے اردو ہندی کا پہلا بنا کا گیت مالا کا پروگرام کیا۔

ص ع گ : آپ کا صحافت سے بھی رشتہ رہا؟

امین سایانی: ریڈیو پر میں صحافت ہی کر رہا ہوں۔ ایک آدمی کی بات ایک پروڈکٹ کو دوسروں تک پہنچا رہا ہوں ویسے صحافت کے تعلق سے میری ایک دلچسپ کہانی ہے۔ میری والدہ محترمہ کلثوم سایانی نے گاندھی جی کے اصرار پر ایک پندرہ روزہ جریدہ 'رہبر' نکالنا شروع کیا۔ جو اردو، ہندی اور گجراتی میں شائع ہوتا تھا۔ لیکن زبان تینوں کی ایک ہی ہوتی تھی۔ گاندھی جی کے تصور کی ہندی+اردو = ہندوستانی - رہبر کی پرنٹنگ گھر پر ہی ہوتی تھی۔ مجھے صحافت سے ہمیشہ دلچسپی تھی۔ اس لیے میں اس کام کو دیکھنے لگا اور میں نے ہندوستانی میں سوچنا اور ذہن دوڑانا شروع کیا۔ مجھے یہ کام اچھا اس لیے لگتا تھا کہ مجھے نہ خالص اردو آتی تھی نہ خالص ہندی۔ اس زمانے میں ریڈیو کا شوق کوئی مستقل معاش کا ذریعہ نہ تھا اس لیے میرے بڑے بھائی حمید سایانی چاہتے تھے کہ میں وکالت کروں ماں چاہتی تھیں کہ صحافی بنوں کیوں کہ مجھے لکھنے کا بھی شوق تھا۔ آخر کار بھائی حمید سایانی نے کہا کہ پہلے میں بی اے کرلوں پھر صحافت میں آنے کی سوچوں۔ اتفاق سے میں جس کالج میں پڑھتا تھا یعنی سینٹ زیویئرس کالج، اسی کے ریڈیو انسٹی ٹیوٹ میں ریڈیو سیلون کے پروگرام ریکارڈ ہونے شروع ہوگئے۔ میں کالج کے خالی وقت میں وہاں جانے لگا۔ اس وقت وہاں ایک پروگرام چلتا تھا 'اوولٹین پھلواری' جس کی نظامت کرتے تھے کیریکٹر ایکٹر من موہن کرشن۔ اس پروگرام میں میری انٹری مشکل تھی۔ لیکن اتفاق سے ایک دن جو اوولٹین کا اشتہار چلاتے تھے وہ نہیں آئے۔ اس کی جگہ مجھے اس دن وہ اعلان پڑھنے کو کہا گیا۔ جو ان لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اور آئندہ بھی مجھے ہی اعلان کرتے رہنے کو کہا گیا۔

ص ع گ : اس وقت اس کا معاوضہ آپ کو کیا ملتا تھا۔

امین سایانی: یہ 1951 کی بات ہے اس وقت مجھے معاوضے کے طور پر ہفتے میں ایک 'اوولٹین کا ڈبہ' ملتا تھا۔ یہی میری کمرشیل براڈ کاسٹنگ کا پہلا قدم تھا۔

ص ع گ : بنا کا گیت مالا سے آپ کا رشتہ کیسے جڑا؟

امین سایانی : میرے بڑے بھائی حمید سایانی ان دنوں ریڈیو سیلون پر بنا کا گیتوں کا پروگرام 'ہٹ پریڈ' پیش کیا کرتے تھے۔ اس طرح کے پروگرام غیر ممالک میں تو عام تھے۔ لیکن ہندوستان میں ہندی میں نہ ریڈیو سیلون پر ایسا کوئی پروگرام تھا۔ نہ آل انڈیا ریڈیو پر۔ وودھ بھارتی تو شروع بھی نہیں ہوئی تھی۔ اور آل انڈیا ریڈیو میں فلمی موسیقی نہیں بجتی تھی۔ ریڈیو سیلون ہی واحد ذریعہ تھا فلمی گانے سننے کا۔ بنا کا گیت مالا کی شروعات 1952 کے آخر میں ہوئی اسے میں سب کی سمجھ میں آنے والی زبان میں ہندی+اردو= ہندوستانی زبان میں پیش کرتا تھا۔

شروع میں یہ پروگرام آدھے گھنٹے کا تھا۔ اس میں ہر ہفتے سات نئے گیت ہوتے تھے اور ان کو ترتیب دینا ہوتا تھا۔ پہلے ہفتے میں ہی تقریباً 9 ہزار خطوط آئے۔ ایک سال میں خطوط کی تعداد ہر ہفتے 35 ہزار تک پہنچ گئی۔ ریڈیو سے گیت تو ویسے بھی دن بھر سننے کو ملا کرتے تھے البتہ اس پروگرام کے ذریعے پہلی بار انھیں پیش کرنے والے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ پھر جب وہی پروگرام ایک گھنٹے کا اور گیتوں کی تعداد سولہ ہوگئی تو ہر ہفتے اوپر نیچے ہونے کے باوجود سننے والوں کی دلچسپی میں اضافہ کرنے لگے۔ تین چار ہفتوں کے اندر یہ پروگرام ہٹ ہوگیا۔ لوگ ہفتے بھر انتظار کر کے کان لگا کر بنا کا گیت مالا سنتے اور خطوط لکھتے۔ بنا کا گیت مالا پروگرام شہرت کی اس بلندی پر پہنچا کہ فلمی گیتوں کی مقبولیت اور کامیابی کا واحد معیار بن گیا۔

ص ع گ : میں بھی آپ کا زبردست فین اور آپ کی آواز کا دیوانہ تھا۔ میں نے بھی بنا کا گیت مالا خوب سنا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ جو فلمی گیتوں کے پائیدان کی جو بات ہے۔ وہ آپ کی مرضی سے ہوتی تھی۔ اور آپ اپنی من مانی کرتے تھے۔ کسی گانے کو نیچے کر دیا تو کسی گانے کو اوپر کر دیا کسی گیت کو سرتاج گیت بنا دیا۔ کیا یہ سچ ہے؟ تب میں لوگوں سے سنتا تھا آج آپ میرے سامنے ہیں۔ ذرا اس پر روشنی ڈالیے؟

امین سایانی: حقیقت یہ ہے کہ اس میں میری من مانی نہیں تھی۔ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کرتا تھا۔ نہ کسی سے گیت، فلم یا پروڈیوسر ڈائریکٹر ہیرو وغیرہ سے میری دشمنی تھی نہ دوستی۔ جن سے میرے تعلقات تھے اچھے تھے۔ لیکن یہ ترقی وتنزلی کا کھیل میں نہیں کھیلتا تھا۔ بلکہ سبا کا کمپنی کے پاس مختلف جگہوں کے ریکارڈ ڈیلرس کی طرف سے اسٹیٹمنٹ آتے تھے۔ جنھیں ترتیب دے کر میرے پاس بھیجا جاتا تھا اور ساتھ میں ریڈیو کلبوں اور پروانوں کی فرمائشیں اور رائے بھی ان میں شامل ہوتی تھی۔ ان سب کی روشنی میں جو فائنل لسٹ تیار ہوتی تھی اس پر فلمی دنیا کے دو بڑے نمائندوں کے دستخط لیے جاتے تھے۔ پھر شروع میں 18 اور پھر 25 بار بجنے والے گیتوں کو ریٹائر کیا جانے لگا، سال کے آخر میں انھیں سرتاج گیتوں کی فہرست ملک بھر میں پھیلے ہوئے ریڈیو کلبوں سے ان کی پسند کی ترتیب حاصل کر کے دو حصوں میں سالانہ پروگرام پیش کر دیا جاتا تھا۔

■

Sadre Alam Gauhar, Vill+Post-Pursaulia,
Distt-Madhubani(Bihar) - 847226
Mob.:9006326629

سہیل انجم

بیرون ہند کی اردو نشریات

سرزمین ہند اردو زبان کی جائے پیدائش ہے۔ اس زبان نے مختلف ادوار میں ترقیات کے منازل طے کیے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب یہی زبان رابطے، اطلاعات اور مواصلات کی زبان تھی۔ اطلاعات و مواصلات کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ جن میں ریڈیو کا ایک اہم مقام ہے۔ فی زمانہ اگر چہ ٹی وی چینلوں کی آمد نے ریڈیو کے دبدبے کو کم کر دیا اور اس کی مقبولیت کا سورج گہنا گیا تاہم وہ آج بھی مواصلات کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ صرف خبروں کے نقطہ نظر سے ہی ریڈیو کی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ تفریح کا بھی ایک موثر ذریعہ ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ تہذیبی و ثقافتی فروغ کا ایک پُر اثر وسیلہ بھی ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام کے بعد مختلف زبانوں میں پروگراموں کا آغاز ہوا۔ انھی میں ایک زبان اردو بھی تھی۔ اردو سروسز میں سب سے مقبول سروس آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس رہی ہے۔ یہاں تک کہ 1980 میں یونسکو کے ایک سروے میں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کے ساٹھ فیصد عوام آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سنتے ہیں۔ باقی چالیس فیصد افراد بی بی سی اردو اور ریڈیو پاکستان سنا کرتے ہیں۔ کراچی کی ایک اردو کمیٹی نے پاکستان کے بچوں کو یہ تلقین کی تھی کہ وہ صحیح زبان جاننے اور سیکھنے کے لیے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سنا کریں۔ اس سروس کا قیام 1965 میں عمل میں آیا تھا۔

ہندوستان اور پاکستان کے ریڈیو اسٹیشنوں نے تو اردو سروس کا آغاز کیا ہی ہے، غیر ممالک کے اسٹیشنوں نے بھی اردو میں اپنی نشریات شروع کی ہیں۔ جن ملکوں میں اردو آبادیاں رہی ہیں یا ہیں وہاں بھی یہ سروس شروع ہوئی اور جہاں نہیں ہیں وہاں بھی اس کا آغاز کیا گیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ رہی کہ ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام کا مقصد عوام تک اپنی بات پہنچانا ہوتا ہے۔ وہ ہر لسانی طبقے اور سماج تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے بڑے ریڈیو اسٹیشنوں سے درجنوں زبانوں میں نشریات پیش کی جاتی ہیں۔ اردو زبان چونکہ ایک بہت بڑے طبقے کی زبان رہی ہے اور آج بھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دنیا کے مختلف ملکوں میں اردو داں افراد موجود ہیں، اسی لیے ریڈیو اسٹیشنوں کے ذمے داروں نے اس زبان میں بھی اپنی نشریات شروع کیں۔ آج لا تعداد ممالک ہیں جہاں کے سرکاری اور غیر سرکاری ریڈیو اسٹیشن اردو میں پروگرام پیش کرتے ہیں۔ بلا شبہ اردو زبان کی مقبولیت اور اس میں اپنی بات موثر انداز میں کہنے کی صلاحیت کی وجہ سے ہی یہ سب کچھ ہوا ہے۔ دنیا کے کن کن ملکوں میں اردو نشریات جاری ہیں اور کیا کیا پروگرام پیش کیے جاتے ہیں، یہ بہت وسیع موضوع ہے اور اس پر تحقیقی انداز میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان نشریات سے اردو زبان و ادب اور صحافت کی کیا کیا خدمات انجام دی جا رہی ہیں اور ان سے اردو کا کتنا فروغ ہو رہا ہے اس پر بھی تحقیقی نظر ڈالی جانی چاہیے۔ تاہم اس مضمون میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ دنیا بھر میں جاری اردو نشریات کا ایک ہلکا سا تعارف کرا دیا جائے۔

جب 1947 میں تقسیم ہند کے نتیجے میں پاکستان کے نام سے ایک نیا ملک وجود میں آیا تو وہاں بھی ریڈیو اسٹیشن قائم ہوا جس کا نام 'ریڈیو پاکستان' ہے۔ ریڈیو پاکستان وہاں کا قومی و سرکاری ادارہ برائے صوتی نشریات و اطلاعات ہے۔ اس ادارے کا انتظام و انصرام پاکستان براڈ کاسٹنگ ایکٹ 1972 کے تحت ہے۔ یہ ادارہ اقتصادی، زرعی، سماجی، سیاسی، مذہبی اور ثقافتی شعبوں میں سماجی موضوعات پر مباحثوں، ڈراموں، فیچرز، دستاویزی پروگرام، سامعین کی شرکت والے مذاکروں، عام بات چیت، موسیقی اور خبروں کے پروگرام پیش کرتا ہے۔ ریڈیو پاکستان اردو کے ساتھ ساتھ 23 زبانوں میں پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس کے پروگرام متنوع ہوتے ہیں جن میں تہذیبی و ثقافتی اور ادبی پروگراموں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

لیکن دنیا میں اردو کی جن سروسز کو زبردست اہمیت

حاصل رہی ہے اور اب بھی ہے ان میں بی بی سی لندن کا نام سرفہرست ہے۔ برطانیہ میں الیکٹرانک میڈیا کی نمائندگی بی بی سی کرتا ہے۔ 11 مئی 1940 کو گرینچ کے معیاری وقت کے مطابق تین بجکر بیس منٹ پر بی بی سی ہندوستانی سروس کی نشریات کا آغاز ذوالفقار علی بخاری نے یوں کیا تھا:

''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
لندن سے ہندوستان کی خدمت میں آداب''

ذوالفقار علی بخاری اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے سربراہ تھے۔ اس اعلان کے بعد دس منٹ دورانیے کا خبرنامہ نشر کیا گیا۔ اس وقت کی ہندوستانی سروس کے پیش رووں میں آغا محمد اشرف، مشرف الحق، اقبال بہادر، رفیق انور، اور اوات لعل بقایا شامل تھے۔ جبکہ بلراج ساہنی کی آواز بھی ریڈیائی لہروں پر ان کے ہم دوش رہی۔ بلراج ساہنی بعد میں ہندوستان کے مشہور فلم اداکار کے طور پر سامنے آئے۔ اپریل 1949 میں ہندوستانی سروس دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک حصہ پاکستانی سروس اور دوسرا ہندوستانی سروس کہلایا۔ سترہ سال بعد یعنی 1966 میں پاکستانی سروس اردو سروس بن گئی اور ہندوستانی سیکشن نے ہندی سروس کا نام اپنا لیا۔ جبکہ بنگالی سیکشن ایک نئے شعبے کی صورت میں وجود میں آیا۔ 1968 میں حالات حاضرہ کے پروگرام سیربین کا آغاز ہوا جس نے جلد ہی ہندوستان اور پاکستان میں خبروں کے ایک آزاد اور معتبر ذریعے کے طور پر مقبولیت حاصل کرلی۔ یہ ایک سیاسی، معلوماتی، تعلیمی، تجزیاتی، ادبی اور تفریحی پروگرام نشر کرنے والا دنیا کا ایک بڑا نشریاتی ادارہ ہے۔ اس کی اردو سروس کے پروگراموں میں خبریں، جہاں نما، حالات حاضرہ، سیربین فیچر، سب رس، انجمن، میزان، سائنس کلب، کھیل کے میدان سے، شب نامہ، شاہین کلب، برگ گل، روشنی کا سفر، ستاروں کی محفل اور اہم سیاسی رہنماؤں، عالمی مدبروں اور بین الاقوامی شہرت یافتہ ادبی وعلمی شخصیات سے انٹرویو وغیرہ اہم جزو ہیں۔ اس وقت بی بی سی اردو سروس سے خبروں، حالات حاضرہ کے تبصروں اور خصوصی فیچرز پر مبنی نشریات میں پہلی مجلس میں جہاں نما، دوسری مجلس میں سیربین اور تیسری مجلس میں شب نامہ پیش کیا جاتا ہے۔ یہ سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے۔ اسے www.bbcurdu.com پر بھی سنا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ اس کی ویب سائٹ بھی ہے جو بے حد متنوع ہے۔

بیرون ہندنشریات میں دوسرا بڑا ادارہ وائس آف امریکہ ہے۔ دورانیہ کے اعتبار سے یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے بعد جو کہ چوبیس گھنٹے چلتی ہے، دوسرا بڑا اسٹیشن ہے۔ اس کی نشریات ہندوستانی وقت کے مطابق شام میں ساڑھے سات بجے سے شروع ہوکر صبح ساڑھے سات بجے تک یعنی بارہ گھنٹے مسلسل جاری رہتی ہیں۔ یہ ایک سرکاری نشریاتی ادارہ ہے جہاں سے چوبیس گھنٹے میں 65 زبانوں میں پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ وائس آف امریکہ نے اپنی نشریات کا آغاز 1943 میں کیا اور غیرملکی زبانوں کے شعبہ اردو نے 1951 میں اپنے پروگرام پیش کرنا شروع کیے۔ یہ سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے اور اسے کسی بھی وقت voanews.com\urdu پر سنا اور پڑھا جاسکتا ہے۔ اب اس کی اردو سروس کو ٹی وی پر بھی ڈال دیا گیا ہے اور اس کا نام وائس آف امریکہ ریڈیو آن ٹی وی رکھا گیا ہے۔ اس کی اردو سروس کا مقصد برصغیر کی اردو سمجھنے والی آبادی تک اپنی بات پہنچانا ہے۔ 2005 میں اس کی ویب سروس کا بھی آغاز کردیا گیا جس کا شمار اردو کی چند مقبول ترین ویب سائٹوں میں ہوتا ہے۔ اس کے پروگراموں میں ہندوستان، پاکستان، جنوبی ایشیا اور پوری دنیا کی تازہ ترین خبریں، حالات حاضرہ، صحت، ادب وثقافت، فنون لطیفہ، خواتین کے مسائل، سائنس، انفارمیشن ٹیکنالوجی، تعلیم، امریکی زندگی، اور عام دلچسپی کے دیگر موضوعات پر فیچرز سنوائے جاتے ہیں۔ پروگراموں کے دوران مقبول عام ہندوستانی اور پاکستانی گیتوں کے ساتھ ساتھ مغربی موسیقی بھی پیش کی جاتی ہے۔ جن سامعین کو خبروں اور حالات حاضرہ سے خصوصی دلچسپی ہے ان کے لیے روزانہ ایک ایک گھنٹے کے دو خصوصی پروگرام ''ان دی نیوز'' اور ''راؤنڈ ٹیبل'' براہ راست پیش کیے جاتے ہیں جو صرف خبروں اور حالات حاضرہ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ان پروگراموں میں ممتاز دانشور اور مبصر اہم موضوعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اس کا ایک ادبی مجلّہ بھی جاری ہوتا ہے جس کا نام ''صدا رنگ'' ہے جسے اسد نذیر ہر اتوار کو پیش کرتے ہیں۔ اس میں ادبی موضوعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت اہم ادبی شخصیات کے انٹرویوز، فن پارے اور دنیا بھر میں اردو ادب کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں جاری کوششوں کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں ہندوستان کے درجنوں ادیبوں کے انٹرویو نشر کیے جاچکے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرا سے ان کے کلام اور افسانہ نگاروں سے ان کے افسانے سنے جاتے ہیں۔ قدیم شعرا کی زبان میں ان کا کلام بھی سنوایا جاتا ہے۔ اس کے دیگر مقبول پروگراموں میں ثنا ایک پاکستانی، آواز دوست، ہردم رواں ہے زندگی، کچھ تو کہیے اور خط آپ کے قابل ذکر ہیں۔ صدا رنگ اور کچھ تو کہیے پروگراموں میں ہندوستان کے بے شمار ادیبوں اور شاعروں کے انٹرویو نشر ہو چکے ہیں۔ امریکی حکومت کے نظریات پر مبنی ایک پروگرام 'آج کا اداریہ' کے نام سے پیش کیا جاتا ہے۔

جرمنی کے شہر بون سے ڈوائچے ویلے اردو، ہندی اور بنگالی سمیت 31 زبانوں میں اپنے پروگرام نشر کرتا ہے۔ وائس آف جرمنی کی اردو نشریات کا آغاز 14 اگست 1964 کو ہوا تھا۔ ابتدا میں اس کی دو مجالس ہوتی تھیں لیکن اب اس کی یومیہ تین مجالس ہوتی ہیں۔ ان میں بالعموم جنوبی ایشیا، یورپ اور جرمنی سمیت پوری دنیا کے اہم معاملات و واقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اردو سروس کے ذریعے جرمن زبان کا کورس بھی پیش کیا جاتا ہے جو جرمن سیکھنے والوں میں خاصا مقبول ہے۔ وائس آف جرمنی کی اردو سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے اسے www.dw_world.d/urdu پر بھی سنا جاسکتا ہے۔ اس پر سامعین، قارئین کی فیڈ بیک بھی لی جاتی ہے جو روایتی طور پر اتنی زیادہ رہتی ہے کہ جرمنی کے اس عالمی نشریاتی ادارے کے نام دنیا بھر سے سالانہ فیڈ بیک میں اردو کا حصہ ہمیشہ دیگر شعبوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ 60 کی دہائی کے وسط میں جب کولون سے اردو نشریات کا آغاز ہوا تو اس کے سامعین پروگرام کے ذمے داروں کو اپنی رائے سے آگاہ کرنے کے لیے

جرمنی کے شہر بون سے ڈوائچے ویلے اردو، ہندی اور بنگالی سمیت 31 زبانوں میں اپنے پروگرام نشر کرتا ہے۔ وائس آف جرمنی کی اردو نشریات کا آغاز 14 اگست 1964 کو ہوا تھا۔ ابتدا میں اس کی دو مجالس ہوتی تھیں لیکن اب اس کی یومیہ تین مجالس ہوتی ہیں۔ ان میں بالعموم جنوبی ایشیا، یورپ اور جرمنی سمیت پوری دنیا کے اہم معاملات و واقعات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ اردو سروس کے ذریعے جرمن زبان کا کورس بھی پیش کیا جاتا ہے جو جرمن سیکھنے والوں میں خاصا مقبول ہے۔ وائس آف جرمنی کی اردو سروس انٹرنیٹ پر بھی دستیاب ہے اسے www.dw_world.d/urdu پر بھی سنا جا سکتا ہے۔

ڈاک کے روایتی طریقے استعمال کرتے تھے۔ تب ڈوئچے ویلے شعبہ اردو کو ہندوستان اور پاکستان سے اپنے سامعین کی طرف سے خطوط کے علاوہ پوسٹ کارڈ بھی موصول ہوتے تھے۔ پھر جب 90 کی دہائی میں انٹرنیٹ اور ای میل کا استعمال عام ہونے لگا تو سامعین بڑی تعداد میں بذریعہ ای میل اپنی رائے دینے لگے۔ اس کے بعد کے برسوں میں جب ڈوئچے ویلے کولون سے بون منتقل کیا گیا اور ٹیلی مواصلاتی رابطوں کے امکانات بہت جدید اور متنوع ہو گئے تو شعبہ اردو نے اپنے سامعین کے ساتھ رابطوں کے لیے ہندوستان اور پاکستان میں اپنے ایسے مستقل موبائل اور ٹیلی فون نمبروں کا اہتمام بھی کر دیا جن کے ذریعے سامعین اپنے اپنے ملکوں سے بغیر کسی اضافی لاگت کے لوکل ایس ایم ایس پیغامات بھیجنے لگے۔ پھر سامعین اور قارئین کی مزید سہولت کے لیے شعبہ اردو میں ہی ایک ایسے وائس میل باکس کا انتظام کر دیا گیا جہاں دنیا بھر میں کہیں سے کوئی بھی سامع یا قاری اس کا نمبر ڈائل کر کے اپنی ہی آواز میں اپنی رائے ریکارڈ کرا سکتا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ڈوئچے ویلے اردو نے اپنا فیس بک پیج بھی بنایا ہے جس کے ممبروں کی تعداد ساڑھے چھ لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے۔ یہ ممبر بڑی تعداد میں روزانہ ان باکس کے ذریعے اپنی رائے اور مشوروں سے آگاہ کرتے ہیں۔ وہاں سے فیڈ بیک پر مشتمل ایک پروگرام بھی پیش کیا جاتا ہے جس کا نام ہے ''آپ کی بات، آپ کے ساتھ اور فیس بک اسپیشل''۔

'صدائے روس' روس کی اردو نشریات کا نام ہے۔ روس سے اردو میں ریڈیو نشریات 18 مئی 1942 کو شروع ہوئی تھیں۔ یہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا جو روس کے لیے انتہائی مشکل دور تھا۔ اس وقت ریڈیو پر محاذ سے آنے والی خبریں نشر کی جاتی تھیں۔ جنگ سے متعلق سرکاری تبصرے، خبرنامے اور بیانات بھی پیش کیے جاتے تھے۔ اس دور میں جو لوگ اردو پروگرام تیار کرتے اور پیش کرتے تھے ان میں پروفیسر Dyakov Alexei اور خاتون اہلکار Kovalenkova Anna شامل تھے۔ ان دونوں کو ماسکو کی اردو سروس کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بہت جلد Rappoport Alla اور پھر کئی دوسرے لوگوں نے بھی ان کا ساتھ دینا شروع کر دیا جن میں شاہدہ زیدی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہدہ زیدی کی آواز سارے برصغیر میں جانی پہچانی تھی۔ ڈاکٹر حبیب انور اور اشفاق مرزا، آل انڈیا ریڈیو کی پریزینٹر طاہرہ حسین، Vassilyeva Ludmila، زاہد علی خان اور علی گڑھ یونیورسٹی کے انور علی کا نام قابل ذکر ہے جنھوں نے مختلف ادوار میں ماسکو ریڈیو کے شعبہ اردو میں کام کیا تھا اور سب کے سب اردو سے پیار کرنے والے اور بڑے ماہرین تھے۔ شروع سے ایک طویل عرصے تک پروگرام پیش کرنے والے روزانہ اردو نشریات کا آغاز ''یہ ریڈیو ماسکو ہے'' سے کرتے رہے ہیں۔ ریڈیو ماسکو مختلف ادوار سے گزرا ہے۔ روس میں تعمیر نو کے دور سے پہلے جو 1985 میں شروع ہوا تھا، ریڈیو ماسکو 82 زبانوں میں پروگرام نشر کرتا تھا۔ پھر ان زبانوں کی تعداد محض 32 رہ گئی۔ جن میں اردو زبان کی نشریات بھی شامل ہیں۔ یہ اس زبان کی مقبولیت کا اعتراف اور دنیا میں اس کی پسندیدگی اور مختلف معاملات میں اس کے اہم کردار کا واضح ثبوت ہے۔ صدائے اردو کی نشریات نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے سامعین بلکہ پوری دنیا کے اردو بولنے والوں سے مخاطب ہوتی ہیں۔ صدائے اردو سے اردو زبان کی یومیہ تین مجالس ہوتی ہیں۔

☆ٹورنٹو میں اردو ریڈیو کے پروگرام صدائے پاکستان، ریڈیو پاکستان، ساز آواز، ریڈیو کارواں، اور سن شائن کے ناموں سے ہر ہفتہ مختلف دنوں اور اوقات میں اپنی نشریات پیش کرتے ہیں۔ ٹی وی کے پرگراموں میں وژن آف پاکستان، دل دل پاکستان اردو کے ہفتہ وار پروگرام ہوتے ہیں۔ انھیں مشہور شاعر اور صحافی تسلیم الٰہی زلفی اور اشفاق حسین پیش کرتے ہیں۔ سرساگر سکھوں کا پنجابی اسٹیشن ہے لیکن اس میں زلفی صاحب ہر روز چار گھنٹے اردو کے معیاری پروگراموں کا اہتمام کرتے ہیں۔ ATN پر اشفاق حسن مجالس، تقریر، مشاعرے، گفتگو اور ڈرامے پیش کرتے ہیں۔ (یہ تفصیلات پرانی ہیں)۔

اسلامی جمہوریہ ایران کی نشریاتی کارپوریشن IRIB کے ریڈیو تہران سے بیس سے زائد غیر ملکی زبانوں میں پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں سے ایک گھنٹے کا اردو پروگرام بھی نشر ہوتا ہے۔ ریڈیو تہران کی اردو سروس انقلاب ایران کے بعد ایک نئے انداز میں 26 مئی 1979 کو شروع ہوئی۔ اس میں کام کرنے والا بیشتر عملہ دوسری نشریات کی مانند پاکستان اور ہندوستان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایران اردو ریڈیو کی ایک بہت خوبصورت ویب سائٹ بھی ہے جو مسلسل اپ ڈیٹ ہوتی رہتی ہیں۔

ریڈیو جدہ ایک زمانے سے اردو سامعین سے مخاطب ہوتا آیا ہے۔ اس کا نام اب تبدیل ہو کر ''سعودی عالمی اردو نشریات'' ہو گیا ہے۔ یہ نشریات جدہ سعودی عرب سے پیش کی جاتی ہیں۔ وہاں سے دو گھنٹے کی نشریات یومیہ سنی جا سکتی ہیں۔ سعودی عرب، ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش اور خلیجی ممالک کے لیے ریڈیو فریکوئنسی 21 میٹر بینڈ شارٹ ویو 13775 میگا ہرٹز پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان نشریات کو سعودی عرب میں سہ پہر تین سے چھ بجے تک، ہندوستان میں شام ساڑھے پانچ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک، پاکستان میں شام پانچ سے آٹھ بجے تک اور بنگلہ دیش میں شام چھ بجے سے نو بجے تک سنی جا سکتی ہیں۔ سعودی عرب کی عالمی اردو نشریات انٹرنیٹ www.rsaurdu.net پر بھی براہ راست اور ریکارڈنگ کی شکل میں دستیاب ہیں۔ یہاں سے اسلامی، مذہبی، سماجی، ثقافتی، تاریخی اور عہد حاضر سے متعلق امور پر پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

این ایچ کے جاپان کا واحد عوامی نشریاتی ادارہ ہے جس کی ریڈیو نشریات کا آغاز سنہ 1925 میں ہوا۔ این ایچ کے کے مالی وسائل کا ذریعہ جاپان میں ٹی وی رکھنے والے گھریلو صارفین کی فیسوں کی ادائگی ہے جس کا مقصد ادارے کو سیاست یا نجی تنظیموں کے اثر و رسوخ سے آزاد اور منصفانہ نشریات کے قابل بنانا اور سامعین کی آرا کو

اولیت دیتی ہے۔ این ایچ کے ورلڈ بین الاقوامی نشریات خدمات سرانجام دیتا ہے۔ یہ عالمی نشریاتی پیش کرتا ہے جن میں ٹیلی ویژن ، ریڈیو اور انٹرنیٹ خدمات شامل ہیں۔ ان سب کو مجموعی طور ''این ایچ کے ورلڈ'' کہتے ہیں۔ اس کے مقاصد میں دنیا بھر کے لوگوں کو ملکی اور بین الاقوامی خبریں مہیا کرنا، ایشیا کے بارے میں مختلف تناظر میں معلومات پیش کرنا، بڑے حادثات اور قدرتی آفات کی صورت میں زندگی بچانے کے بارے اہم معلومات بہم پہنچانا، جاپانی ثقافت وطرز زندگی کے پہلو، معاشرے اور سیاست میں حالیہ پیش رفت، تازہ ترین سائنسی اور صنعتی رجحانات اور اہم عالمی معاملات میں جاپان کے کردار اور موقف کو تیزی سے نشر کرنا ہے۔ این ایچ کے ورلڈ ریڈیو جاپان، انگریزی اور جاپانی سمیت اٹھارہ زبانوں میں دنیا بھر میں اپنی نشریات پیش کرتا ہے۔ ہر زبان کی نشریات کا دورانیہ مختلف ہے۔ لیکن ہر روز کل 85 گھنٹے اور دس منٹ کے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو جاپان سے اردو سروس کا آغاز 3 دسمبر 1942 کو ہوا۔ درمیان میں 4 ستمبر 1945 سے نشریات میں کچھ وقفہ آیا لیکن یکم اکتوبر 1955 سے نشریات کے دوبارہ آغاز سے یہ سفر مسلسل جاری ہے۔ یہ نشریات ہندوستان اور پاکستان کے سامعین میں بہت مقبول ہیں۔ سامعین ریڈیو کو خطوط بھی لکھتے ہیں۔ کسی زمانے میں ان اردو خطوط کا جاپانی زبان میں ترجمہ بھی ہوتا تھا۔

ترکی میں عوامی نشریات کا ذکر کرنے پر جو اولین اور واحد ادارہ ذہن میں آتا ہے وہ TRT ہے جس کا قیام یکم مئی 1964 کو عمل میں آیا۔ 5 مئی 1927 کو اپنی نشریات کا آغاز کرنے والا ریڈیو کا ادارہ بھی اسی تاریخ سے TRT کے ساتھ منسلک ہو گیا۔ یہ ادارہ تعلیم و ثقافت، موسیقی و تفریح، بچوں اور کھیلوں کے پروگرام، بحث و مباحثہ کے پروگرام، دستاویزی پروگرام، ڈرامے پیش کرتا ہے۔ بین الاقوامی معیار سے ہم آہنگ نشریاتی سلسلے کے ذریعے تعلیم، عمر اور ثقافتی و اقتصادی لحاظ سے مختلف ناظرین کے طبقوں تک پہنچنے، ان کی پسندیدگی اور تعاون حاصل کرنے والا ایک نشریاتی ادارہ ہے۔ دیار غیر میں بسنے والے ترکوں کو اپنے ملک سے رابطے کی فراہمی کے لیے بشمول ترک زبان 29 مختلف زبانوں میں نشریات پیش کی جاتی ہیں اور دنیا کے ہر کونے میں سنی جا سکتی ہیں۔ صدائے ترکی کی اردو زبان میں نشریات کو دنیا میں شارٹ ویو، سیٹیلائٹ اور انٹرنیٹ کے علاوہ اپنے نشریاتی شراکت داروں کے توسط سے FM پر بھی سنا جا سکتا ہے۔ اس کا ویب پیج بھی ہے۔ اس نے اپنی نشریاتی خدمات تک رسائی کی غرض سے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی نشریات کو براہ راست انٹرنیٹ پر پیش کیا۔ اس کے علاوہ ترکی اور دنیا بھر سے لمحاتی خبروں، اقتصادی اور مالیاتی بازاروں کی صورت حال، کھیلوں کے تمام رنگوں موسم کا حال ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا نشریاتی بہاو اور پروگراموں کی تشہیر جیسی اہم خدمات اس ویب سائٹ پر جگہ پائی جاتی ہیں۔

ریڈیو ناروے ایک سرکاری ریڈیو ہے اس نے 1970 میں اردو سروس شروع کی تھی۔ اوسلو ریڈیو سے بھی نصف گھنٹے کا اردو پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔

حکومت کویت کے سرکاری نشریاتی ادارے ریڈیو کویت سے اردو سامعین کے لیے یومیہ دو گھنٹے کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ اس سے قرآن کریم کا ترجمہ، احادیث اور نعت خوانی وغیرہ کے پروگرام بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ شارجہ ٹی وی نے اردو نشریات کا آغاز کیا ہے جو بہت مقبول ہیں۔

ریڈیو سڈنی سے وقتاً فوقتاً اردو پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔

ریڈیو قاہرہ مصر سے ڈیڑھ گھنٹے کا اردو پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ اسے شام چار سے ساڑھے چار بجے کے درمیان سنا جا سکتا ہے۔ یہ 17690 کلو ہرٹز پر آتا ہے۔

ماریشس میں بھی مقامی ریڈیو سے اردو نشریات کا سلسلہ جاری ہے اور یومیہ ڈھائی گھنٹے کا وقت مخصوص ہے۔ مقامی ٹی وی پر بھی اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور نعت خوانی وقوالی وغیرہ کے پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

چین کے دارالحکومت میں قائم ریڈیو بیجنگ کے غیر ملکی نشریات کے شعبہ اردو نے یکم اگست 1966 کو اپنا کام شروع کیا۔ یہ سروس روزانہ ساڑھے نو سے دس بجے تک سنی جا سکتی ہے۔ اردو سروس میں اداریہ، تازہ خبریں، بین الاقوامی حالات پر تبصرے، جائزے، رپورٹیں اور مختلف میدانوں میں نمایاں شخصیات کے انٹرویو پیش کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو بیجنگ سے ہونے والا مشاعرہ خاصا مقبول ہے جس میں مقامی چینی اردو داں حضرات بھی شرکت کرتے ہیں۔

سلطنت عمان کے دارالحکومت مسقط سے ریڈیو اومان کی غیر ملکی نشریات کی سروس سے اردو میں بھی پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔

حکومت قطر کے سرکاری نشریاتی ادارے قطر براڈ کاسٹ سروس کے ریڈیو قطر دوحہ سے اردو نشریات کا آغاز 1980 میں ہوا۔ شروع میں ایک گھنٹے کا پروگرام پیش کیا جاتا تھا لیکن 1989 سے اسے ڈیڑھ گھنٹہ کر دیا گیا۔

متحدہ عرب امارات میں ابوظہبی، دبئی، ام القوین، راس الخیمہ اور شارجہ سے روزانہ مجموعی طور پر نو گھنٹے کے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ ان میں دینی، علمی، سائنسی و ادبی پروگراموں کے علاوہ خبرنامہ، طب وصحت، معلومات عامہ، اردو عربی بول چال اور موسیقی کے پروگرام بھی شامل ہیں۔ ریڈیو ابوظہبی سے اردو پروگرام کا آغاز 1979 میں ہوا تھا۔

افغانستان میں اردو زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی خاصی تعداد ہے۔ ریڈیو کابل سے آٹھ غیر ملکی زبانوں میں نشریات پیش کی جاتی ہیں جن میں اردو کو بھی اہم مقام حاصل ہے۔

ازبکستان کے شہر تاشقند سے ریڈیو تاشقند سے بارہ غیر ملکی زبانوں میں پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ جن میں برصغیر کی اردو، پشتو اور ہندی بھی شامل ہیں۔ اردو میں نصف نصف گھنٹے کی دو مجلسیں ہوتی ہیں۔ جن میں خبرنامہ اور حالات حاضرہ پر تبصرہ شامل ہیں۔

آسٹریلیا کے اسپیشل براڈ کاسٹنگ سروس SBS کے تحت ریڈیو سڈنی سے ہفتے میں ایک دن اردو سروس کے پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یہ پروگرام 1975 میں شروع ہوا تھا اور اسے جمعہ کے روز پیش کیا جاتا ہے۔

ریڈیو فلپائن سے اردو سروس کا آغاز 1987 میں ہوا۔

ڈھاکہ سے ریڈیو بنگلہ دیش کی غیر ملکی نشریات میں اردو کو اہم مقام حاصل ہے۔ اردو سروس کے یہ پروگرام ریڈیو بنگلہ دیش ریڈیو کے علاوہ چٹا گانگ، کھلنا، رنگ پور اور سلہٹ سے بھی اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔

ڈنمارک کے کئی ریڈیو اسٹیشن سے اردو پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ ریڈیو ہم وطن ڈنمارک کے مسلمانوں کی ایک تنظیم اسلامک کوپن ہیگن نے قائم کیا ہے۔

جنوبی افریقہ میں ریڈیو ڈربن سے بھی اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں جن میں تلاوت، نعت خوانی، شعر و شاعری اور مذہبی تہواروں پر خصوصی پروگرام شامل ہیں۔

ان کے علاوہ سویزرلینڈ، فجی، ہانگ کانگ، سری لنکا، مالدیپ اور کینیا سے بھی اردو پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

■

Suhail Anjum, 370/6A Zakir Nagar, New Delhi-110025
Mob.:9818195929
Email.: sanjumdelhi@gmail.com

افتخار الزماں

معاشرے کی بیداری میں ریڈیو کا رول

موجودہ دور اطلاعات اور برقی نشریات کا ہے۔ ذرائع ترسیل و ابلاغ نے انسانی زندگی کو جس طرح متاثر کیا ہے اس نے پوری دنیا کو ایک چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔ اطلاعات و معلومات کی فراوانی کے سبب ایک طرف تو معاشرے حقیقت پسندی اور عقلیت کے حامل ہو رہے ہیں تو دوسری طرف نظریات کی بوچھار نے ان کی قوتِ فیصلہ سلب کر لی ہے۔ ہماری تمام خواہشیں ذرائع ترسیل و ابلاغ کی محکوم ہو کر رہ گئی ہیں۔ ذرائع ترسیل و ابلاغ کی اسی اثر پزیری کو دھیان میں رکھیں تو معاشرے کی بیداری میں ریڈیو ایک بہت اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ کسی بھی ملک کے معاشرے کی بیداری میں ریڈیو کا اہم رول ہوتا ہے اور میڈیا میں اگر ہم صرف ریڈیو کی بات کریں تو یہ رول خود بخود نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ ذرائع ابلاغ کے دوسرے وسیلوں کے مقابلے میں ریڈیو کے کئی فائدے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کی آواز بہت ہی کم خرچ پر دنیا کے کونے کونے تک پہنچ سکتی ہے۔

اس میں استعمال ہونے والی ٹکنالوجی بھی اتنی پیچیدہ نہیں جتنی ٹیلی ویژن میں ضرورت ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ریڈیو کی آواز سننے کے دوران ہم دوسرے کام بھی کر سکتے ہیں۔ ایک اور اہم بات یہ بھی ہے کہ ریڈیو کا فائدہ ناخواندہ لوگ بھی اٹھا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہی پوری دنیا نے ریڈیو کی ایجاد کے بعد ذرائع ابلاغ کے اس وسیلے کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور سماج کو جدید بنانے کے لیے اس کا استعمال کیا۔ ہندوستان میں بھی ابتدا میں ریڈیو کا بھرپور استعمال کیا گیا جس سے سماجی بہبود کے کام کو کافی تقویت ملی۔ بنیادی طور پر ریڈیو نشریات کے تین مقاصد ہیں لوگوں کو تعلیم دینا، اطلاعات فراہم کرنا اور تفریح کا سامان کرنا۔ جہاں تک تعلیم دینے کی بات ہے یہ رسمی اور غیر رسمی تعلیم دونوں کے لیے ریڈیو کافی مفید ہے۔ برطانیہ میں ریڈیو کے ذریعے تعلیم فراہم کرنے کا کام 1922 میں British Broad Casting Company قائم ہونے کے دو سال بعد شروع ہوا۔ یہی کمپنی بعد میں British Broad Casting Corporation یعنی BBC میں تبدیل ہوئی۔ امریکہ میں یہ کام 1930 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں شروع ہوا۔ ہندوستان میں اس کام کو انجام دینے میں کئی ادارے شامل ہوئے۔ چونکہ ہمارے ملک میں آل انڈیا ریڈیو یعنی آکاش وانی کی آواز تقریباً پوری آبادی تک پہنچ سکتی ہے۔ اس لیے اس کے پروگرام دور دور تک سنے جانے لگے۔ ان پروگراموں کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ رسمی تعلیم حاصل کرنے والے مختلف سطحوں کے طالب علموں کے لیے الگ الگ نشر کیے جاتے ہیں۔ اسکول Broad Casting کے تحت پرائمری اسکول، سکنڈری اسکول اور یونیورسٹیوں کے لیے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بالغوں کے لیے غیر رسمی تعلیم بھی فراہم کی جاتی ہے۔ بچوں، نوجوانوں، اور خواتین کے لیے بھی خصوصی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ کئی اسٹیشنوں میں چھٹیوں کے دوران طالب علموں کو پیشہ ورانہ اداروں میں داخلے کے لیے بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں انجینئرنگ، میڈیکل، زرعی اور Veterenary Sernica کے ادارے شامل ہیں۔ ایسے پروگرام بھی نشر کیے جاتے ہیں جن میں طالب علم اور دیگر لوگ براہ راست Studio میں بیٹھے ماہرین کے ساتھ ٹیلی فون کے ذریعے بات چیت کر سکتے ہیں اور اپنے سوالوں کے جواب حاصل کر سکتے ہیں۔ نوجوانوں کے لیے ایک علیحدہ چینل Yuv-Vani ہے۔ اردو سروس، نئی دہلی میں نئی نسل نئی روشنی پروگرام ہے جس کے ذریعے وہ اپنی صلاحیتوں کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی بھی ریڈیو کی سہولیات کا استعمال کر کے Gyan-Vani FM چینل چلا رہی ہے۔ جو صرف طالب علموں کو تعلیم فراہم کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ اس وقت یہ پروگرام تقریباً 26 اسٹیشنوں سے نشر کیے جاتے ہیں۔ مزید 15 اسٹیشن اس کے دائرے میں لانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ان کا خاص مقصد شمال مشرقی ریاستوں اور انڈمان، نکوبار جزیروں کی طرف توجہ دینا ہے۔ اسکول جانے سے پہلے بچوں کے لیے بھی ایک پروگرام شروع کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعے 3 سے 6 سال تک کے بچے اور آنگن باڑی میں پڑھنے والے سماج کے کمزور طبقوں سے

تعلق رکھنے والے بچوں کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ ریڈیو نے کئی ایسے سلسلے وار پروگرام نشر کیے ہیں جن کا تعلق مختلف سماج سے ہے اور اس میں سماجی برائیوں سے ان سے چھٹکارا پانے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ ان میں شراب نوشی، کم عمر میں لڑکوں، اور لڑکیوں کی شادی، میاں بیوی کے درمیان گھریلو جھگڑے، خواتین کے مسئلے وغیرہ شامل ہیں۔

آلودگی کے موضوع پر سلسلے وار پروگرام اور زرعی تعلیم فراہم کرنے سے متعلق پروگرام کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ FM ریڈیو شروع ہونے کے بعد ریڈیو کا رول اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ جہاں تک اطلاعات فراہم کرنے کا تعلق ہے اس کے لیے آکاش وانی، خبروں کا شعبہ اپنی ذمے داری نبھا رہا ہے۔ اس کے تحت 277 اسٹیشنوں سے 23 زبانوں اور 146 ڈائیلیکٹ میں خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ کاروبار کو فروغ دینے کے لیے آکاش وانی نے Commercial اسٹیشن بھی قائم کیے ہیں۔ جو اشتہارات کے ذریعے آکاش وانی کے لیے رقوم جمع کرتے ہیں۔ کسانوں کو زراعت سے متعلق ضروری اطلاعات فراہم کرنے کے لیے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔ اس کے ذریعے انھیں بہتر کاشت کے لیے عمدہ طور طریقوں، اچھے بیج اور سینچائی وغیرہ کی جانکاری دی جاتی ہے۔ انھیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کس موسم میں کس چیز کی کاشت مفید ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ موسم کی جانکاری اور پیشن گوئی سے انھیں باخبر رکھا جاتا ہے۔ قدرتی آفات کے وقت بھی ضروری اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس طرح جہاں پوری دنیا میں ریڈیو کا استعمال سماجی بہبود کے لیے کیا گیا وہیں ہندوستان میں بھی ریڈیو کا استعمال اس مقصد کے لیے کیا گیا۔ تعلیم فراہم کرنے، لوگوں کو اطلاعات فراہم کرنے اور اُن کی تفریح کے علاوہ ریڈیو نے قومی یکجہتی کو مضبوط کرنے کے لیے بھی نمایاں کام کیا ہے۔ ریڈیو لوگوں میں یکجہتی کا احساس دلانے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ چونکہ اس کی آواز ہر علاقے میں سنی جاتی ہے اس لیے یہ مقامی زبانوں میں پروگرام نشر کر کے لوگوں کے بہت قریب آ سکتا ہے اور انھیں قومی مفاد کے لیے چھوٹے چھوٹے اختلافات بھلا کر ایک دوسرے سے میل جول کے ساتھ رہنے کی ترغیب دے سکتا ہے اور آل انڈیا ریڈیو یہ ذمے داری بحسن و خوبی نبھا رہا ہے۔

ریڈیو کی اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے عالمی یوم ریڈیو یعنی World Radio Day بھی منایا جانے لگا ہے اور 13 فروری کا دن عالمی یوم ریڈیو کے طور پر منایا جاتا ہے۔ یہ تجویز 2010 میں اقوام متحدہ میں پیش کی گئی جس کے بعد اس پر کافی غور و خوض ہوا اور یہ طے پایا کہ 13 فروری کا دن اس کے لیے مقرر کیا جائے۔ چنانچہ پہلا عالمی یوم ریڈیو World Radio Day، 2012 میں منایا گیا۔ جب دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خصوصی

> **خواتین اور نوجوان اپنی پسند کے پروگرام سنتے ہیں اور سماج اور ملک کی ترقی کے کام میں شامل ہورہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہنگامی حالات میں ریڈیو، اطلاعات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ آندھی طوفان، سیلاب، زلزلہ اور دیگر قدرتی تباہی کے وقت ریڈیو اطلاعات دینے کا کافی اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ ناگہانی آفتوں کے امکان سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے بھی ریڈیو کا رول کافی اہم رہا ہے۔ عالمی یوم ریڈیو پر ہر سال ریڈیو پروگراموں کے لیے ایک موضوع چنا جاتا ہے جس پر سال کے دوران خصوصی پروگرام بنائے اور نشر کیے جاتے ہیں۔**

پروگرام نشر کیے گئے۔ 13 فروری کا دن اس لیے مقرر کیا گیا کیونکہ اس دن اقوام متحدہ کی طرف سے 1946 میں UN ریڈیو اسٹیشن شروع ہوا تھا۔ UNESCO کے اس فیصلے کی اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی بعد میں تائید کی۔ ویسے پہلا پبلک ریڈیو براڈ کاسٹنگ 13 جنوری 1910 میں تجرباتی طور پر منعقد ہوا تھا جو 20 کلومیٹر دور ایک سمندری جہاز میں سنا گیا۔ اس سے پہلے بھی وائرلیس براڈ کاسٹنگ کے تجربے ہوئے جو زیادہ کامیاب نہیں ہو سکے۔ اقوام متحدہ کے فیصلے میں دنیا کی بڑی بڑی براڈ کاسٹنگ تنظیمیں شامل تھیں۔

ریڈیو پر Short wave نشریات شروع میں بہت محدود تھے۔ مگر 1933 میں جرمن میں ہٹلر کے اقتدار میں آنے کے بعد اس کی اہمیت کا احساس سب سے پہلے ہٹلر کو ہی ہوا۔ اُس وقت ریڈیو جرمنی سے یہ پروگرام صرف 2 گھنٹوں کے لیے نشر ہوا کرتے تھے۔ مگر ہٹلر نے اسے 18 گھنٹے تک اور بعد میں 24 گھنٹوں تک بڑھا دیا۔ اُس نے اس کے ذریعے پروپیگنڈا کے پروگرام نشر کرنا شروع کیے جو امریکہ، روس اور دوسرے دور دراز ملکوں میں سنے جاتے تھے۔ ان نشریات کے ذریعے لوگوں کی سوچ پر اثر انداز کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس طرح سے ہٹلر نے ریڈیو کا پورا فائدہ اٹھایا۔ آج ریڈیو FM اور Digital سطح تک پہنچ چکا ہے اور اس کا براڈ کاسٹنگ معیار بھی کافی بہتر ہوا ہے۔ اس سے کروڑوں کی تعداد میں بے زبان لوگوں کو زبان مل گئی ہے۔ خواتین اور نوجوان اپنی پسند کے پروگرام سنتے ہیں اور سماج اور ملک کی ترقی کے کام میں شامل ہو رہے ہیں۔ اتنا ہی نہیں ہنگامی حالات میں ریڈیو، اطلاعات فراہم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ آندھی طوفان، سیلاب، زلزلہ اور دیگر قدرتی تباہی کے وقت ریڈیو اطلاعات دینے کا کافی اہم ذریعہ ہے۔ چنانچہ ناگہانی آفتوں کے امکان سے لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے بھی ریڈیو کا رول کافی اہم رہا ہے۔ عالمی یوم ریڈیو پر ہر سال ریڈیو پروگراموں کے لیے ایک موضوع چنا جاتا ہے جس پر سال کے دوران خصوصی پروگرام بنائے اور نشر کیے جاتے ہیں۔ 2014 کا موضوع ''مرد اور خواتین کو برابر کا درجہ دینا ہے۔'' یقیناً یہ ایک نیک قدم ہے۔ ہماری کوشش ہونی چاہیے کہ خواتین ہر شعبے میں ایک نمایاں رول ادا کر سکیں مگر اس کے لیے ہمیں ایک سازگار ماحول تیار کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ریڈیو کا استعمال کافی مفید ہو سکتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اب کمیونٹی ریڈیو پر خصوصی توجہ دی جانے لگی ہے اور کمیونٹی ریڈیو کے ذریعے خبریں بھی نشر کیے جانے کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ گویا دھیرے دھیرے ہم ریڈیو کی اہمیت کو سمجھنے لگے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ یہ عمل مستقبل میں بھی جاری رہے گا۔

ریڈیو ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے اور اسے فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اس انقلابی دور میں ریڈیو کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہمیں ریڈیو کی خوب صورتی کو تسلیم کرنا ہوگا، اس کے کرشمے کو سمجھنا ہوگا اور اس کی طاقت کو استعمال کرنا ہوگا تاکہ عام لوگ اس کا بھرپور فائدہ اٹھا سکیں۔ جوں جوں ریڈیو کے میڈیم میں جدید ٹکنالوجی کا زیادہ سے زیادہ استعمال ہوگا ریڈیو اور زیادہ مفید بنتا جائے گا۔ اس لیے اس میڈیم کا مستقبل بھی کافی روشن ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کی اہمیت کو سمجھیں اور اسے اپنی حکمت عملی میں وہ مقام دیں جس کا یہ حقدار ہے۔

■

Iftekharuz Zaman, Natioanl Channel, All India Radio, Toda Pur, Delhi - 110012

حسام الدین فاروقی

کمیونٹی ریڈیو کی تحریک اور امکانات

ریڈیو ایک ایسا میڈیم ہے جو سماج کے اکثر طبقے سے سیدھا جڑتا ہے۔ اسی لیے اسے ماس میڈیم بھی کہا گیا ہے۔ ریڈیو کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے اس کے پروگرام یا اسٹیج تیار کرنے کا طریقہ آسان، سستا اور سہل ہے۔ دوسری طرف سننے والے کے لیے ریڈیو ان معنوں میں بھی سہل اور آسان ہے کیونکہ اسے کسی دوسرے کام میں مشغول ہوتے ہوئے بھی سنا جاسکتا ہے مثلاً کار چلاتے ہوئے، کچن میں کھانا پکاتے ہوئے اور اب تو میٹرو ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بھی ریڈیو سنا جاسکتا ہے۔

اسی لیے دنیا کے قریب قریب سبھی ملکوں نے ریڈیو کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اپنے ملک میں ریڈیو قائم کرنے کی ضرور کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں ریڈیائی نشریات کے سرکاری ادارے کے طور پر آل انڈیا ریڈیو 1936 سے ہندوستانیوں کو خبروں کے ساتھ، ان کی تعلیم اور تفریح کے لیے اپنی خدمات دیتا رہا ہے۔

ٹیلی ویژن کے آجانے سے ریڈیو کے سامعین تھوڑے وقت کے لیے TV کی طرف منتقل ہوگئے لیکن FM یعنی Frequency Modulater پر اور زیادہ صاف اور اسٹیریو آواز والے ریڈیو نے پھر انھیں اپنی طرف متوجہ کیا اور ایف ایم اسپیکٹرم پر نجی اداروں کے ریڈیو اسٹیشنوں کی زیادہ بہتر نشریات کی بدولت ایف ایم ریڈیو عوامی زندگی کا حصہ بن گیا۔

اس کے بعد FM پر ہی حکومت ہندوستان نے پرائیویٹ ایجنسی کے بطور ملک میں مِنی کمیونٹی ریڈیو کے لیے لائسنس دیے اور ایک انقلابی فیصلہ کیا۔

کمیونٹی ریڈیو اسٹیشن کو سمجھنے سے پہلے ہمیں یہ دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ کسی ریڈیو اسٹیشن کو چلانے کے لیے اس کے دو خاص حصے ہوتے ہیں۔ ایک کو اسٹوڈیوز کہہ سکتے ہیں اور دوسرا ٹرانسمیٹر ہے۔

اسٹوڈیو وہ ساؤنڈ پروف کمرہ ہے جہاں دوسری آوازیں ریڈیو پر بولنے والے کی آواز میں خلل انداز نہ ہوں۔ اس کے علاوہ اس حصے میں پروگرام تیار کرنے کے آلات ہوتے ہیں۔ ان میں ایک Console ہوتا ہے جن میں ہم کو فلسنگ کی سہولت بھی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مائکروفون کم از کم دو یا اس سے زیادہ ہوتے ہیں کمپیوٹر بھی ہوتے ہیں جن میں سافٹ ویئر کی مدد سے ہم آواز ریکارڈ کرسکتے ہیں، Edit کرسکتے ہیں اور پھر انھیں کمپیوٹر سے براڈ کاسٹ بھی کیا جاسکتا ہے۔ علیحدہ سے کمپوز ہوں تو ہم Editing Suib بھی بنا سکتے ہیں۔ ریڈیو کا دوسرا اہم حصہ Transmitter کا ہوتا ہے جس کے ساتھ ایک Antinia کا ہونا بھی ضروری ہے۔ Transmitter اور Antinna کی مدد سے ریڈیو کی نشریات دور دور تک ریڈیو سیٹ پر سنی جاسکتی ہے۔

عام طور پر ریڈیو چلانے کے لیے 10 کلوواٹ کی طاقت کے ٹرانسمیٹر کی اجازت ہوتی ہے اور 10 کلوواٹ ٹرانسمیٹر کی مدد سے ایک فری کیونسی پر ریڈیو 70 کلومیٹر کے دائرہ تک سنائی دے سکتا ہے۔

کمیونٹی ریڈیو کے لیے محض 30 واٹ سے 1 کلو واٹ تک کی اجازت دی گئی ہے اور انٹینا کی اونچائی صرف 30 میٹر تک رکھنی ہوتی ہے۔

اس طرح اک کمیونٹی ریڈیو کا دائرہ محض 5 کلومیٹر سے 20 کلومیٹر کے ریڈیوز کا بنتا ہے یعنی کمیونٹی ریڈیو ایک خاص محدود دائرے میں ہی سنے جاتے ہیں۔

یہی بات بہ ظاہر کمیونٹی ریڈیو کو ایک کمزور ریڈیو ظاہر کرتی ہے لیکن دراصل یہی کمیونٹی ریڈیوز کی خوبی بھی بنتی ہے کیونکہ اپنی براڈ کاسٹنگ کا سارا وقت ریڈیو کو ایک خاص دائرے کے لوگوں کے لیے دینا ہوتا ہے یعنی ان کے رہن سہن، ان کی زبان، ان کے ریت رواج اور ان کے کام دھندوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہی پروگرام دینے ہوتے ہیں مثلاً اک سمندری علاقے میں چلائے جانے والے کمیونٹی ریڈیو کے لیے مچھواروں کو ذہن میں رکھ کر اپنے پروگرام ترتیب دے گا اس کے براڈ کاسٹ کے اوقات بھی ان اوقات کے مطابق ہوں گے جب کمیونٹی کے زیادہ تر مرد مچھلی پکڑنے کے لیے سمندر میں جانے کے لیے تیاری شروع کرتے ہیں یا شاید جب اسی کمیونٹی کی عورتیں بازار میں مچھلی بیچنے کے لیے پہنچیں گی۔ تب پھر ریڈیو کے لیے وہ ایک اہم وقت ہوگا۔ اس خوبی

کی وجہ سے یہ ریڈیو کمیونٹی ریڈیو کہلاتا ہے اور سننے والوں کے لیے وہ ان کا اپنا ریڈیو بن جاتا ہے۔

دسمبر 2002 میں ہندوستان میں حکومت نے کمیونٹی ریڈیو شروع کرنے کے لیے اور اس کا لائسنس حاصل کرنے کے لیے ایک پالیسی تیار کی۔

تین طرح کے اداروں کو لائسنس کا مستحق قرار دیا گیا:

1. زراعت سے جڑے ادارے جن میں کرشی وگیان کیندر وغیرہ شامل ہے۔
2. تعلیمی ادارے
3. نان گورنمنٹ آرگنائزیشن NGOs جنھیں کم از کم تین سال باقاعدہ کام کرتے ہوئے ہو چکے ہوں۔

جو باتیں پالیسی میں طے ہوئیں ان کے تحت وزارت اطلاعات و نشریات میں 'کمیونٹی ریڈیو' کے لائسنس کے لیے درخواست اس کے تیار شدہ فارم پر دینا ہوگی جس کے ساتھ سبھی ضروری کاغذات کو لگانا ضروری ہوگا۔

2. اس درخواست پر کمیونیکیشن منسٹری کے WPC یعنی Wireless Planning & Coordination سے فری کیونسی لینا ہوگی اور ساتھ ہی SACFA Clearance درکار ہوگا۔ یہاں SACFA کلیرنس دراصل Standing & Advisory Communitee on Radio Frequency Station Clearance کا مخفف ہے۔

کمیونٹی ریڈیو کے درخواست کنندگان کو درخواست کے لیے Application form جمع کرنے کے بعد LOA یعنی Letter of Intent ملتا ہے۔ اس کے بعد GOPA یعنی Grant of Permission Agreement مل جانے کے بعد اپنے ریڈیو کے علاقے میں رہ رہے لوگوں یا کمیونٹی کے بیچ کا ایک بنیادی جائزہ Base line survay بھی جمع کرنا ہوتا ہے جس کے تحت کمیونٹی کو نئے ریڈیو کے بارے میں جانکاری دینا اور ایک ریڈیو کے مقاصد کو بیان کرنا ہوتا ہے اور اس طرح ریڈیو کے لیے ایک Vision Statement بھی تیار کرنا ضروری ہے۔

کمیونٹی ریڈیو کو منظم رکھنے کے لیے وزارت اطلاعات و نشریات کی جانب سے ایک مشوراتی میمورنڈم یعنی Advisory بھی جاری کیا گیا ہے جس کے مطابق کچھ مشورے اس طرح ہیں، مثلاً:

ریڈیو کے نظام کے لیے انتظامیہ کمیٹی کا قیام کیا جائے جس میں کمیونٹی کے لوگوں کی شمولیت ضروری ہے اور دھیان رکھا جائے کہ ریڈیو کے پروگراموں میں کمیونٹی کے لوگوں کی شرکت بھی ضروری ہو۔

ریڈیو کے پروگرام میں کمیونٹی کی ضرورتوں، ان سے متعلق مسئلوں اور ان سے وابستہ صحت، تعلیم، زراعت، ماحولیات، سماجی ترقی اور کمیونٹی سے جڑے کلچرل موضوعات کی شمولیت ہو۔

پروگراموں میں قریب پچاس فیصد مقامی لوگوں کی بھی شمولیت ہو۔ پروگرام مقامی زبان اور ڈائیلیکٹ میں بھی براڈ کاسٹ ہوں تاکہ مقامی لوگوں کو وہ اپنا سا ریڈیو لگے۔

اسی لیے اپنے ریڈیو کے نام کے ساتھ کمیونٹی ریڈیو یا سامودائک ریڈیو یا مقامی زبان میں اس کے متبادل لفظ کا استعمال ضرور کرنا ہوگا۔

ابھی کمیونٹی ریڈیو کو سیاسی خبروں کی نشریات کی اجازت نہیں ہے لیکن مقامی مسائل پر بحث و مباحثے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

کمیونٹی ریڈیو کا مقصد Commercial نہیں ہے پھر بھی کمیونٹی ریڈیو کے خرچ کے لیے اب بھارت سرکار کی جانب سے تشہیر Advertisement کی بھی اجازت دے رہی ہے۔ کمیونٹی ریڈیو پر اشتہارات DAVP کے Tariff کے مطابق لیے جاسکتے ہیں۔

ساتھ ہی سبھی سینٹرل اور اسٹیٹ گورنمنٹ کے اداروں سے بھی کمیونٹی ریڈیو پر اشتہار اور جنگلز Jingles لے سکتے ہیں۔

ہندوستان کے مختلف صوبوں میں 'کمیونٹی ریڈیو' شروع ہوتے ہی یہ ریڈیو 4 گھنٹہ سے لے کر 16 گھنٹہ تک اپنے پروگرام نشر کر رہے ہیں، مثلاً:

آندھرا پردیش میں:

Venkateshwar Oriental College Tirupathi
Shri - Vishnu Engineering College
for Women Bhimvaran
Deccan Society Hyderabad

بہار میں:

Indian Insitute of Business Management, Patna

چنڈی گڑھ میں: وویک ہائی اسکول، چنڈی گڑھ

دہلی میں:

AJK Mass Communication Jamia Millia Islamia
IIMC, JIMS Rohini
JIMS Vasant Kunj, Delhi University

گجرات میں:

سردار پٹیل یونیورسٹی، ولبھ، دریانگر،
مُدرا انسٹی ٹیوٹ آف کمیونیکیشن، احمد آباد

ہریانہ میں: MR Edu. Trust Faridabad

اس کے علاوہ گڑگاؤں کا کمیونٹی ریڈیو

کرناٹک میں:

یونیورسٹی آف ایگریکلچرل سائنسیز دھارواڑ

بنگلورو میں:

سری بھگوان مہاویر جین کالج
مہاشری اکادمی فار بلائنڈ

St. Aloybais Bollege Mangalore
Manipal Academy of Higher Educations
Manipal

کیرالا میں:

D.S School of Management &
Technology, Kollayam

مدھیہ پردیش میں:

The Society for Dev Alternatives
RK DF Institute of Sciences &
Technology, Bhopal

مہاراشٹر میں:

1. Vidya Pratisthan Insitute of Info Technology, Pune 2. Pune University
3. Film & Television Institute Pune
4. Maha Vikas Samajic Sansthan, Satawa, NGO

پانڈیچیری میں:

Sri Manakula Vidyanagar, Engineering, Pandichery

پنجاب کے لدھیانہ میں:

Guru Nanak Girls College

راجستھان و نستھلی میں: ونستھلی ودیا پیٹھ بھنسالی

India International Institute of Management Jaipur, Eminent TT Girls College, Malpura, Distt Tonk

تمل ناڈو میں: انا یونیورسٹی اور قریب 10 سے زیادہ ریڈیو

اترپردیش میں:

Indian Institute of Management. Noida City Montessori School.

اور کچھ دیگر ریڈیوز

ویسٹ بنگال میں:

جادو پور یونیورسٹی، کولکاتا کے علاوہ ہماچل پردیش اور دیگر صوبوں میں بھی کمیونٹی ریڈیوز کامیابی کے ساتھ چلائے جا رہے ہیں۔

اردو زبان میں کمیونٹی ریڈیو اسٹیشن ابھی بہت کم ہیں لیکن اس زبان کے لیے ذہنوں میں آنے والی بیداری کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اردو نواز طبقہ اب اس جانب بھی توجہ دے گا۔

■

Dr. Hisamuddin Farooqui U-201, Jamuna Block, C Crinar Firlune City, Bhopal
Mob.:09868551473

نئے زمانے کا ریڈیو
ایف ایم ریڈیو

تنزیل اطہر

یہ بی بی سی لندن ہے.... اب آپ نعیمہ احمد مہجور سے خبریں سنیے.... یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ خبریں لے کر حاضر ہوں میں تمیز الدین احمد... آداب بہنو اور بھائیو... میں۔ آپ کا دوست امین سیانی... بنا کا گیت مالا لے کر ایک بار پھر آ چکا ہوں.... آپ سوچ رہے ہوں گے کہ دہائیوں پرانی یہ لائنیں ہم آپ کو کیوں سنا رہے ہیں۔ دراصل ایک زمانے میں ریڈیو پر سنی جانے والی یہ کچھ ایسی سدا بہار آوازیں تھیں، جنھیں سنتے ہی سامعین کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ لیکن 1990 کی دہائی میں چھوٹے شہروں سے لے کر گاؤں قصبوں میں ٹیلی ویژن کی آمد سے ریڈیو کی مقبولیت میں تھوڑی کمی آئی۔ ایسا سمجھا جا رہا تھا کہ ٹیلی ویژن کے منظر عام پر آنے سے ریڈیو کی چمک آہستہ آہستہ ماند پڑ جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ موجودہ دور میں ایف ایم ریڈیو نے عوام کے بیچ ریڈیو کا جادو جگائے رکھا ہے۔ آج کا ریڈیو حکومت کا ترجمان نہیں بلکہ عوام کی تفریح اور معلومات کا ذریعہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ بچوں سے لے کر بوڑھے تک اس کے دیوانے ہیں۔ آج بڑے شہروں میں ایف ایم رینبو، ریڈیو مرچی، ریڈیو سٹی، ریڈ ایف ایم، بگ ایف ایم جیسے چینلوں کی دھوم ہے۔ فی الحال 86 شہروں میں نجی ایف ایم ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مرحلے کی اسپیکٹرم نیلامی کے بعد ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے تمام شہروں میں نجی ایف ایم ریڈیو کی خدمات ہوں گی۔

ایف ایم ریڈیو کیا ہے؟

ایک زمانے تک ریڈیو Short Wave اور Medium Wave کی فریکوینسی پر ہی پیغامات نشر اور موصول کرتا تھا۔ 1933 میں Edvin Armstrong نامی امریکی انجینئر نے ایک نئے قسم کی ریڈیو لہروں FM(Frequency Modulation) کا کامیاب تجربہ کیا۔ FM نام سے مشہور یہ لہریں AM یعنی (Amplitude Modulation) کے برعکس کمزور تھیں۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ آواز کی اونچی اور نیچی لہروں کو بغیر کسی دشواری کے نشر کر سکتا تھا۔ ابتدائی دور میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی گئی کیونکہ اس کی لہریں AM کے مقابلے میں کمزور اور محدود تھیں۔ لیکن بہترین Sound Quality کی وجہ سے مقامی ریڈیو کے لیے یہ کافی موزوں تھا۔ اب مخصوص علاقوں پر منحصر نشریات شروع ہوئیں اور علاقائی خبریں نشر ہونے لگیں۔ دنیا کا پہلا FM براڈ کاسٹنگ اسٹیشن امریکہ میں وجود میں آیا۔

ہندستان میں ایف ایم ریڈیو کی شروعات تجربے کے طور پر 1977 میں چینئی سے ہوئی۔ لیکن 90 کی دہائیوں میں نئی اقتصادی پالیسی نافذ ہونے کے بعد ہی نجی ایف ایم چینلوں کا آغاز ہوا۔ 1995 میں سپریم کورٹ کے ایک فیصلے نے ریڈیو ترنگوں پر سے سرکار کی اجارہ داری کو ختم کر دیا۔ سنہ 2000 میں حکومت نے ملک کے بڑے شہروں کے لیے ریڈیو اسپیکٹرم کی نیلامی کی شروعات کی۔ 2001 میں ملک کا پہلا نجی ایف ایم ریڈیو سٹی بنگلور میں وجود میں آیا۔ اس کے بعد ملک بھر میں ایف ایم ریڈیو چینلوں کے کھلنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ موبائل فون سے ایف ایم ریڈیو جڑنے کے بعد تو ملک بھر میں اس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔

ریڈیو ایف ایم نے، ریڈیو کلچر کو بدل دیا ہے۔ پہلے ریڈیو پر مخصوص وقت تک ہی پروگرام پیش کیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ایف ایم ریڈیو 24 گھنٹے پروگرام پیش کرتا ہے۔ اناؤنسر کی جگہ یہاں Radio Jockey نے لے لی ہے۔ شہر میں بجلی پانی سے لے کر ٹریفک کا حال تک یہ سبھی چیز اپنے سامعین کو بتاتے ہیں۔ بازار میں سیل، اسکول کالج میں داخلہ، مقامی ایشو اٹھانے کے ساتھ ساتھ ہر طرح کے فلمی گانے، سنیما کی باتیں، بالی ووڈ کی چٹپٹی خبریں، فیشن، کھیل غرض ہر عمر کے سامعین کے لیے یہاں کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔

ایف ایم ریڈیو اور اردو

آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کے علاوہ ملک میں سرکاری اور نجی ایف ایم چینلوں میں بھی اردو کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ایف ایم ریڈیو نے ایک ایسی زبان کی بنیاد ڈالی جو عوامی ہے۔ جسے ہم ہندستانی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں اردو الفاظ، محاورے اور اشعار کا جابہ جا استعمال ہوتا ہے۔ یہ بات بلا جھجک کہی جاسکتی ہے کہ ایف ایم ریڈیو کے ذریعے اردو کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ خواہ وہ پروگراموں میں اردو کا کثرت سے استعمال ہو، اردو زبان وادب پر مبنی پروگرام ہوں یا پھر غزلوں اور قوالیوں کے پروگرام۔

ایف ایم ریڈیو پر کچھ ایسے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن میں اردو زبان وادب کی چاشنی ملتی ہے۔ ایف ایم گولڈ اور ایف ایم ریئنبو میں اس قسم کے جو پروگرام پیش کیے جارہے ہیں۔ ان کی نوعیت کچھ یوں ہے۔

شعر ونغمہ: یہ پروگرام ایف ایم ریئنبو پر یکم جولائی 2001 کو شروع ہوا اور ہفتے کے روز نشر ہوتا ہے۔ اس کا مقصد سامعین کو اردو شاعری اور ہندی کویتا سے متعارف کرانا ہے۔ اس پروگرام نے سامعین کے اندر زبان کا شعور پیدا کیا۔

انداز بیاں: یہ ایف ایم گولڈ کا کافی مقبول پروگرام ہے۔ اس میں غزل، گیت اور کلاسیکل نغمے پیش کیے جاتے تھے۔ ان کی زبان وپیش کش کا انداز بڑا نرالا ہے۔

گیت چاندی: ایف ایم گولڈ پر یہ پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کسی ایک نغمہ نگار یا شاعر کے حالات زندگی اور ان کے کلام کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ اس پروگرام میں مذکورہ نغمہ نگار کے لکھے گیت بھی سنائے جاتے ہیں۔

اسی طرح IGNOU کا ایف ایم ریڈیو چینل 'گیان وانی' بھی اردو میں کئی پروگرام پیش کرتا ہے۔ گیان وانی پر دبستان اردو کے نام سے ادبی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ دراصل یہ مختلف کلاسیز کے اردو کورس ہوتے ہیں جو ریڈیو پر طالب علموں کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو جامعہ سے بھی اردو کے کئی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

یہ تو بات ہوئی سرکاری ایف ایم چینلوں کی... اردو کو مقبول بنانے میں نجی ایف ایم چینلس بھی اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ ایف ایم چینلوں میں پاپولر اردو شعر و شاعری، اردو محاورے اور کہاوتوں کا خوب استعمال ہو رہا ہے۔ ریڈیو سٹی کا مشہور پروگرام 'ہیر شیر' تو سبھی کو یاد ہے۔ یہ نجی ایف ایم کی تاریخ میں سب سے لمبا چلنے والا Filler Programme ہے۔ اس پروگرام کے ہلکے پھلکے اشعار اور اس کے بعد ریڈیو جاکی کے تاثرات (مثلاً۔ ارشاد، مار ہی ڈالو گے...) لوگوں کو گدگدانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ پیش ہے ریڈیو سٹی کے پروگرام ہیر شیر کے یہ گدگداتے اشعار:

کتنا بے بس ہے انسان قسمت کے آگے
ہر سپنا ٹوٹ جاتا ہے حقیقت کے آگے
جس نے کبھی دنیا میں ہاتھ نہ پھیلایا ہو
وہ بھی ہاتھ پھیلاتا ہے گول گپے کے آگے

اس طرح کے سیکڑوں اشعار اور پیروڈی ریڈیو سٹی پر پیش کیے جاچکے ہیں۔ ریڈیو سٹی پر ایک اور مشہور اردو پروگرام

پیش کیا جاتا ہے۔ ریڈیو سٹی غزل۔ اس میں تمام مشہور غزل گو شعرا کے کلام پیش کیے جاتے ہیں۔

ریڈ ایف ایم کے مشہور جاکی ہیں رونق... وہ اپنی شعر و شاعری اور پیروڈی سے لوگوں کو خوب محظوظ کرتے ہیں۔ رونق کے Filler کی خاص بات یہ ہے کہ وہ حالات حاضرہ پر پیروڈی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ جیسے۔ کمار وشواس یا کوئی شاعر اپنا قطعہ سنا رہا ہو۔ دلچسپ ہے کہ اس ایک فلر میں وہ سارے حالات شامل ہو جاتے ہیں جو پرائم ٹائم کی خبروں کی ہیڈ لائن ہوتی ہے۔

ریڈیو جاکی جس طرح اپنے اشعار اور پیروڈی سے لوگوں کو ہنساتے اور گدگداتے ہیں، اسے اگر طنز و مزاح کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔

ریڈیو مرچی پر آر جے صائمہ پیش کرتی ہیں۔ پرانی جینس "اردو کی پاٹھ شالا"۔ اس پروگرام میں صائمہ نے اپنی آواز و انداز سے لوگوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ پرانی جینس میں صائمہ ہر روز سامعین کو ایک اردو کا لفظ و معنی بتاتی ہیں۔ اردو زبان کو عام کرنے میں یہ شو اہم رول ادا کر رہا ہے۔ ریڈیو مرچی کے مشہور ریڈیو جاکی نوید بتاتے ہیں کہ اردو زبان کے بغیر تو آر جے کا کام ہی نہیں چلتا۔ ان کے مطابق اردو شعر و شاعری ایف ایم ریڈیو پر سب سے زیادہ QUOTE کیے جاتے ہیں۔

بگ ایف ایم پر غزلوں کا مقبول شو چلتا ہے۔ "سہانا سفر"۔ اس پروگرام کو پیش کرتے ہیں اداکار انو کپور۔ اس شو میں کسی شاعر اور گلوکار کے مختصر حالات زندگی اور ان کے کلام کو بہترین انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

الغرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج بیشتر ایف ایم ریڈیو چینلس اردو غزلوں، گیتوں کا پروگرام پیش کرتے ہیں۔ جس میں میر و غالب سے لے کر بشیر بدر تک کی غزلیں ہوتی ہیں۔ فلمی گانے، گیت، غزل، قوالی کی وجہ سے ریڈیو آج بھی عوام میں مقبول ہے۔ ریڈیو نے نہ صرف اردو زبان وادب کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا بلکہ بہت سے لوگوں کی ریڈیو سن کر اردو سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اردو کو عام فہم اور بول چال کی زبان بنانے میں ریڈیو اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

ایف ایم ریڈیو کے اس دور میں ورلڈ وائڈ ویب (www) پر انٹرنیٹ ریڈیو نے بھی دستک دے دی ہے۔ یہ ایک ایسا ریڈیو ہے جسے انٹرنیٹ کی مدد سے دنیا کے کسی کونے میں سنا جاسکتا ہے۔ یہ ایف ایم ریڈیو کی طرح چھوٹا ہوتا ہے اور کسی بھی کمپیوٹر سے وائرلیس یعنی بنا تار کے جڑ سکتا ہے۔ آج انٹرنیٹ پر کئی ریڈیو اسٹیشن اور مختلف طرح کی موسیقی مہیا کرانے والی ویب سائٹیں موجود ہیں۔ بس آپ انٹرنیٹ سے جڑیے اور دنیا میں کسی بھی ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام کا مزہ لیجیے۔ انٹرنیٹ ریڈیو اردو کے ادبی وثقافتی اور تفریحی پروگرام کو گلوبل بنانے کی قوت رکھتا ہے۔

■

Tanzeel Athar, 269, Sabarmati Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Email.: tanzeeljnu@gmail.com

زین رامش

بہار میں اردو کے ریڈیائی ڈرامے 1980 کے بعد

ہندی کے مشہور ڈراما نگار اور ہندی ڈرامے کے معتبر ناقد ڈاکٹر سدھ ناتھ کمار نے اپنی قابل ذکر کتاب 'ریڈیو ناٹک کی کلا' کے پیشِ لفظ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ٹیلی ویژن کے آنے کے بعد مغرب میں یہ خدشات ظاہر کیے گئے تھے کہ ریڈیو کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ یہ خدشہ غلط ثابت ہوا ہے۔ اب ٹیلی ویژن محدود نہیں ہے اور اب اس کی ترقی ابتدائی مرحلے میں بھی نہیں ہے۔ ساتھ ہی ریڈیو گھر گھر میں موجود بھی نہیں رہ گیا ہے لیکن اس حقیقت سے آج کی تاریخ میں بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریڈیو کی اہمیت برقرار ہے اور برقرار رہے گی۔ لہٰذا ریڈیائی ڈراموں کے امکانات باقی ہیں اور باقی رہیں گے۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا آغاز 1927 میں ہوا اور ابتدا سے ہی ڈراما ریڈیو نشریات کے مشمولات میں شامل رہا، لیکن اس سلسلے میں عشرت رحمانی اپنی کتاب 'اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید' کے صفحہ 219 پر لکھتے ہیں کہ 37-1936 کے قریب برصغیر میں آل انڈیا ریڈیو کے ذریعے نشریات کا آغاز ہوا اور ادبیات کی ہر صنف نثری پروگرام کا لازمہ قرار پائی۔ لہٰذا ڈراما پر جو ادبیات کا اہم جزو اور خصوصاً نثری ادب کا لازمی عنصر ہے اس پر خاص توجہ کی گئی، لیکن ڈاکٹر اخلاق اثر نے اپنی کتاب 'ریڈیو ڈراما کا فن' کے صفحہ 90 پر اس سلسلے میں وضاحت کی ہے کہ:

''ہندوستان میں نشریات کا باقاعدہ آغاز 1927 میں ہو گیا تھا اور ریڈیو ڈرامے بھی نشر ہونے لگے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اردو ریڈیو ڈرامے کی تاریخ نامکمل اور ادھوری ہے اور 1927 سے 1935 کا درمیانی حصہ تاریکی میں ہے۔''

ریڈیو ڈرامے کے تعلق سے اس تمہیدی گفتگو کے درمیان ہی اس بات کی وضاحت بھی شاید ضروری ہے کہ ریڈیو کے لیے خاص طور سے تحریر کیا گیا پہلا انگریزی ڈراما 15 جنوری 1924 کو بی بی سی سے نشر ہوا، گویا باضابطہ طور پر یہیں سے ریڈیائی ڈراموں کی روایت شروع ہوتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور کے مطابق:

''دنیا ریڈیو سے روشناس ہوئی، سائنس کے اس نئے کرشمے کے ساتھ کہ ڈرامے نے ایک نئی صنف کو جنم دیا ہے جسے اصطلاح عام میں ریڈیو ڈراما کہتے ہیں۔''

(اردو تنقید کے مسائل، 'شب خون' مارچ 1964 از آل احمد سرور)

ڈاکٹر حسن مثنیٰ اپنی کتاب 'ریڈیو نشریات آغاز و ارتقا' میں بڑی مدلل گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''یوں تو ڈرامے کی تاریخ تقریباً تین ہزار سال پرانی ہے لیکن ریڈیائی ڈراموں نے ابھی اپنے تخلیقی سفر کی ایک صدی بھی مکمل نہیں کی ہے۔ پھر بھی ناقدین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ اس قلیل مدت میں ریڈیو ڈرامے نے عصری میلانات اور فنکارانہ مہارت کے اعلیٰ معیار کو پیش کرنے کی عمدہ سعی کی ہے۔'' (ص 200)

موصوف اسی سلسلے میں یہ اطلاع بھی فراہم کرتے ہیں کہ اس میدان میں سید ذوالفقار علی بخاری پیش پیش رہے ہیں اور انھیں کی کوششوں سے اردو میں ریڈیائی ڈرامے کو وقار و اعتبار بھی حاصل ہوا ہے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر ہی انھیں ریڈیائی ڈرامے کا بابائے آدم قرار دیا جاتا ہے۔ بلا شبہ اردو کے حوالے سے اگر گفتگو کی جائے تو ریڈیائی ڈراموں کو واضح شکل عطا کرنے اور اس کے خد و خال کے تعین کے سلسلے میں ان کی خدمات کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ سید ذوالفقار علی بخاری نے مارٹن ایسلن کی اس فکر کو عملاً برتنے کی کوشش کی کہ فنکار کے لیے ریڈیو اظہار کا معقول ترین ذریعہ ہے اور اس میں تحریر کا معیار ہی سب سے اہم ہے۔ ریڈیو ڈراما نگار امید نہیں کر سکتا کہ کیمرہ کے دل کو موہ لینے والے کام اور انتہائی نمائش والے اسٹیج کے اثرات اس کی فنی کمزوریوں کو دور کر دیں گے۔ سید ذوالفقار علی بخاری کے ساتھ ساتھ اردو کے جن اہم ترین ڈراما نگاروں نے اس سلسلے میں بہت اہم کردار ادا کیا ان میں سید امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد، مرزا عظیم بیگ چغتائی، شاہد احمد دہلوی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، سید انصار علی ناصری، فضل حق قریشی، مرزا ادیب، اپندر ناتھ اشک اور خواجہ احمد عباس وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ ایسے اہم ترین فکشن رائٹرز کا نام لینا بھی ضروری محسوس ہوتا ہے جنھوں نے ریڈیائی ڈراموں کے تعلق سے بھی اہم خدمات انجام دیں اور ان کی خاصیت یہ رہی کہ انھوں نے اپنی ڈراما نگاری

کی ابتدا ہی دراصل نثری ڈراموں سے کی۔ ان میں رفیع پیرزادہ، شوکت تھانوی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، ملک حسیب احمد، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، محمود نظامی، سلطان ایف حسین، میاں لطیف الرحمٰن، یوسف ظفر، مختار صدیقی اور علامہ اقبال کے فرزند جاوید اقبال کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

اس بات کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں کہ اردو کی ادبی خدمات کے تعلق سے اس کی اہمیت و معنویت مسلم ہے۔ خصوصاً فکشن کے سلسلے میں غیر منقسم بہار (جھارکھنڈ سمیت) نے اہم ترین اور نمایاں ترین خدمات انجام دی ہیں۔ تحقیقی مطالعہ اس بات کا بھی احساس دلاتا ہے کہ ڈراما نگاری اور خاص طور سے ریڈیو ڈراما کے سلسلے میں بھی بہار کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ بہار کا پہلا اردو ڈراما پنڈت کیشو راج بھٹ کا تحریر کردہ 'سجّاد وسنبل' قرار پاتا ہے جو 1874 میں تحریر ہوا۔ لیکن مجھے چونکہ بہار میں اردو ڈرامے کی روایت پر نہیں بلکہ 1980 کے بعد بہار میں اردو کے ریڈیائی ڈراموں کا جائزہ لینا ہے، لہٰذا میں اس سلسلے کی اپنی گفتگو کا آغاز سہیل عظیم آبادی سے کرنا چاہوں گا۔ باوجود یہ کہ 29 نومبر 1979 کو دوران سفر الہ آباد ریلوے پلیٹ فارم پر دل کا دورہ پڑنے کے سبب وہ اس دار فانی سے رخصت ہوگئے۔ تاہم حقیقت ہے کہ یہ سہیل عظیم آبادی کی ہی شخصیت تھی جس نے بہار کی سطح پر ریڈیائی ڈراموں کی تاریخ میں انقلاب پیدا کر دیا۔ 1955 میں وہ آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت میں آئے اور ڈراما نگاری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ظاہر ہے ایسے میں ان کی توجہ کا مرکز ریڈیائی ڈرامے ہی تھے۔ 1950 سے لے کر 1970 یعنی ملازمت سے اپنی سبکدوشی تک، پندرہ سالوں کی مدت میں اردو ڈراما نگاری کے فروغ اور خصوصی نشر و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ایک تحقیق کے مطابق ان کے 17 مکمل ڈراموں میں بیشتر ریڈیائی ڈرامے تھے۔ اس سلسلے کی سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بہار میں اردو ڈرامے کی تاریخ سہیل عظیم آبادی کی مرہون منت ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پٹنہ ریڈیو اسٹیشن سے اردو نشریات کا آغاز بھی نہ صرف یہ کہ ان کے وقت میں ہوا بلکہ یہ ان کی توجہ اور محنت کا ہی ثمرہ تھا۔ 1980 کے بعد بہار میں اردو کے ریڈیائی ڈراموں کا مطالعہ بہت ہی حوصلہ افزا ہے۔ ہندی ریڈیائی ڈراموں کے نامور خالق اور ناقد سدھ ناتھ کمار کو یہ شکوہ بھلے ہی ہو کہ اپنے ملک کی سبھی زبانوں میں ریڈیو ڈرامے بڑی تعداد میں لکھے جا رہے ہیں اور نشر ہو رہے ہیں، لیکن معیار کے نقطۂ نظر سے پر اثر ڈراموں کی تعداد نہیں کے برابر ہے۔ لیکن بہت اطمینان کے ساتھ اور یقینی طور پر بلاخوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ 1980 کے بعد بہار میں اردو کے ریڈیائی ڈراموں پر ان باتوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ لندن سے شائع ہونے والے 'ریڈیو ڈراما ٹوڈے' میں ایک جگہ لکھا گیا ہے کہ 'چونکہ ریڈیو ڈراما الفاظ اور انفرادی تحریر پر ہی منحصر ہوتا ہے لہٰذا اسے سہل اور قابل حظ ہونا چاہیے۔' اور سچی بات یہ ہے کہ 1980 کے بعد بہار میں تحریر کیے جانے والے اردو ریڈیائی ڈراموں میں یہ خاصیت بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں میں سب سے پہلے شین مظفر پوری کا نام لینا چاہوں گا۔ بحیثیت فکشن رائٹر کم از کم بہار کی سطح پر شین مظفر پوری کا نام محتاج تعارف نہیں ہے۔ شین صاحب بہار کے ان لوگوں میں شامل ہیں جنھوں نے ناول، افسانے،

> **تحقیقی مطالعہ اس بات کا بھی احساس دلاتا ہے کہ ڈراما نگاری اور خاص طور سے ریڈیو ڈراما کے سلسلے میں بھی بہار کی خدمات ناقابل فراموش رہی ہیں۔ بہار کا پہلا اردو ڈراما پنڈت کیشو راج بھٹ کا تحریر کردہ 'سجّاد وسنبل' قرار پاتا ہے جو 1874 میں تحریر ہوا۔ لیکن مجھے چونکہ بہار میں اردو ڈرامے کی روایت پر نہیں بلکہ 1980 کے بعد بہار میں اردو کے ریڈیائی ڈراموں کا جائزہ لینا ہے، لہٰذا میں اس سلسلے کی اپنی گفتگو کا آغاز سہیل عظیم آبادی سے کرنا چاہوں گا۔**

انشائیے اور خاکے وغیرہ کے ساتھ ہی ساتھ بڑی تعداد میں ڈرامے لکھے۔ میرے اس خیال سے اختلاف ممکن ہے لیکن میرا ذاتی خیال ہے کہ شین صاحب کو سب سے زیادہ جس چیز نے شہرت و مقبولیت عطا کی وہ ان کے ریڈیائی ڈرامے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کے مشہور زمانہ ریڈیائی ڈراما 'خون کی مہندی' کا ذکر ہی کافی ہے، جس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بحیثیت مجموعی بہار کے مقبول ترین ریڈیائی ڈراموں میں شمار کیا جاتا رہا ہے۔ 'خون کی مہندی' کا وصف یہ ہے کہ وہ ریڈیائی ڈراما ہونے کے باوجود نہ صرف موضوع اور اسلوب کی سطح پر انفرادیت کا حامل ہے بلکہ ڈرامائی عناصر اور اثر انگیزی کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اسی نام سے شین صاحب کے ڈراموں کا مجموعہ بھی شائع ہوا جس میں چھ مزید ڈرامے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بھی انھوں نے بہت سارے ڈرامے مثلاً 'بے چارہ'، 'اچھا آدمی'، 'عورت تیرے کتنے روپ'، 'قصہ میاں بیوی کا' لکھے جن میں بیشتر ڈرامے ریڈیائی ہیں۔

'بہار میں اردو ڈراما آزادی کے بعد' کے مصنف ڈاکٹر محمد منصور انصاری کا خیال ہے کہ اردو کے ریڈیائی ڈرامے چونکہ صرف بہار کے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں مثلاً پٹنہ، رانچی، دربھنگہ اور بھاگلپور سے تواتر کے ساتھ نشر ہو رہے ہیں، جس کے سبب قلم کاروں کو ڈراموں کی طرف متوجہ ہونے کی تحریک ملتی رہی اور بہار کے تقریباً ہر علاقے میں اردو ڈراما نگار پیدا ہوئے۔ یہ معاملہ ظاہر ہے غیر منقسم بہار کا رہا ہے جس میں موجودہ ریاست جھارکھنڈ بھی شامل ہے۔

شین مظفر پوری کے بعد زیر بحث موضوع کے اعتبار سے ایک اہم نام شفیع مشہدی کا ہے۔ افسانوں کے علاوہ ڈراما ان کی خصوصی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ ڈرامے کی شکل میں ان کی جو تحریریں موجود ہیں وہ اپنے انفرادی طرز اظہار کی بنیاد پر دامن ذہن و دل کھینچتی ہیں۔ یوں بھی اسلوبیاتی سطح پر شفیع مشہدی کو صاحب طرز نثر نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ شفیع مشہدی کے ڈراموں کا مجموعہ 'دو پہر کے بعد' 1982 میں شائع ہوا جس میں کل چھ (6) ڈرامے شامل ہیں: (1) اجنبی دیواریں (2) کینسر (3) دو پہر کے بعد (4) انگلیاں فگار اپنی (5) پتھروں کا شہر اور (6) مٹھی بھر خاک۔ یہ سبھی ڈرامے ریڈیائی ہیں اور ان میں سے بیشتر نشر ہو چکے ہیں۔ مذکورہ بالا ڈراموں کا وصف خاص ان کا موضوع ہے۔ شفیع مشہدی نے افراد کی انفرادی زندگی کے گوناگوں مسائل کو اپنا موضوع بنایا ہے اور ان پیچیدگیوں کا فلسفیانہ اظہار ہمارے سامنے کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر قمر جہاں بحیثیت افسانہ نگار اور بحیثیت ناقد کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ خصوصاً افسانوں کے تعلق سے موضوع کا تنوع اور اسلوب کی انفرادیت جس طرح ان کے حصے میں آئی ہے وہ کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوئی۔ محترمہ نے ریڈیائی ڈراموں میں بھی اپنی تخلیقی ہنر مندی کا مظاہرہ کیا ہے اور کئی ڈرامے تحریر کیے ہیں اس کا اندازہ ادب کے قارئین کو شاید مکمل طور پر نہ ہو۔ ان کے کم از کم دو ڈرامے 'بکھری سچائیاں' اور 'دوری کا بھرم' آل انڈیا ریڈیو بھاگلپور سے نشر ہوئے۔ پہلا ڈراما انسانی

زندگی کی تلخ حقیقتوں اور اس کے ناقابلِ قبول نتائج کو پرت در پرت ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جبکہ دوسرا ڈراما 'دوری کا بھرم' مزاح کی کیفیت سے مملو ہے۔ اپنے ان دونوں ہی ڈراموں میں قمر جہاں نے تخلیقی ہنرمندی کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔

نوید ہاشمی 1980 کے بعد سامنے آنے والے بہار کے ان ڈراما نگاروں میں ہیں جنھوں نے باضابطہ طور پر ڈرامے کو اپنے لیے مخصوص کیا اور اُسی کے ہو لیے۔ ان کے ڈراموں کا مجموعہ 'چاند کا داغ' 1991 میں شائع ہوا جس میں کل چھ ڈرامے شامل ہیں، اس مجموعے کا پہلا ڈراما 'کلاکار' ہے۔ 'کلاکار' ہی نوید ہاشمی کا پہلا تحریر کردہ ڈراما بھی ہے جو نومبر 1987 تا جنوری 1988 کے 'مرّیخ' میں شائع ہوا جس کے بعد سے رسالوں میں ان کے ڈراموں کی اشاعت اور ریڈیو سے نشریے کا سلسلہ قائم رہا۔ ریڈیو پٹنہ سے نشر ہونے والے مشہور ڈراموں میں 'چاند کا داغ' کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے ان کے جو ڈرامے نشر اور مقبول ہوئے ان میں 'مٹی پکارتی ہے'، 'سازش' اور 'مجبور فرشتے' قابلِ ذکر ہیں۔

رحمٰن شاہی نے بحیثیت افسانہ نگار تو اپنی شناخت قائم کی ہی، بحیثیت ڈراما نگار بھی انھیں خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خاص طور پر ان کے ریڈیائی ڈراموں میں 'کیکٹس کے پھول' کو زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔ رحمٰن شاہی نے اپنے جن ریڈیائی ڈراموں کی بنیاد پر بحیثیت ریڈیائی ڈراما نگار اپنی انفرادی شناخت قائم کی ان میں 'سوندھی مٹی'، 'سویرا'، 'وچن' اور 'کیکٹس کے پھول' شامل ہیں۔

ریڈیو سے رخسانہ صدیقی کی وابستگی باضابطہ اور باقاعدہ رہی ہے۔ بحیثیت ڈراما نگار اور خصوصاً بحیثیت ریڈیو ڈراما نگار رخسانہ صدیقی نے بہار کی خواتین ڈراما نگاروں کی بہترین اور قابلِ لحاظ نمایندگی کی ہے۔ اب تک ان کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ ڈرامے شائع اور نشر ہو چکے ہیں، جن میں 'واپسی'، 'دوسری خوشبو'، 'جنگل کی آخری رات'، 'شیرا'، 'اپنے حصے کا درد' اور 'چار دن' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ مذکورہ ڈراموں میں بیشتر ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ رخسانہ صدیقی کا ریڈیائی ڈراما 'اپنے حصے کا درد' بہت پر اثر بھی ہے اور اس میں فنی چابکدستی بھی موجود ہے۔ یوں تو عام طور پر رخسانہ کے ڈراموں میں انسان کی عمومی زندگی کے نشیب و فراز کا بہترین عکس دیکھنے کو ملتا ہے، مگر کبھی جب وہ فرد کی ذات کے نادیدہ المیوں کی پیکر تراشی کرتی ہیں تو ان کی تحریر دو آتشہ ہو جاتی ہے اور یہی کیفیت ان کے ڈرامے 'اپنے حصے کا درد' میں موجود ہے۔ رخسانہ شعورِ فن کی اس بالیدگی سے بھی متصف ہیں کہ اپنے بالکل ذاتی کرب کو کس طرح دوسروں کا کرب بنا دیا جائے۔

اشرف قادری کی شخصیت صاحبِ دیوان شاعر اور متعدد کتابوں کے مصنف کی رہی ہے۔ 'چمپارن میں جنگِ آزادی' کے عنوان سے 19 ایکٹ پر مشتمل تاریخی حقائق پر مبنی ان کا طویل ڈراما ناقابلِ فراموش ہے اسے ہم ان کا ایک بڑا کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ اس پورے ڈرامے کو ریڈیائی ڈرامے کی حیثیت حاصل ہے جس کے کچھ حصے باضابطہ طور پر پٹنہ ریڈیو اسٹیشن نے اہتمام کے ساتھ نشر کیے اور یہ کافی مقبول بھی ہوا۔ 12 نومبر 1998 کو اشرف قادری اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اگر ان کی حیات نے کچھ اور وفا کی ہوتی تو بلا مبالغہ ان کی کچھ مزید تحریریں ریڈیائی ڈرامے کی شکل میں سامنے آتیں۔ ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، علمی اور ادبی سطح پر فعال ہیں اور ان کا مرکزی میدان تحقیق اور تصوف ہے لیکن چونکہ ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ کا صدر شعبۂ اردو ہونے سے قبل آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے ان کی طویل وابستگی رہی لہٰذا انھوں نے ڈراما نگاری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کیا اور کئی ڈرامے تحریر کیے جن کی نوعیت ریڈیائی ہے۔ ان ڈراموں میں 'اکبرِ اعظم'، 'سلطان شیر شاہ سوری' اور 'عظیم آباد کا یادگار مشاعرہ' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ سبھی ڈرامے خاص طور سے ریڈیو کے لیے ہی تحریر کیے گئے تھے، لہٰذا نشر ہوئے اور کافی مقبولیت حاصل کی۔ سید شاہ حسین احمد کے علاوہ ابوالکلام عزیزی کا ریڈیائی ڈراما 'طوفان' اور سلطان آزاد کا ڈراما 'قصہ ایک شاعر کا' بھی قابلِ ذکر ہے۔

طنز و مزاح اور ظرافت نگاری کے تعلق سے بہار کے جن ڈراما نگاروں نے بحیثیت ریڈیو ڈراما نگار بھی شہرت و مقبولیت حاصل کی ان میں تمنا مظفر پوری، نعمان ہاشمی اور ایم اے کریمی کا نام خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ تمنا مظفر پوری کے ڈراموں میں 'قصہ کراسن تیل کا' اور 'بیگم کا گھریلو بجٹ' اپنے موضوع کے اعتبار سے خصوصی توجہ کے طالب ہیں۔ تمنا مظفر پوری کے ڈراموں کا مجموعہ 'پردے کے سامنے' 1989 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس میں نو ڈرامے شامل ہیں جن میں سے بیشتر ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ نعمان ہاشمی نے ریڈیائی ڈراموں میں خاصی دلچسپی دکھائی ہے۔ نعمان ہاشمی کا پہلا ریڈیائی مزاحیہ ڈراما 1984 میں نشر ہوا اور تب سے تواتر کے ساتھ بڑی تعداد میں ان کے ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے۔ ان کے قابلِ ذکر ڈراموں میں 'چکر ڈاکٹر کا' اور 'چکر گیس کا' وغیرہ شامل ہیں۔

ایم اے کریمی نے اپنی ادبی زندگی افسانہ نگاری سے شروع کی، لیکن بہت جلد اسے وسعت دے کر اپنے آپ کو انشائیہ نگاری اور ڈراما نگاری کے لیے وقف کر دیا۔ انھوں نے زیادہ تر ڈرامے ریڈیائی تحریر کیے جو نشر ہو کر مقبول ہوئے۔ ان ڈراموں میں 'دوری کا چکر' اور 'ٹکے کیلو شاعر' کافی مقبول ہوا۔

اگر ریڈیائی ڈراموں کی تخصیص ہٹا دی جائے اور صرف 1980 کے بعد بہار میں اردو ڈراما نگاری پر گفتگو کی جائے تو بہت سارے اہم ناموں کا تذکرہ لازمی اور ضروری ہو جائے گا، مثلاً طارق جمیلی، عظیم اقبال، اکبر رضا جمشید، نسیم اختر پالوی، ظفر عدیم، مناظر عاشق ہرگانوی، اسد رضوی، نثار احمد صدیقی اور فخر الدین عارفی وغیرہ۔ یہ تمام حضرات بحیثیت ڈراما نگار تو اہمیت کے حامل ہیں لیکن جنھوں نے ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے۔ اس سلسلے میں ایک اہم نام ڈاکٹر قمر التوحید کا ضرور ہے جن کا صرف ایک ڈراما میری نظر میں ہے جو 'گوداوری کی گود میں' کے عنوان سے آل انڈیا ریڈیو، پٹنہ (بہار) سے بہت ہی اہتمام کے ساتھ نشر ہوا اور بہت ہی مقبول ہوا۔

راقم السطور نے آل انڈیا ریڈیو پٹنہ سے اپنی سات آٹھ سالہ وابستگی کے دوران 'لہو کا رنگ ایک ہے' اور 'آزاد ہیں ہم' جیسے مقبول ترین فیچر کے علاوہ ریڈیائی ڈرامے تحریر کیے جن میں 'رات کے آخری پہر' اور 'کرفیو' کو توقع سے زیادہ مقبولیت اور پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہ دونوں ڈرامے اردو سیکشن اور ڈراما سیکشن سے بار بار نشر ہوئے۔ '1980 کے بعد بہار میں اردو کا ریڈیائی ڈراما' کے موضوع پر یہ گفتگو بس اشاریے کی حیثیت رکھتی ہے جس میں تحقیقی اور تنقیدی پہلوؤں کی تلاش کی گنجائش فی الوقت نہیں ہے۔

کتابیات

1. 'ریڈیو ناٹک کی کلا'۔ ڈاکٹر سدھ ناتھ کمار
2. 'اردو ڈرامے کی تاریخ و تنقید'، عشرت رحمانی
3. 'ریڈیو ڈراما کا فن'، ڈاکٹر اخلاق اثر
4. 'اردو تنقید کے مسائل'، پروفیسر آل احمد سرور
5. 'ریڈیو نشریات آغاز و ارتقا'، ڈاکٹر حسن مثنی
6. 'بہار میں اردو ڈراما آزادی کے بعد'، ڈاکٹر محمد منصور انصاری

■

Dr. Zain Ramish, Associate Professor, Binova Bhave University, Hazaribagh, Distt. Hazaribagh -825301 (Jharkhand)

ریڈیو اور موجودہ سماج

محمد اخلاق

موجودہ دور، عوامی ذرائع ترسیل کے انقلاب کا دور ہے جس کے فروغ میں 20 ویں صدی کا کردار نہایت اہم ہے۔ ریڈیو ذرائع ابلاغ میں سے ایک ہے۔ ریڈیو کی ایجاد کا سہرا مارکونی کے سر جاتا ہے مگر اسے ترقی دینے میں کئی دوسرے سائنس داں بھی شامل ہیں۔ ٹرانزسٹر ریڈیو دراصل مارکونی کے ریڈیو کی ترقی یافتہ شکل ہے جسے ولیم شاکلے نے 1947 میں ایجاد کیا تھا۔ ٹرانزسٹر نے ریڈیو کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔ ہندوستان میں ریڈیائی نشریات کا سلسلہ تو 1923 سے شروع ہوگیا تھا لیکن منظم اور باقاعدہ شروعات 1936 سے ہوئی۔ یہ ایک ایسا میڈیم ہے جس کے ذریعے ہمیں مختلف قسم کی اطلاعات، تفریحات اور معلومات بہم پہنچتی ہیں نیز علوم وفنون، تفریحی مواد، حالات حاضرہ، عوامی مسائل اور دیگر بہت ساری معلومات بھی نہایت سرعت سے موصول ہوئی ہیں۔ خصوصی طور پر ریڈیو نے ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو بہت فروغ دیا۔ ریڈیو کے سامعین کا حلقہ بہت وسیع ہے اور عوام میں اس کی مقبولیت ہی اس کی کامیابی کا سبب ہے کیونکہ ریڈیو ہمارے دلوں پر آواز کے ذریعے حکومت کرتا ہے جس میں نہ پڑھنے کی ضرورت ہوتی ہے نہ دیکھنے کی کوشش کرنی پڑتی ہے اور سب سے اہم

بات تو یہ ہے کہ ریڈیو کے علاوہ تمام ذرائع ابلاغ ہر کس و ناکس کی پہنچ سے باہر ہیں۔ ریڈیو تمام خامیوں سے بالاتر ہے اور سب سے سستا ذریعہ ابلاغ ہے جس کی پہنچ ہر خاص و عام تک ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لایا اور لے جایا جاسکتا ہے اس کی پہنچ ایسی ہے کہ اس کی آواز بند کمروں، بلند و بالا پہاڑوں اور ایسی تمام تر جگہوں جہاں پر انسان کا گزر ممکن نہیں ریڈیو کی لہریں پہنچ جاتی ہیں، ریڈیو نے خواندگی کی خلیج کو پر کیا۔ جو لوگ اخبار و رسائل اور کتابوں کے قاری نہیں بن سکتے تھے وہ ریڈیو کے پروگرام کے ذریعے بہترین معلومات اور تفریح حاصل کرنے لگے۔

ریڈیو خواص کا کلب نہیں بلکہ عوام کا ادارہ ہے جس کا مقصد عوام و خواص سب کے معیارِ زندگی اور ذوق کی آبیاری کرنا ہے۔ ریڈیو ایک جادوئی باکس سے کم نہیں جو آپ کو تفریح کے ساتھ ساتھ معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتا ہے، خواہ وہ ادب ہو، یا معاشرتی یا زندگی کے گوناگوں مسائل سے متعلق ہوں یہی وجہ ہے کہ ریڈیو سننا تفریح کے ساتھ ساتھ ایک ایسا عمل ہے جسے ہم اپنے معمولات زندگی پورا کرنے کے ساتھ ساتھ کرپاتے ہیں۔

ریڈیو ابھی تک ایسا میڈیم ہے جو ایک چینل سے سب سے زیادہ Varitety پروگرام پیش کرتا ہے دور حاضر میں Variety سے بڑھ کر ریڈیو مخصوص پروگرام پیش کرنے لگا ہے۔ گرچہ ضرورتوں کے مطابق نئے نئے چینل وجود میں آئے جو خاص طبقات تک محدود ہیں مگر اس کا فیض عام ہے۔

ایسے طالب علم جو نچلی جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں ان کی تعلیمی زندگی اور ضرورتوں کے پیش نظر چینل وجود میں آئے گیان وانی اس کی ایک مثال ہے جہاں سے اسکول کے طالب علموں کے لیے ریڈیائی قدریں مہیا کی گئی ہیں جس سے وہ حاصل کررہے علوم، حساب، سائنس اور سوشل سائنس کی مشکل سے مشکل پہیلیوں کو چٹکی میں حل کرپاتے ہیں۔ لفظ کی ادائیگی اور زبان کی سمجھ بھی ڈراما یا ناٹک کے ذریعے دی جاتی ہے۔

ایسے طالب علم جو اعلیٰ جماعتوں میں پڑھ رہے ہیں، ان کے اساتذہ اور شہریوں کے لیے آل انڈیا ریڈیو کی 24 گھنٹے کی Service موجود ہے جو برسوں سے خبر، گیت، غزل، ادب، کھیل کود، تاریخ، سماجیات، فلسفہ، سائنس اور دیگر علوم وفنون پر مسلسل پروگرام نشر کرتا ہے۔ ساتھ ہی ادیب، دانشور، سیاست داں، اسکالر اور فنکاروں کے ساتھ ملاقات بھی کراتا ہے۔ بدلتے وقت کے ساتھ ساتھ عوام اور نوجوان طبقے کی ضرورتیں بھی الگ اور انوکھی ہوتی ہیں ان ضرورتوں کے پیش نظر آکاش وانی اور وودھ بھارتی جیسا چینل وجود میں آیا جو فلمی گپ شپ اور گیتوں کے علاوہ مزاحیہ اور اصلاحی پروگرام پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد F.M چینلوں کا دور شروع ہوا جس نے اس میدان میں خاص کمال دکھایا اور پوری طرح سے نوجوان طبقے اور عوام کو اپنی گرفت میں لے لیا اور نت نئے پروگراموں کے ذریعے نئی نسل کو بہت متاثر کیا گرچہ سارے پروگرام معیاری نہیں تھے مگر بہت سے پروگرام ایسے سامنے آئے جسے ہم نئی ایجاد کہہ سکتے ہیں۔ عورتوں کا بھی مخصوص چینل منظر عام پر آچکا ہے جو انھیں روزانہ کی ضرورتوں کے مطابق پروگرام پیش کرتا ہے جیسے پکوان خانگی مسائل، بچوں کی پرورش اور صحت پر اطمینان بخش پروگرام بھی پیش کرتے ہیں۔ اگر اس ضمن میں Community ریڈیو کا ذکر نہ کیا جائے تو موضوع کو انصاف نہ مل پائے گا۔ Community ریڈیو صرف ریڈیو اسٹیشن نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا کے تمام ملکوں میں خاص کر ترقی پذیر ملکوں میں نہایت تیزی کے ساتھ کام کر رہا ہے یہ ایک ایسا ادارہ ہے جو معاشرے کی خدمت کے لیے سرگرم عمل ہے۔ یہ معاشرتی ضرورتوں کے مطابق اپنے پروگرام ترتیب دیتا ہے خواہ معاشرے میں موجود کسان ہو یا طالب یا زندگی کی جدوجہد میں مصروف عوام ہوں یہ سب کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

مندرجہ بالا تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ریڈیو کسی جادوئی باکس سے کم نہیں اور اور یہ ہماری محرومی ہوگی کہ ہم اس کے کرامات سے فیض نہ حاصل کریں۔ ریڈیو کے کانٹے کا کمال دیکھیے کہ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلا نہیں کہ مقام بدل گیا پروگرام بدل گیا۔ کاش! ہماری زندگی بھی ایسی ہوجائے کہ جب ہم غمگین ہوں تو ہم بھی ریڈیو کی طرح اپنے ذہن کو کسی سریلے و مست نغموں میں گم کردیں۔

ایک وقت تھا جب ریڈیو سننا لوگوں کا محبوب مشغلہ تھا مگر تیز رفتار زندگی نے اس لطیف شے سے محروم کردیا ریڈیو سننا روایت پارینہ بن چکی ہے ریڈیو کی جگہ IPod اور موبائل فون نے لے لی ہے ریڈیو اب نچلے طبقات کی شے بن کر رہ گیا مگر ریڈیو طبقات سے بالاتر اپنے جامع پروگراموں کے ساتھ ہمیں آج بھی دستک دے رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ریڈیو کا سماج میں جو مقام بصری یعنی Visual میڈیا کے آنے سے پہلے تھا وہ آج نہیں ہے، لیکن روز بدلتے ہوئے سماجی تقاضوں کی بدولت سمعی Audio میڈیا بھی ترقی پا رہا ہے جس کا مثبت اثر ریڈیو کی بڑھتی ہوئی مانگ کی صورت میں سامنے آرہا ہے اور خاص طور پر ایف ایم چینلز کی صاف اور واضح نشریات ریڈیو کے بڑھتے ہوئے شوق میں اہم کردار ادا کررہی ہیں۔

ریڈیو تمام خامیوں سے بالاتر ہے اور سب سے سستا ذریعہ ابلاغ ہے جس کی پہنچ ہر خاص و عام تک ہے۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ آسانی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ لایا اور لے جایا جاسکتا ہے اس کی پہنچ ایسی ہے کہ اس کی آواز بند کمروں، بلند و بالا پہاڑوں اور ایسی تمام تر جگہوں جہاں پر انسان کا گزر ممکن نہیں ریڈیو کی لہریں پہنچ جاتی ہیں، ریڈیو نے خواندگی کی خلیج کو پر کیا۔ جو لوگ اخبار و رسائل اور کتابوں کے قاری نہیں بن سکتے تھے وہ ریڈیو کے پروگرام کے ذریعے بہترین معلومات اور تفریح حاصل کرنے لگے۔

■

Md. Akhlaque, 34 AM Khwaja Hostel, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 25
Mob.:088022976636

محمد عارف اقبال

ابن صفی کے نام سے شائع ہونے والے دو جعلی ناول

’سائے کا قتل‘ اور ’روشنی کی آواز‘

ابن صفی کے جاسوسی ناولوں کی نقالی تو بہت سے لوگوں نے کی ہے۔ مگر اب ایک اور روش چل پڑی ہے کہ ان کے نام سے جعلی ناول بھی لکھے جارہے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کو داغدار کرنے کی ایک سازش ہے۔ ابن صفی پر تحقیق کرنے والوں نے اس سلسلے میں بعض ناولوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ کیا واقعی ابن صفی کے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ درج ذیل مضمون بھی اسی نوعیت کا ہے جس میں ان کے نام سے منسوب دو ناولوں کو جعلی قرار دیا گیا ہے۔ اگر اس تعلق سے کوئی دوسرا موقف دلائل کے ساتھ سامنے آتا ہے تو ادارہ اس کی اشاعت پر بھی غور کرسکتا ہے۔ (ادارہ)

الہ آباد سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر محمود کاظمی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے شعبہ دارالترجمہ سے وابستہ ہیں۔ ان کے پاس نکہت پبلی کیشنز الہ آباد سے شائع ہونے والے ابن صفی کے تقریباً تمام ہی ناول موجود ہیں۔ وہ ابن صفی کی تحریروں کے عاشق ہی نہیں بلکہ نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے ایک سال قبل اپنے ذخیرے سے مذکورہ دونوں ناول ’سائے کا قتل‘ اور ’روشنی کی آواز‘ راقم کو بذریعہ اسپیڈ پوسٹ ارسال کیے۔ فریدی-حمید کرداروں پر مشتمل دونوں ناول نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد کے زیر اہتمام شائع کیے گئے تھے۔ نمبر شمار کے لحاظ سے 174 اور 175 سے موسوم یہ ناول بالترتیب اپریل اور مئی 1971 میں شائع ہوئے۔

ابن صفی کے ایک جواں سال پرستار اور محقق انجینئر راشد اشرف (کراچی) نے ’روشنی کی آواز‘ کے حوالے سے ایک چشم کشا مضمون لکھا ہے[1]۔ ان کو مضمون لکھتے وقت صرف ایک ہی ناول دستیاب ہوسکا۔ ’سائے کا قتل‘ کے بارے میں ان کو ڈاکٹر خالد جاوید سے معلوم ہوا۔ راشد اشرف نے ’روشنی کی آواز‘ کے مطالعے کے بعد اس ناول کو یہ کہتے ہوئے مسترد کردیا کہ ”یہ ایک انتہائی بھونڈی اور کمزور تحریر ہے۔ جس کی ایک بھی سطر سے اس کا تعلق ابن صفی جیسے لازوال مصنف کے ساتھ جوڑنا ایک بددیانتی سے زیادہ کچھ نہیں....“ انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا کہ ”مذکورہ ناول میں اس کے مصنف نے جاسوسی دنیا کے دو یادگار ناولوں ’برف کے بھوت‘ اور ’نیلی روشنی‘ سے اقتباسات نقل کرنے کے بعد ان کو مختلف جگہوں پر ٹانکنے کی بھونڈی کوشش کی ہے۔ بالخصوص ’فزارو‘ جو ایک تفریحی مقام ہے اور ’سیتل گھاٹی‘ جہاں ابن صفی مرحوم نے ’برف کے بھوت‘ کے تانے بانے بنے ہیں، ان جگہوں کے نام مذکورہ ناول میں جابجا استعمال کیے ہیں۔“ راشد اشرف نے چھ نکات میں اس جعلی ناول اور اس کے مصنف کی بددیانتی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ’روشنی کی آواز‘ کی مختلف سطروں کے بارے میں لکھا کہ اس ناول میں غیر فصیح جملے، سوقیانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں نیز فریدی-حمید، قاسم کے کرداروں کی مٹی پلید کی گئی ہے۔ انھوں نے اس ناول کے مصنف کو ہندوستانی قرار دیتے ہوئے اس کی زبان کے عیوب کی بھی نشاندہی کی ہے۔

میرے سامنے ’سائے کا قتل‘ اور ’روشنی کی آواز‘ دونوں ناول موجود ہیں۔ دونوں ناولوں کے مطالعے سے بلاشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ’نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد‘ اور ’عباس حسینی‘ کے علاوہ ان میں ابن صفی مرحوم کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا پاکستانی نہیں بلکہ ہندوستانی ہی ہے۔ راشد اشرف نے ’روشنی کی آواز‘ پر جو تنقید کی ہے، کم و بیش ’سائے کا قتل‘ ناول بھی اسی دائرے میں آتا ہے۔ دونوں کے لکھنے کا انداز یکساں ہے اور ان دونوں جعلی ناول کے مصنف نے زبان، اسلوب، پلاٹ، کردار ہر لحاظ سے ابن صفی کی عظمت کو گردآلود کرنے کی کوشش کی ہے۔ جعلی مصنف نے جہاں غیر فصیح زبان استعمال کی ہے اور بین السطور میں ابن صفی کی نقالی کرتے ہوئے وہ لاتعداد خامیوں کا مرتکب ہوا ہے، وہیں دونوں جعلی ناولوں میں ایک لفظ ’ایکدم‘ کی ترکیب سے اس نے خود کو بے نقاب کردیا ہے۔ ابن صفی کے کسی بھی ناول میں ’ایکدم‘ لفظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ ان کے یہاں لفظ ’دفعتاً‘ رائج ہے۔ نمونے کے طور پر ’سائے کا قتل‘ کے درج ذیل جملے دیکھیے:

1. وہ آدمی ایکدم سے چونک کر پیچھے مڑا...(ص:6)
2. وہ ایکدم سے قاسم پر ٹوٹ پڑا...(ص:6)
3. سوچتے سوچتے ایکدم سے اس کے ذہن میں حمید کا نام ابھرا...(ص:8)
4. فریدی بھی اسے دیکھ کر ایکدم سے چونک پڑا... (ص:10)

5. حمید تیزی سے ایک طرف جھپٹا اور پھر ایکدم سے ہال میں اندھیرا پھیل گیا...(ص:24)
6. ...قیا میں ایکدم سے وہ...وہ...الّو کا پٹھا ہوں کہ... (ص:31)
7. ''اچھا تو میں چلا'' حمید ایکدم سے بیٹھے بیٹھے اٹھ کھڑا ہوا...(ص:45)
8. ...کمرے میں ایک آدمی داخل ہوا اور حمید اسے دیکھ کر ایکدم سے چونک پڑا...(ص:68)
9. ...میں ایکدم سے گھبرا گئی اور سوچنے لگی کہ جانے کب حادثہ پیش آیا...(ص:72)
10. فریدی کی آواز سنتے ہی حمید ایکدم سے چونک پڑا... (ص:82)
11. ''کیا بک رہے ہو؟'' پستہ قد آدمی ایکدم سے اچھل کر کھڑا ہو گیا...(ص:88)
12. ...کیونکہ ایکدم سے اس کا سر چکرانے لگا...(ص:90)
13. قاسم کمرے میں داخل ہوا لیکن حمید پر نظر پڑتے ہی وہ ایکدم سے ٹھٹھک گیا۔(ص:91)
14. ...وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایکدم سے اس کے چہرے پر کسی چھوٹی سی ٹارچ کا ننھا سا حلقہ پڑا...(ص:101)
15. حمید ایکدم سے چلتے چلتے چونک پڑا...(ص:102)
16. لیکن اپنی فطرت سے مجبور تھا، چاہتا تھا کہ آپ لوگ ایکدم سے چونک پڑیں۔(ص:107)

پورے ناول میں 'ایکدم' کا استعمال اتنی کثرت سے ہوا ہے کہ یہی ایک لفظ مذکورہ ناول کے جعلی ہونے پر دلیل فراہم کرتا ہے۔اس ناول کے گھٹیا پلاٹ اور کردار کشی پر مزید کسی تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی بلکہ وقت کا ضیاع ہے۔
ذرا 'روشنی کی آواز' کے بھی چند جملے دیکھیے:

1. یہ آپ ایکدم سے چپ کیوں ہو گئے؟...(ص:36)
2. لیکن ہال میں داخل ہوتے ہی حمید ایکدم سے چونک پڑا۔(ص:56)
3. ''راتوں کو اکثر اٹھ کر ٹہلتی رہتی ہیں اور جب میں کچھ کہتی ہوں تو ایکدم سے بگڑ جاتی ہیں...ایک ممی تھیں وہ بھی ایکدم سے بدل گئیں۔'' سارا کی آواز ایکدم سے بھرا گئی۔(ص:66)
4. ''ارے ارے یہ کیا'' حمید ایکدم سے گھبرا کر بولا۔ (ص:66)
5. ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' لیڈی جمشید ایکدم سے چونک پڑیں۔(ص:67)
6. وہ بڑی دیر سے کروٹیں بدلتا رہا کہ دور سے بارہ کے گھنٹے کی آواز اسے سنائی دی اور وہ ایکدم سے بستر چھوڑ کر اٹھ گیا۔(ص:73)
7. جب دوسرا سایہ روشنی میں پہنچا تو حمید ایکدم سے چونک پڑا۔(ص:74)
8. ... اور اس کی بات پر وہ تینوں ایکدم سے ہنس پڑے۔(ص:75)
9. دو تین فرلانگ جانے کے بعد حمید ایکدم سے چونک پڑا۔(ص:88)

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ 'مصنف' نے دونوں ناولوں میں 'ایکدم' کی تکرار جاری رکھی ہے۔ اگر دونوں ناولوں کا تجزیہ دیگر خامیوں اور کمزوریوں کے لحاظ سے کیا جائے تو مضمون طوالت اختیار کر جائے گا اور اسے وقت کا ضیاع خیال کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا اس سے گریز کرتے ہوئے ایک اہم سوال یہ ہے کہ پرنٹر، پبلشر عباس حسینی نے آخر ان دونوں ناولوں کو کیوں شائع کیا؟ دونوں ناولوں کے صفحہ 3 پر عباس حسینی کے اداریے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی خواہش کے مطابق یہ دونوں جعلی ناول شائع ہوئے۔شمارہ 174 کے اداریہ کا آخری پیرا اس طرح ہے:

''سائے کا قتل، بلاشبہ محترم ابن صفی کے ان شاہکار ناولوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جسے آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔'' شمارہ 175 یعنی 'روشنی کی آواز' کے اداریہ کا آخری جملہ عباس حسینی یوں لکھتے ہیں:

''امید ہے کہ قارئین محترم ابن صفی کے اس ناقابل فراموش شاہکار کو ضرور پسند کریں گے۔''

عباس حسینی کے تقریباً ہر اداریے میں مذکورہ انداز کے ٹکسالی جملے لکھے جاتے رہے ہیں۔انھوں نے ابن صفی کے کرداروں پر لکھے جانے والے جعلی پبلشرز کے خلاف مقدمے بھی قائم کیے۔ خاص طور سے 'ڈیڑھ متوالے' کے کیس میں بھی انھوں نے کانپور کے پبلشرز کے خلاف زوردار مہم چلائی تھی[2]۔ لیکن اپریل، مئی 1971 میں یہ دونوں جعلی ناول آخر کن حالات میں نکہت پبلی کیشنز کے زیر اہتمام شائع ہوئے۔عباس حسینی مرحوم پر ابن صفی کے تمام ناولوں کے ہندی ایڈیشن کی اشاعت کا معاملہ بھی سنگین ہے۔سوال یہ بھی ہے کہ کیا وہ اس بات سے واقف نہیں تھے کہ فریدی-حمید اور عمران کے کردار اپنا خاندانی پس منظر رکھتے ہیں؟ ابن صفی کے اصل کرداروں کو ونود، راجیش، پون، ملکھان بنا کر اور ان کے مذہب کو تبدیل کر کے کیا وہ خود کو 'اصلی ہندوستانی' ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اصل معاملہ کیا ہے؟ ابھی یہ معاملہ بحث اور تحقیق و تفتیش کا موضوع ہی تھا کہ خود عباس حسینی بھی ایک ایسی حرکت کے مرتکب نظر آتے ہیں جس کے بارے میں عام تاثر اور ثبوت یہی ہے کہ کراچی و لاہور سے دلّی و کانپور تک جعلی مصنّفین نے ابن صفی کے کرداروں پر این صفی، ابّن صفی، نجمہ صفی وغیرہ ناموں سے ناول لکھ کر قارئینِ ابن صفی سے فریب کرتے رہے۔ لیکن عباس حسینی کی ادارت میں جن مذکورہ دو جعلی ناولوں کے ثبوت ملے ہیں، آخر اس معاملے کی سنگینی کو کیا نام دیا جائے جبکہ ابن صفی کے وہ قریبی دوست تھے اور ان کے تمام ناولوں کی 'من وعن اشاعت' کے سلسلے میں ہمیشہ خود مختار رہے۔ راشد اشرف نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ:

''عباس حسینی نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس بات کا جواب اب کبھی نہ مل سکے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہندوستان میں قیام پذیر عباس حسینی و ابن صفی کے دوست مجاور حسین رضوی اس کی کوئی تاویل پیش کر سکیں کہ وہ نکہت الٰہ آباد کی ٹیم کے واحد اہم ترین شخص ہیں جو اس وقت حیات ہیں۔''

راشد اشرف کی اس بات پر پروفیسر مجاور حسین رضوی کی جانب سے تادم تحریر کوئی جواب شائع نہیں ہوا ہے۔ تاہم ابن صفی مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے لکھے مضمون ''روشنی جو ابھی باقی ہے''[3] کے مطالعے سے خود مضمون کے بین السطور میں بعض متضاد اور غلط معلومات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان کے ذہن میں ابن صفی کے ادبی مقام کا واضح تصور یا نقشہ نہیں ہے۔ ان کے مضمون سے ایسا لگتا ہے کہ ان کے نزدیک ابن صفی اردو کے ایک ایسے ہی مصنف تھے جن کا تذکرہ ایک ڈیڑھ جملوں میں کر دینا ہی ادبی مقام کو متعین کرنے کے مترادف ہے۔ پروفیسر مجاور حسین (قلمی نام ابن سعید) کے اس مضمون کے مطالعے سے جو اشکالات پیدا ہوتے ہیں، درج ذیل ہیں:

1. مجاور حسین نے 'جاسوسی ادب' کے آغاز کا جو پس منظر بیان کیا ہے وہ خود ابن صفی کے بیان کردہ پس منظر سے متصادم ہے۔ جبکہ ابن صفی نے واضح طور پر لکھا ہے کہ فحاشی کے سیلاب کو روکنے کے لیے انھوں نے ناول نگاری کا آغاز کیا۔[4]
2. مجاور حسین کے بقول ''جنوری 53ء میں ناول نگار کا نام ابن صفی منتخب ہوا کہ اسرار صاحب کے والد کا نام صفی اللہ تھا اور اسی مہینہ میں جاسوسی دنیا کے پہلے شمارہ کی حیثیت سے یہ ناول شائع ہوا۔'' (حالانکہ مارچ 1952 میں پہلا ناول 'دلیر مجرم' شائع ہوا تھا جس پر ابن صفی بی-اے درج تھا نہ کہ 1953 — ع.ا.)
3. مجاور حسین نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ''ہندی میں ان کے ناولوں کا ترجمہ شائع ہوتا تھا۔ ابھی تقریباً ستّر بہتّر ناول ایسے ہیں جو ہندی میں شائع نہیں ہوئے۔ وہ

ہندی میں بھی اتنے ہی مقبول تھے جتنے اردو میں، البتہ ہندی میں ان کے دو کرداروں کے صرف نام بدلے ہوئے تھے۔ یعنی فریدی کی جگہ ونود اور عمران کی جگہ راجیش۔'' یہ بات جزوی طور پر درست ہے۔ عباس حسینی نے ابن صفی کے جملہ ناولوں کو ہندی میں منتقل کرایا تھا جن کے مترجم کوئی 'پریم پرکاش' تھے۔ ان ناولوں میں بعض حصوں میں کتر و بیونت کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حمید اور قاسم کے نام کو چھوڑ کر تقریباً تمام ہی مستقل کردار کے نام تبدیل کردیے گئے تھے۔ فریدی کو ونود، عمران کو راجیش، ایکس ٹو کو یون، فیاض کو ملکھان، صفدر کو مدن وغیرہ سے موسوم کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نام کے ساتھ کرداروں کا مذہب بھی تبدیل ہوگیا جبکہ ابن صفی نے تمام اہم کرداروں کا خاندانی پس منظر بھی بیان کیا ہے۔

4. مجاور حسین اپنے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''52 سے 60 تک ہم لوگ ایک دوسرے سے دور رہے۔ صرف خط و کتابت ہی کا سہارا تھا۔ ہر ہفتہ انتہائی پابندی سے خط موصول ہوتا تھا۔ خط اتنے دلچسپ ہوا کرتے تھے کہ پڑھنے میں ناول کا مزہ آتا تھا۔''

ہر ہفتے کے لحاظ سے آٹھ برسوں میں مجموعی طور پر خطوط کی تعداد تقریباً 350 ہوتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ مجاور صاحب ان خطوط کو خود شائع کردیں یا ابن صفی کے اہل خانہ کے سپرد کردیں۔ کیوں کہ ابن صفی کے یہ خطوط جو ناول کا مزہ دیتے ہوں، دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

5. اسی مضمون میں مجاور حسین لکھتے ہیں: ''یہ درست نہیں کہ ادبی حلقوں نے انھیں نظر انداز کیا۔ اردو میں آزادی کے بعد لکھے جانے والے ناولوں کے دور پر بہت کم لکھا گیا ہے پھر بھی ڈاکٹر اعجاز حسین نے 'اردو ادب آزادی کے بعد' اور ڈاکٹر علی حیدر نے 'اردو ناول سمت و رفتار' میں ان کا ذکر کیا ہے۔''

گویا پروفیسر مجاور حسین کے نزدیک ابن صفی کا ادبی مقام یہی ہے کہ چلتے چلتے ان کا تذکرہ کردیا جائے۔ ان کا یہ کہنا بھی حقیقت کی نفی ہے کہ ادبی حلقوں نے انھیں نظر انداز نہیں کیا۔ ایک عظیم ادیب و ناول نگار جس نے کئی نسلوں کو متاثر کیا، اردو زبان سکھائی، اردو ادب میں گراں قدر علمی سرمایہ چھوڑا، اس پر کام کرنے کا اگر یہی انداز ہے جیسا کہ مجاور حسین صاحب نے لکھا ہے تو اردو دنیا کے دیگر ادیبوں اور نقادوں کے منفی رویے پر ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

6. پروفیسر مجاور حسین ایک جگہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''یہ درست ہے کہ ان کے یہاں واقعات کی رفتار پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ پورے منظر، پس منظر و پیش منظر کی تصویر کشی پر نہیں۔''

حیرت ہے کہ پروفیسر مجاور حسین جیسے ادب کے پارکھی اور محترم استاد کی رائے ابن صفی کی منظر نگاری پر اتنی سطحی اور کمزور ہے۔ حالانکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد ناول نگاری کے میدان میں ابن صفی واحد مصنف ہیں جنھوں نے اردو افسانہ اور ناول نگاری میں لفاظی سے گریز کرتے ہوئے ایک نئے انداز کی منظر نگاری کی طرح ڈالی۔ ممکن ہے کہ کوئی ناول نگار ایک 'منظر کشی' میں دو صفحے سیاہ کردیتا ہو لیکن ابن صفی کا طرز امتیاز یہی ہے کہ انہوں نے 'اجمال میں تفصیل' کی طرح ڈال کر اپنے قاری کے وقت کو ضائع ہونے سے محفوظ رکھا۔ اس فن میں ابن صفی واحد ناول نگار ہیں۔ ان کے ناولوں سے منظر نگاری و جزیات نگاری کے انتخاب کو مرتب کر کے شائع کیا جائے تو کئی ضخیم جلدیں تیار ہوسکتی ہیں جو اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

پروفیسر مجاور حسین اردو کے ایک ماہر استاد کی حیثیت سے حیدرآباد یونیورسٹی سے ریٹائرڈ ہیں اور ان کی نگرانی میں ایک درجن سے زائد طلبا نے پی ایچ-ڈی کے مقالے مکمل کیے۔ افسوس کہ انھوں نے اپنی نگرانی میں ابن صفی کی ادبی خدمات پر ایک مقالہ بھی نہیں لکھوایا۔ حالانکہ ابن صفی کا ان پر حق تھا اور دونوں نے رفاقت کے کم سے کم سات برس ساتھ ہی گزارے تھے۔ یہ امر بھی باعث حیرت ہے کہ نکہت پبلی کیشنز، الہ آباد کے زیر اہتمام ابن صفی کی ادبی خدمات پر کوئی سمپوزیم یا سمینار منعقد نہیں کیا گیا۔

ایسی صورت میں برادرم راشد اشرف یہ توقع رکھتے ہیں کہ مجاور حسین رضوی صاحب، عباس حسینی کے راز سے پردہ اٹھائیں گے یا تاویل پیش کریں گے، شاید ممکن نہیں ہے۔ اب تو ایسا لگتا ہے کہ یہ 'راز' مجاور حسین صاحب بھی اپنے ساتھ ہی لے جائیں گے۔

راشد اشرف نے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا ہے کہ 'ڈیڑھ متوالے' کے 'پیش رس' میں ابن صفی نے لکھا تھا— ''پھر جب میری صحت یابی کی خبریں اخباروں میں چھپنے لگیں تو یار لوگوں نے شوشہ چھوڑا کہ میرے اور عباس حسینی صاحب کے تعلقات خراب ہوگئے ہیں۔ اب بھارت میں میری کتابیں ان کے ادارے سے شائع نہیں ہوں گی۔ ان بے چاروں کو یہ نہیں معلوم کہ ایک درجن کتابیں تو میں عباس حسینی کی مسکراہٹ پر قربان کرسکتا ہوں (بشرطیکہ کسی بات پر جھینپ کر مسکرائے ہوں)۔''

اس کے بعد راشد اشرف نے مزید لکھا ہے:

''ابن صفی مرحوم کے پاس ان کے ناولوں کے الہ آباد ایڈیشن بھی پہنچتے تھے۔ گمان ہے کہ ابن صفی 'روشنی کی آواز' کی اشاعت کی خبر سے واقف نہیں ہوں گے۔ اگر ہوتے...اسے پڑھتے...تو شاید عباس حسینی مرحوم کو سچ مچ جھینپ کر مسکرانا ہی پڑتا...اور صفی صاحب کو ان پر ایک درجن کتابیں قربان کرنے کا موقع مل ہی جاتا...!''

برصغیر کے اردو ادب کی تاریخ میں اسے ایک معمہ ہی سمجھا جائے گا کہ دو گھرانے اور دو دوست کے مابین قربت کا حال یہ تھا کہ ابن صفی نے بھارت کے ایک پڑوسی ملک پاکستان سے اپنے ناول کا مسودہ تاحیات بلامعاوضہ اپنے دوست عباس حسینی کو ارسال کرتے رہے، عباس حسینی اسے چھاپ کر نہال ہوتے رہے، لیکن ابن صفی اس بات سے بھی ناواقف رہے کہ ان کے نام سے اور اسی موقر ادارے سے جعلی ناول 'سائے کا قتل' اور 'روشنی کی آواز' بھی شائع ہوئے ساتھ ہی ان کے تخلیق کردہ کرداروں کی ہندی زبان میں مٹی پلید کی جاتی رہی۔ یہ معمہ شاید کبھی حل نہ ہوسکے۔

حوالے وحواشی

1. ابن صفی کون؟ مرتب و مؤلف: مشتاق احمد قریشی، کراچی، 'روشنی کی آواز' (جاسوسی دنیا الہ آباد) ایک جائزہ، مقالہ نگار: راشد اشرف، صفحہ 128 تا 137

2. ابن صفی: مشن اور ادبی کارنامہ، مؤلف و مرتب: محمد عارف اقبال، (جون 2013)، 'اردو ادب میں سرقہ کی بدترین مثال' مقالہ نگار: محمد عارف اقبال، صفحہ 464 تا 484

3. ابن صفی کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا؟ مرتب و مؤلف راشد اشرف، کراچی (مئی 2012)۔ راشد اشرف نے مجاور حسین کے مضمون کے عنوان میں جزوی تصرف کرکے 'ستارہ جو ڈوب گیا— روشنی جو باقی رہے گی' کے نام سے شائع کیا۔ (صفحہ 135 تا 141)۔ حیرت ہے کہ راشد اشرف نے اس مضمون کے مواد پر حاشیے کیوں نہیں لکھے۔ (ع۔ا)

4. دیکھیے 'پیش رس' لاشوں کا بازار (ستمبر 1956) نیز میں نے لکھنا کیسے شروع کیا؟ ابن صفی، عالمی ادب کی نمائندہ تحریریں، ترتیب وادارت: محمد عارف اقبال، جلد 60، صفحہ 15 تا 22

نوٹ: اس کتاب میں ابن صفی مرحوم کے دو مضامین کے علاوہ ان کے افسانے، انشائیے، پیروڈیز اور دستیاب شعری تخلیقات شامل ہیں۔ نیز 250 سے زائد ناولوں کے منتخب فکر انگیز اقتباسات (مع عنوان) بھی شامل کیے گئے ہیں۔

■

Mohd Arif Iqbal
1739/3 (Basement), New Kohinoor Hotel,
Pataudi House, Darya Ganj, New Delhi - 110025
Mob.:09953630788
Email: urdubookreview@gmail.com

حالی اور برکھا رت

جگر تجمل اسلام

1837 کا سال اردو زبان و ادب کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا، جہاں ایک طرف مولانا حالی پیدا ہوئے، وہیں اردو کو ہندوستان کی عدالتی زبان کا درجہ بھی حاصل ہوا۔ 1853 میں حالی نے دِلی کا رُخ کیا، دِلی کالج کی سرگرمیاں عروج پر تھیں، لیکن مغل سلطنت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا، حالی نے اِن حالات کو بہت قریب سے دیکھا۔ 1861 میں دوسری مرتبہ جب حالی دلی آئے اس وقت وہ فارسی، عربی اور اس وقت کے دیگر مروجہ علوم پر خاصی قدرت حاصل کر کے مولانا ہو گئے تھے۔ لیکن مولانا کو اس دفعہ روزگار کی ضرورت تھی نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے بچوں کے لیے اُستاد کی ضرورت کے پیشِ نظر حالی شیفتہ کے بچوں کو پڑھانے لگے، 1869 میں نواب شیفتہ کا انتقال ہوا اور حالی بے روزگار ہو گئے، اسی دوران پنجاب گورنمنٹ بُک ڈپو لاہور میں انھیں نوکری مل گئی اور انجمن پنجاب کو اپنے انداز کا نیا اور باصلاحیت شاعر مل گیا۔ شیفتہ، غالب اور سرسید کی صحبت میں رہنے والے مولانا الطاف حسین، محمد حسین آزاد کی صحبت میں کیا رہنے لگے کہ ان کی ذہنی اڑان جو پہلے سے ہی جدت کی طلبگار تھی اب اور پروان چڑھنے لگی۔ اب وہ مکمل حالی ہو گئے۔ دونوں نے اردو شاعری کے لیے ایک نیا خاکہ تیار کیا اور یوں جدید شاعری خصوصاً نظم کی تحریک کے لیے کوششیں تیز ہوئیں۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''جدید اردو شاعری کی حد بندی آزاد اور حالی کے کلام سے ہوتی ہے۔ جدید شاعری میں آزاد کی اہمیت جتنی تاریخی ہے اتنی ادبی نہیں۔ حالی نظم کے امام ہیں، انھوں نے زبان و بیان کے نئے سانچے بنائے۔''

ایک طویل عرصے بعد 8 مئی 1874 کو انجمن کا ایک اور جلسہ منعقد ہوا اس میں آزاد نے یہ بحث چھیڑی کہ اب اردو والوں کو انگریزی ادب سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ آزاد کو اردو کے شعری کلام میں کلامیت کم اور مبالغہ آرائی زیادہ نظر آ رہی تھی، اس موقعے پر جو مثنوی مولانا آزاد نے سنائی اُس کا پہلا ہی مصرعہ نئی صبح کے آنے کی دستک دے رہا تھا:

اے آفتاب صبح سے نِکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

اس موقعے پر کرنل ہالرائیڈ نے جو تقریر کی اس میں انھوں نے کہا، 'آیئے آج ہم ایسے مشاعرے کی بنیاد ڈالتے ہیں، جس میں شعرا ایک مخصوص مضمون کے تحت نظم لکھیں اور آج میں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ ہم ہر مہینے ایک مشاعرہ کریں اور اگلے مہینے کے مشاعرے میں شعرا حضرات 'برسات کے مُوسم' کے مضمون پر نظمیں لکھیں گے۔''

اَب شعرا کو مصرعہ طرح کے بجائے ایک عنوان مِلا تھا، مولانا حالی نے بھی اسی عنوان کے تحت اپنی نظم 'برکھا رُت' لکھی اور اس مشاعرے میں پیش کی۔ مشاعرہ منعقد کرانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ انگریزی نظموں کی ہیئت میں نظمیں لکھی جائیں، جیسے مصرعوں کے غیر مساوی ہونے اور بالعموم بے قافیہ اور بے ردیف ہونے کے طریقے کو اردو اور فارسی والے نظم کی صورت میں پیش کریں۔ حالانکہ محمد حسین آزاد نے پہلے ہی اس بابت کہا تھا کہ وزن، بحر، قافیہ وغیرہ کلامِ موزوں نہیں ہے، لیکن مغرب میں جس طرح نظم کے مصرعے وزن، بحر وغیرہ سے عاری ہوتے ہیں، اردو نے ان باتوں کو جوں کا توں قبول نہیں کیا، خود آزاد مثنوی کی ہیئت سے باہر نہیں آ پائے۔ اردو میں مصرعے چھوٹے بڑے تو ہو سکتے ہیں لیکن بحر وزن وغیرہ لازماً ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا حالی نے اپنی نئی شاعری نئے موضوع میں تو پیش کی لیکن فنی معاملے میں اُنھیں بھی مثنوی کی ہیئت میں نظم لکھنا بہتر نظر آیا۔ تقریباً ایک سو چوالیس اشعار پر مشتعل یہ نظم اردو شاعری کے حوالے سے پہلا کامیاب تجربہ ہے، جس میں شاعر فطرت کی منظر نگاری کو تفصیلی انداز میں اس طرح سے ادا کرتا ہے کہ جذبات اور محسوسات کی ایک نئی دنیا جنم لینے لگتی ہے۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نظم 'برکھا رُت'، 'مقدمہ شعر و شاعری' کے پیمانے پر کھرا اترتی ہے یا نہیں۔ مقدمہ دراصل حالی کے اپنے شعری دیوان کا ہی مقدمہ ہے، اس مقدمے میں جو پیمانے حالی نے وضع کیے ہیں، جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ کیا انھوں نے اپنی شاعری کی پرکھ مقدمے کی کسوٹی پر کی تھی یا نہیں؟ کیا آج تک ایسا ہوا ہے کہ کسی شاعر نے اپنے ہی کلام پر اس طرح سے مدلل گفتگو کی ہو کہ ایک نیا دبستان وا ہو جائے، حالی کی شاعری کی بڑی خوبی یہی ہے کہ حالی کے قول و فعل میں تضاد نظر نہیں آتا۔

مقدمہ میں حالی نے ان چیزوں کو خاصی اہمیت دی ہے۔ سادگی، اصلیت، جوش اور فطرت نگاری، حالی لکھتے ہیں:

''... شعر کی خوبی یہ کہ وہ سادہ ہو، جوش سے بھرا ہو اور اصلیت پر مبنی ہو... نیچرل شاعری سے مراد وہ شاعری ہے، جو لفظاً و معنیً دونوں حیثیتوں سے نیچر یعنی فطرت کے موافق ہو''

'برکھا رت' کے مطالعے کے بعد یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں ہر شعر سے سادگی ٹپکتی ہے، وہیں اس سادگی میں وہ جوش پنہاں ہے کہ خوبصورتی سے واقعات کی اصلیت سامنے آجاتی ہے، شاعر نے لفظیات کو اس طرح سے برتا ہے جیسے نظم میں میر کی جامع مسجد کی سیڑھیوں کی زبان میں بات ہو رہی ہو اور یوں لگتا ہے برسات کے موضوع نے شاعر کو اپنی اور کھینچا ہو، جب ایک ایک شعر آنکھوں کے

سامنے کھلتا ہے، تو نئے نئے دریچے کھل جاتے ہیں، یوں دل کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں۔ ایک ایک لفظ میں جوش اس سادگی سے بھرا ہے کہ کوئی بھی چیز غیر فطری (unnatural) نہیں دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے:

بازار پڑے تھے سارے سنسان
آتی تھی نظر نہ شکل انسان

حالی کی تربیت شاعری کی قدیم روایات میں ضرور ہوئی تھی، لیکن وہ اپنے عہد کے تقاضوں اور تبدیلیوں کو سمجھ چکے تھے اس لیے انھوں نے نظم کو نئے انداز میں پیش کیا، یہ نظم اردو شاعری کی دنیا میں پہلا کامیاب تجربہ ہے، جس نے اردو شاعری میں ایک انقلاب برپا کیا،'' اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالی ''پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو'' لاہور میں جس کام کے لیے تعینات ہوئے تھے، وہ انگریزی سے اردو میں کتابوں کے ترجموں کی اردو عبارت کو درست کرنا تھا۔ اس دوران حالی کی انگریزی ادب سے مناسبت پیدا ہوگئی، پھر یہ بات فطری ہے کہ انگریزی ادب کے اثرات سیدھے طور حالی کی تخلیقات پر بھی پڑے۔ برکھارت کو ہی دیکھ لیجیے۔ نظم میں مختلف اصناف کی امیزش نظر آتی ہے۔ میری نظر میں اس نظم کو'تین' حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ یوں لگتا ہے کہ شاید حالی نے بھی اس میں ڈرامائیت پیدا کرنے کے لیے اسے مختلف ابواب "Acts" میں تقسیم کیا ہے۔ تاکہ یہ نظم نئے انداز کی محسوس ہو، دوسرے حالی کا مقصد یہ بھی تھا کہ قارئین بھی روایتی طرز عمل سے باہر آئیں۔ حالانکہ حالی نے ابواب کا کوئی نام نہیں رکھا ہے، لیکن میرے نزدیک یہ تین حصے اس طرح سے ہونے چاہیے:

(1) دیباچہ (2) اصل موضوع، اور (3) اختتام

نظم کے پہلے شعر سے چھٹے شعر تک حالی نے نظم کا مقصد کیا ہے؟ کے بیان کرنے کی ایک بہترین کوشش کی ہے، یوں لگتا ہے کہ حالی جیسے کسی کتاب کا دیباچہ لکھ رہے ہوں، یہ اشعار بڑی خوبصورتی سے ایک ایسے منظر کا دریچہ وا کر رہے ہیں، جہاں سے ساری کہانی صاف نظر آرہی ہے۔

ان اشعار کے بعد نظم کا 'اصل موضوع' شروع ہوجاتا ہے کہ کن حالات میں لوگ زندگی بسر کر رہے تھے، گرمی نے زندگی کا ہر پل اجیرن بنایا تھا، حالی اس طریقے سے گرمی کا راگ چھیڑتے ہیں کہ قاری خود پسینے پسینے ہوجاتا ہے، اور آہستہ آہستہ گرمی کی کہانی تفصیل کے ساتھ سامنے آجاتی ہے، اس دلیل کو پیش کرنے کے لیے سادہ لفظوں کو برتنے میں کمال کی کاری گری کی گئی ہے:

اور صبح سے شام تک برابر
تھا العطش العطش زبان پر
تھی آگ کا دے رہی ہوا کام
تھا آگ کا نام مفت بدنام

ان اشعار سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ نظم کوئی عام نظم نہیں بلکہ کوئی مرثیہ ہے اور شاعر ماتم کناں ہے کیونکہ لفظیات کے برتاؤ نے نظم میں مرثیے کا رنگ بھر دیا ہے، پانی کی شدید قلت، بچوں کا پیاسا رہنا، جانوروں کا تڑپنا، شہر، دیہات، جنگل کے حالات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کن اذیت ناک حالات سے لوگ گزر رہے ہیں، لیکن اسی بیچ آسمان ایک اچھی خبر سناتا ہے، لوگ اچانک جنگ جیت جاتے ہیں اور خدائے بزرگ ان کی دعائیں قبول فرماتا ہے اور ایک پرسکون کیفیت طاری ہوتی ہے۔ حالی اس کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

پروا کی دہائی پھر رہی ہے
پچھوا سے خدائی پھر رہی ہے
برسات کا بج رہا ہے ڈنکا
اک شور ہے آسمان پر برپا

یوں حالی برسات کی آمد پر مدح سرائی کر رہے ہیں اور زمین پر رہنے والے ہر نفس کی خوشی کو بیان کرتے ہیں، جس طرح حالی نے نظم میں گرمی کی عکس بندی کی تھی اب اسی طرح تفصیلاً برسات اور اس کے بعد کے حالات کی راگنی چھیڑی گئی ہے، یہاں پر بھی ہر چیز کا خیال رکھا گیا، خوشی میں انسانوں کے ساتھ ساتھ جانوروں وغیرہ کا بھی ذکر ملتا ہے:

کوئل کی کوک جی لبھاتی
گویا کہ دل میں ہے بیٹھ جاتی

آگے چل کر حالی نے مذہبی رواداری کو بھی قائم رکھا ہے، جہاں یہ بتایا گیا کہ مسلمان کس طرح سے خدا کا شکر ادا کرتے ہیں، وہیں ہندو مسلم، سکھ وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں یہ بات سامنے آتی ہے کہ حالی مساوات اور بھائی چارے کے علمبردار تھے:

مسجد میں ہے ورد اہل تقویٰ
یا رب لنا ولا علینا
مندر میں ہر کوئی ہے یہ کہتا
کرپا ہوئی تیری میگھ راجا
کرتے ہیں گرو، گرو گرنتی
گاتے ہیں بھجن، کبیر پنتھی

قارئین کے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے حالی نظم کا ذائقہ بدل کر ایک پردیسی کا ذکر چھیڑتے ہیں، جو اپنے وطن سے دور غریب الوطنی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ ناسٹولجیک (Nostolgic) انداز اختیار کرتے ہیں دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں، جیسے یہ پردیسی خود قاری ہو:

اول کہیو سلام میرا
پھر دیجیو یہ پیام میرا
قسمت میں میری یہی تھا لکھا
فرقت میں تمھارے آئے برکھا

خلیق انجم لکھتے ہیں:

''حالی کا لاہور میں دل نہیں لگا، انھیں دہلی یاد آتی رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ جس طرح ممکن ہو دلی واپس چلے جائیں، لیکن ملازمت کی مجبوری.. لاہور میں ان کا کوئی ایسا دوست آشنا نہیں تھا جس پر وہ اعتماد کر سکتے۔ اس لیے تنہائی کے شدید احساس نے انھیں بہت تکلیف دی...... وہ وبائی امراض کا شکار ہوئے۔ حالی نے اپنی اس بے بسی اور ذہنی پریشانی پر ایک غزل بھی کہی تھی۔ غزل میں...... غریب الوطنی اور پردیس میں تنہائی کے شدید احساس کا بھی ذکر کیا ہے''

اور اب آخری شعر پر نظر ڈالیے کہ کس طرح سے حالی نے نظم کو سمیٹا ہے:

پھر غور سے جو اک نظر ڈالی
نکلا وہ ہمارا دوست حالی

یہاں پر حالی نے روایتی انداز بیان ترک نہیں کیا حالانکہ انگریزی نظموں میں شاعر اپنا نام نہیں لاتے ہیں، لیکن یہاں پر حالی نے غزل کی طرح آخری شعر مقطع میں بدل دیا، حالی اپنا تخلص شاید اس لیے چاہتے تھے، تاکہ قارئین جان پائیں کہ اس داستان غم میں، میں بھی برابر شریک ہوں، حقیقت میں یہ شعر حالی نے ان تمام لوگوں کی نذر کیا ہے جنھیں غریب الوطنی میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح اس نظم کا ایک المیہ اختتام ہوتا ہے۔

اسلم پرویز نظم برکھارت کے متعلق گارساں دتاسی کے حوالے سے یہ عبارت نقل کرتے ہیں۔ جو دتاسی نے کسی پنجابی اخبار سے نقل کی تھی، لکھتے ہیں:

''جس نے یہ نظم نہ پڑھی ہو، وہ پڑھ کر دیکھے، کہ شاعر نے کس خوبی سے یہ تصویر بنائی ہے۔ جس نے شاعر کی زبان سے اسے سنا وہ مرحبا کہہ اُٹھا اور کوئی صاحب ذوق اس کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا... بڑی بات یہ کہ شاعر نے کوئی بے موسم کی راگنی نہیں چھیڑی ہے اور نہ حسن و عشق کے چرچے کیے، پھر بھی اس کی سادگی کام کر گئی ہے۔''

■

Jigar Tajammul Islam, Ph.D, Scholar, Dept. of Kashmir University, Srinagar - 190006 (J&K)

احمد سہیل

اردو کے دو عہد ساز ادبی جرائد

ادب لطیف لاہور، شاعر ممبئی

اردو کے ادبی وعلمی جرائد کی صحافت کوئی سوا سو سال پر مبنی ہے۔ کچھ ادبی جرائد تو اردو کی تاریخ میں ایک دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے علمی، ادبی تنقیدی مضامین، مباحث اور نئی فکر اور تراجم سے اردو کے کئی جرائد کو شناخت و پہچان ملی۔ اردو کے ادبی جرائد میں شائع ہونا ادبا وشعرا کے لیے عزت ومنزلت کی بات ہوا کرتی تھی اور ایک زمانے میں مدیر صاحبان کا درجہ 'استاذ' کا ہوا کرتا تھا۔ وہ اپنے جرائد میں کمزور تحریروں کو شائع نہیں کرتے تھے۔ اب بھی ادبی جرائد اور کتابی سلسلے چھپتے ہیں مگر اب ان کی مانگ کم ہے ان میں شائع ہونے والی بے مزہ اور بے رنگ تحریروں کی اب وہ وقعت نہیں جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ شاید اس کا سبب انسان کا معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہوجانا ایک وجہ علم وادب کی اہمیت کم ہوگی اور برقیاتی میڈیا کے مشاغل زیادہ بڑھ گئے ہیں۔

میں آج اردو کے دو (2) تاریخ ساز ادبی جرائد پر بات کروں گا جو ایک عرصے سے چھپ رہے ہیں جن میں اردو کے تقریباً سبھی معتبر اور تاریخ ساز ادبا وشعرا شائع ہوتے رہے اور ان جرائد نے اردو زبان و ادب کی آبیاری کی اور نئے رجحانات سے روشناس بھی کروایا۔ نئی بخشیں کیں، نئی نسل کی تربیت کرتے ہوئے اردو جیسی نوخیز زبان کو عالمی سطح پر لا کھڑا کیا۔

عموماً جب مدیر کا انتقال ہوجاتا ہے تو رسائل بند ہوجاتے ہیں یا معاشی مسئلہ کے سبب ان کی اشاعت روکنی پڑتی ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ مدیران کے خاندان کے لوگ ہی جرائد کو بند ہونے نہیں دیتے اور اپنے خاندان کی اس ادبی روایت کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔

اردو میں ادبی رسائل و جرائد اور ادبی صحافت کی ابتدا سرسید احمد خان کے 'تہذیب الاخلاق' سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد لکھنؤ سے عبدالحلیم شرر نے جنوری 1887 میں 'دل گداز' کا سولہ صفحات پر مشتمل پہلا شمارہ جاری کیا جب شرر ملازمت کے سلسلے میں حیدرآباد (دکن) پہنچے تو رسالے کو وہاں اپنے ساتھ لے گئے۔ مگر وہاں پابندی سے شائع نہیں ہوتا تھا۔ جب شرر لکھنؤ واپس آئے تو یہ لکھنؤ سے چھپنے لگا۔ پھر دسمبر 1926 میں یہ پرچہ بند ہوگیا۔ پھر ایک عرصے تک اورنگ آباد سے چھپا۔ اردو کا پہلا ادبی جریدہ 'گل دستہ' انیسویں صدی کی پچانویں دہائی میں مولوی کریم الدین پانی پتی نے شائع کیا۔

'ادب لطیف' لاہور اور 'شاعر' ممبئی اردو کے سب سے پرانے جرائد ہیں جو قریب اسی (80) سال سے شائع ہورہے ہیں اور اردو کی چار نسلیں اس سے مستفید ہوتی رہیں اور جو اس میں چھپا وہ اردو کی تاریخ میں اپنا کام اور نام تاریخ میں درج کروا گیا۔ 1947 میں تقسیم ہند کے بعد بھی یہ وہ بڑے ادبی رسائل ہیں جو آج بھی اپنی آب و تاب کے ساتھ پابندی سے شائع ہورہے ہیں۔

ان دونوں ادبی رسائل کی عمر تقریباً ایک جیسی ہی ہے۔ یہ اب بھی چھپتے ہیں، لوگ ان کو پڑھتے ہیں جس میں ناسٹلجیائی جمالیات بھی ہے۔ ان دونوں رسائل میں لکھنے والوں کی کئی نسلیں آئیں اور دنیا سے چلی گئیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں کئی جغرافیائی اور معاشرتی تبدیلیاں آئیں۔ لوگوں کا مزاج اور سوچوں میں بھی

تبدیلی آئی مگر یہ دونوں رسائل اپنی روایت کے ساتھ نئی ہواؤں کو خوش آمدید کہتے رہے اور آج بھی اردو کا دنیائے ادب ان دونوں جرائد کی خوشبو سے معطر ہے۔

'ادب لطیف' 1935 سے شائع ہونے والا ایک ایسا جریدہ ہے جو آج بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس کے قاری اس کا بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ اس پرچے کو پڑھ کر اردو کی عصری رفتار کا پتہ بھی چلتا ہے اور نئے لکھنے والوں کو بڑی فراخ دلی کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے آج کل صدیقہ بیگم اور ان کے صاحب زادے محمد خالد چودھری کے ہاتھوں میں 'ادب لطیف' کی عنانِ ادارت ہے اور یہ پرچہ بڑی آب و تاب سے نکال رہے ہیں۔ 'ادب لطیف' کو صدیقہ بیگم کے والد صاحب چودھری برکت علی (1902-1951) نے شائع کیا۔ انھوں نے 1929 میں لاہور میں نصابی کتابیں چھاپنے کا ایک ادارہ 'پنجاب بک ڈپو' کے نام سے کھولا۔ چودھری برکت علی نے اپنے ادارے میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بنا رکھا تھا۔ جہاں عام لوگ آتے اور کتابوں کا مطالعہ کرتے اور کتابیں پڑھنے کو اپنے گھر بھی لے جاتے تھے۔ 'خون بہا' کے مصنف حکیم شجاع نے ایک دن باتوں باتوں میں انھیں ایک ادبی رسالہ جاری کرنے کو کہا۔ پہلے تو چودھری برکت علی کچھ نہ بولے اور بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر کچھ دن بعد حکیم شجاع کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد رسالے کا نام ادب لطیف تجویز کیا گیا۔ سب نے اس نام کو پسند کیا تعاون کا بھی یقین دلوایا۔

'ادب لطیف' کے پہلے مدیر طالب انصاری بدایونی کے حصے میں آئی۔ طالب انصاری فلموں میں گانے لکھا کرتے تھے۔ اسکول میں استاد تھے اور اضافی آمدنی کے لیے ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں زیادہ وقت پرچے کو نہیں دے سکے اور اس سے علیحدہ ہوگئے۔ اس وقت 'ادب لطیف' کے مینجنگ ایڈیٹر امتیاز علی چودھری تھے۔ پھر 'صحرا نورد کے خطوط' کے خالق مرزا ادیب اس پرچے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور 'ادب لطیف' کو اپنی محنت اور اپنے اعلیٰ ادبی ذوق کے سبب آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ ان کی محنت کا ہی ثمر تھا کہ آج انھی کے خلوص اور اعلیٰ ذوق اور صحافتی ہنرمندی کے سبب یہ پرچہ آج بھی زندہ ہے اور اس میں مرزا ادیب کی روح بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مرزا ادیب کا بطور مدیرِ 'ادب لطیف' کا رویہ نہایت ستھرا اور میانہ روی کا تھا۔ مگر بعد میں 'ادب لطیف' کی تخلیقات کے انتخاب کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ اس زمانے کی ادبی صورت حال سے بددل تھے وہ ترقی پسندی سے بھی بددل ہوگئے تھے۔ وہ سکہ بندی کو توڑنا چاہتے تھے وہ غیر ترقی پسند اور یساریت پسندوں سے بیزار نئے لکھنے والوں کو ادب لطیف میں سراہنا شروع کر دیا اور اس نئے منظرنامے میں نئے رنگ بھرنا شروع کر دیے۔ ساتھ ہی مرزا ادیب نئے لکھنے والوں کو ادبی فضا کو سمجھنے کی تلقین بھی کرتے رہے۔

> **طالب انصاری فلموں میں گانے لکھا کرتے تھے۔ اسکول میں استاد تھے اور اضافی آمدنی کے لیے ٹیوشن پڑھایا کرتے تھے۔ وہاں زیادہ وقت پرچے کو نہیں دے سکے اور اس سے علیحدہ ہوگئے۔ اس وقت 'ادب لطیف' کے منیجنگ ایڈیٹر امتیاز علی چودھری تھے۔ پھر 'صحرا نورد کے خطوط' کے خالق مرزا ادیب اس پرچے کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور 'ادب لطیف' کو اپنی محنت اور اپنے اعلیٰ ادبی ذوق کے سبب آسمان پر پہنچا دیا۔ یہ ان کی محنت کا ہی ثمر تھا کہ آج انھی کے خلوص اور اعلیٰ ذوق اور صحافتی ہنرمندی کے سبب یہ پرچہ آج بھی زندہ ہے اور اس میں مرزا ادیب کی روح بھی دکھائی دیتی ہے۔**

1947 سے پہلے یہ رسالہ ترقی پسندوں کے زیر تھا اور ان کے مدیران راجندر سنگھ بیدی، چودھری نذیر احمد، ساحر لدھیانوی، باری علیگ، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، فکر تونسوی تھے۔

ہندوستان کے بٹوارے کے بعد پھر پانسہ پلٹ گیا اور ترقی پسند شعرا و ادبا 'ادب لطیف' کے خلاف ہوگئے اور اس پر ادب کی آڑ میں بازار کاری کا الزام لگایا اور یہ تاثر بھی گشت کرنے لگا کہ یہ پرچہ 'رجعت پسندوں' کی رکھیل بن گیا ہے اور ترقی پسندوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔

اس کو غلط فہمی بھی کہا گیا تو 'ادب لطیف' کے مالک چودھری برکت علی نے احمد ندیم قاسمی سے کہا ''زندگی اور ادب کی ترقی پسند قدروں پر میرا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے عتاب سے بوکھلایا نہیں بلکہ مرزا ادیب صاحب کی مدد سے ترقی پسند ادب ہی پیش کرتا رہوں گا۔''

اس زمانے میں لوگوں سے ازراہِ مذاق کہا گیا تھا کہ ترقی پسند حقیقت پسندانہ، عوامی، انقلابی ادب و فکر کو پیش کرتا ہے۔ جبکہ ادب لطیف کے معنی... تو اس انشا کو کہتے ہیں جس میں تخیل و جذبات کا اظہار ہوتا ہے اور اسلوب بیان کی خوبی نمایاں ہو جس میں اسلوب موضوع پر مقدم ہو۔ یہ نظم منثور، رومانیت، شگفتہ نگاری پر مشتمل ادب ہوتا ہے جس میں ہلکے پھلکے افسانے ہوتے ہیں اور یہ بھی کہا گیا کہ مرزا ادیب اردو کی رومانوی تحریک کے دستے کے آخری سپاہی تھے انھوں نے اسی سبب 'ادب لطیف' کو تاحیات سینے سے لگائے رکھا۔

آزادی کے بعد مدیران کی نئی نسل 'ادب لطیف' کی ادارت میں شامل ہوتی رہی جن میں عبدالمتین عارف، انتظار حسین، قاسم محمد، ناصر زیدی، کشور ناہید، ذکاء الرحمٰن اور معاونین میں مسعود اشعر اور اطہر جاوید کے نام ابھر کے سامنے آئے اور نہایت خوش اسلوبی سے یہ لوگ پرچے کو نکالتے رہے۔ ان دنوں صدیقہ بیگم اور ان کے گھرانے کی علم دوستی، فراخ دلی کے سبب آج بھی یہ پرچہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

'ادب لطیف' نے 1950 نومبر میں دھماکہ خیز طویل مختصر افسانہ نمبر شائع کیا۔ اس میں بڑے پائے کے افسانے اور مضامین شامل تھے۔ خاص کر جلیل کریر کا مضمون 'طویل مختصر افسانے کا فن' بہت پر مغز اور فکر انگیز ہے اور اس نمبر میں شامل تمام افسانہ نگاروں اور نقادوں کے کوائف اور تصاویر بھی شائع ہوئیں۔ جس میں شوکت صدیقی، خواجہ احمد عباس، تسلیم سلیم چھتاری اور ابن سعید وغیرہ کے افسانے شامل تھے۔ 1950 میں ہی 'ادب لطیف' کے سالنامے میں 'تین شاعر تین نقاد' کے تحت ڈاکٹر سعید عبداللہ کا مضمون 'درد کی شاعری میں صوفیانہ لہجہ'. عطا محمد کا مضمون 'حضرت داغ' اور سید اقبال عظیم کا مضمون 'اقبال کی شاعری کا پہلا دور' چھپے اور ایک عرصے تک موضوع بحث رہے۔

'ادب لطیف' نے کئی عہد ساز نمبر نکالے جس میں فیض احمد فیض، اشفاق احمد، مرزا ادیب اور عصمت چغتائی پر بڑے معرکے کے مضامین پڑھنے کو ملے۔

اس کے علاوہ گولڈن جوبلی نمبر، جوبلی نمبر 63، 55 سالہ نمبر، بودلیئر کی نظمیں، ہیرنجل کی تحریریں، ایرنش فریڈ کی نظمیں، سال نامہ 1994، افسانہ نمبر 1995، غزل نمبر 1995، افسانہ نمبر 1997، غزل و نظم نمبر 1995، تراجم کہانیاں 1998 اور 75 سالہ نمبر بھی 'ادب لطیف' کے ادبی کارناموں میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

اشفاق احمد نمبر میں 25 مضامین شامل ہیں۔ آغا سہیل کا 'اشفاق احمد بے مثال داستان گو...'، احمد عقیل روبی کا 'سنیا گو بھشم پتامہ اشفاق احمد' اور غالب احمد کا

دلچسپ مضمون 'داستان سرائے' اور صدیق تلقین شاہ 'پڑھ کرنئی آگاہیاں دریافت ہوتی ہیں۔ فیض احمد فیض کے خصوصی شمارے میں کرشن گولڈ کا فیض کے ساتھ بہترین مصاحبہ... اور مضامین میں فیض سے ملاقات (کرشن چندر)، فیض صاحب کی یادیں باتیں (تجمل حسین)، قرۃ العین حیدر کا مضمون 'اپنے عہد کی آواز' پڑھنے کے لائق ہے۔ اس شمارے میں ایک پینل کے ساتھ فیض صاحب کے ساتھ طویل انٹرویو بھی شامل ہے جس میں سہیل احمد، جاوید شاہین، مسعود اشعر اور محترمہ نور حفیظ نے بڑے ہی پائے کے سوالات اور گفتگو دلچسپ ہی نہیں جس میں فیض صاحب کی زندگی کے کئی پوشیدہ گوشے بھی سامنے آئے ہیں۔

مرزا ادیب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے 10 مضامین اور دو (2) مصاحبے اور نظمیں شامل ہیں۔ مرزا ادیب کے ساتھ صدیقہ بیگم، سید فخرالدین بلے، ظفر علی راجہ، ظفر معین بلے اور افتخار راہی کی گفتگو بھی پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس ملاقات میں مرزا ادیب نے ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ایک سوال کے جواب میں کہا: ''یہ تحریک (ترقی پسند) لادینیت کی طرف تو ہرگز نہیں لے جاتی البتہ اسے بنیاد پرستوں کے عمل کا ردعمل ضرور کہا جاسکتا ہے۔''

عصمت چغتائی نمبر میں پطرس بخاری، سعادت حسن منٹو، فیض احمد فیض، قرۃ العین حیدر، الطاف فاطمہ، افضل توصیف اور سرفراز کے مضامین خوب ہیں۔ اس میں عصمت چغتائی کے لکھے ہوئے تین مضامین... 'میرا دوست میرا دشمن' میں کیوں لکھتی ہوں'... اور 'آپ بیتی' بھی پڑھنے کو ملتے ہیں۔

'شاعر' کا پہلا پندرہ روزہ شمارہ 15 فروری 1930 کے دن شائع ہوا۔ اس کے مدیر اور منتظم سیماب اکبرآبادی تھے۔ اس پرچے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ غالب کی جنم بھومی آگرہ سے بڑے سائز میں شائع کیا۔ اس رسالے کی بھی ایک دلچسپ تاریخ اور کہانی ہے۔ جب 'شاعر' کو شائع کرنے کا ارادہ ہوا تو سیماب صاحب کے ذہن میں کئی خدشات تھے کیونکہ اردو ادبی جریدے کا اجرا آسان نہیں ہوتا۔ 14 دسمبر 1929 میں ایک رسالے 'تاج' میں 'شاعر' کا اشتہار چھپا جس میں 'شاعر' کو پندرہ روزہ رسالہ لکھا گیا اور یہ بات بتائی کہ جنوری 1930 میں یہ شائع ہوگا مگر 'شاعر' مقررہ تاریخ پر شائع نہیں ہوسکا مگر 28 جنوری 1930 میں منیجر کی جانب سے اطلاع دی گئی کہ یہ جلد شائع ہوگا اور اس کا سائز بڑا ہوگا اور اشاعت کی تعداد 5 ہزار ہوگی۔

'شاعر' کے ابتدائی پرچوں کے سرورق پر لکھا ہوتا تھا ''جمعیۃ الشعرائے ہند کا واحد اخبار''— ''ہندوستان چار کرد شاعروں کا واحد آرگن''... خاص ادبی مصور ماہانہ صحیفہ۔

ساتھ ہی نگراں اصول: سیماب اکبرآبادی اور مدیر مسئول منظر اکبرآبادی.. اگست تمبر تک 1933 تک جتنے بھی 'شاعر' کے شمارے شائع ہوئے وہ تمام کے تمام منظر صدیقی کی ادارت میں شائع ہوئے۔ اس کی وجہ منظر

'شاعر' میں عہد ساز موضوعات جیسے افسانہ نمبر، غالب نمبر، خواتین شعرااور نگاروں کا نمبر، نثر نظم نمبر، زاد غزل نمبر، کرشن چندر نمبر، سردار جعفری نمبر، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین خواجہ احمد عباس، کنھیا لال کپور، ساحر لدھیانوی، ناولٹ نمبر کے علاوہ شاعر کا ایک معترکۃ الآرا کام 'ہم عصر اردو نمبر' کا 1240 صفحات کا ضخیم نمبر ہے۔ جس میں اردو ادب کی تاریخ کی گم شدہ کہانیاں مل جاتی ہیں۔

صدیقی بیمار ہوگئے تھے ان کا جگر اور معدہ خراب ہونے کے سبب اختلاج کے دورے پڑتے تھے۔ اس لیے وہ شاعر کی ادارت سے بحیثیت مدیر الگ ہوگئے تھے۔ کچھ عرصے مہندر ناتھ، ندا فاضلی، عمر حسین، آغا رشید مرزا اور یونس اگاسکر اس کی ادارت میں معاون رہے۔ 'شاعر' اس زمانے میں اردو کے پڑھے لکھے گھرانوں اور ادب کے عام قاری کے حلقوں میں پڑھا جاتا تھا۔ اس جریدے نے شعرا کی تربیت بھی کی اور سیماب اکبرآبادی معاوضہ دے کر ان شعرا کی اصلاح بھی کیا کرتے تھے۔ 'شاعر' نے سب سے پہلے پابند نظمیں شائع کرنا شروع کی۔

سیماب اکبرآبادی 'شاعر' میں شعرا کو موضوع دیتے تھے اور ان موضوعات پر شعرا سے نظمیں لکھواتے تھے۔ مصرعہ طرح بھی دیتے تھے اور ڈاک سے غزلیں منگواتے تھے اور انھیں اصلاح کرکے چھاپتے تھے... 'اصلاح سخن کے عنوان' سے کسی 'استاذ' کی غزلیات کو ترجیح دیتے تھے اور تحقیق و فصاحت کے ساتھ اس پر بحث کرتے اور سوالات کے جوابات بھی دیتے تھے۔ 'شاعر' میں ان کے اداریوں کو کلیدی مقام حاصل ہوتا تھا۔ ان دنوں دیگر ادبی رسائل میں بھی اداریوں پر سب سے زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ ادبی جرائد میں توانا اداریہ بھی پرچے کا 'دل' ہوتا ہے۔ ماضی کے ادبی رسائل کے کئی اداریے اردو کی تنقیدی اور تحقیقی تحریروں کا حوالہ بنے۔

سیماب صاحب نے 'شاعر' کا امروز نمبر نکالا جس میں وہ اعتراضات کے جواب دیتے تھے... شاعر مالی پریشانیوں میں بھی گھرا رہا۔ شاعر کی جلد 36 شمارہ 3-4 کے شمارے میں مہندر ناتھ کے دستخط سے قارئین سے 'شاعر' کے لیے دس ہزار روپے کی ضرورت کی اپیل بھی کی گئی۔ سیماب اکبرآبادی نے پہلے آگرہ سے شائع کیا تھا۔ مگر جب وہ 1950 میں ایک مشاعرہ پڑھنے کراچی گئے تو آگرہ میں ہنگامہ اور فساد ہوگیا تو وہ پرچے کو ممبئی لے آئے۔ آگرہ سے شروع ہونے والا یہ رسالہ ایک 'دبستان' بن گیا۔ سیماب صاحب کے ہزارہا شاگرد تھے۔ یہ سلسلہ اردو کی تاریخ میں حاوی رہا جسے دہلی، لکھنؤ کی شاعری کے مکتبہ فکر رہے۔ سیماب صاحب کے شاگرد پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ان سے اصلاح لیتے تھے لیکن یہ ایک مثبت بات ہے کہ دوسرے حلقوں اور دبستانوں سے ان کی مخاصمت نظر نہیں آئی۔ جو آج بھی شاعر کا طرۂ امتیاز ہے شاعر کبھی ترقی پسند جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی چھتری کے نیچے نہیں آیا۔ حالانکہ اس پرچے نے تمام نظریاتی فکر تنقیدی مباحث اور تحریروں کو چھاپا اور سب کو کھل کر بات کرنے کی آزادی دی۔

'شاعر' میں عہد ساز موضوعات جیسے افسانہ نمبر، غالب نمبر، خواتین شعرااور نگاروں کا نمبر، نثر نظم نمبر، آزاد غزل نمبر، کرشن چندر نمبر، سردار جعفری نمبر، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین خواجہ احمد عباس، کنہیا لال کپور، ساحر لدھیانوی، ناولٹ نمبر کے علاوہ شاعر کا ایک معترکۃ الآرا کام 'ہم عصر اردو نمبر' کا 1240 صفحات کا ضخیم نمبر ہے۔ جس میں اردو ادب کی تاریخ کی گم شدہ کہانیاں مل جاتی ہیں۔

'شاعر' کو ایک ہی خاندان کی تین نسلوں نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ سیماب اکبرآبادی کے بعد منظر صدیقی، اعجاز صدیقی، تاجدار احتشام صدیقی، افتخار امام صدیقی، ناظر نعمان صدیقی اور حامد اقبال صدیقی نے 'شاعر' کی شاندار اردو کی ادبی صحافت کو سنبھال کر رکھا جو ایک اردو کی ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔

■

Ahmed Sohail, 225, Trail Hollow
Lane Palestine, TX 75801,USA

چودھری ابن النصیر

انور سدید
احوال و آثار

انور سدید نے اوائل عمری سے ہی ادب کو زندگی کا ایک لازمی حصہ سمجھ رکھا تھا اور زندگی کی ایک بھرپور معنوی سرگرمی... ان کی زندگی کا دوسرا نام ہی ادبی سرگرمی رکھا جاسکتا ہے۔ ادب سے ان کی گہری وابستگی کم و بیش پچاس برسوں پر محیط ہے۔ لکھنا اور مدام لکھنا، پڑھنا اور خوب پڑھنا، انھوں نے اپنی زندگی کا اہم مشغلہ بنا رکھا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ ایک لکھنے والا کسی ادب کے ہر عہد میں ایک قابل ذکر ادبی سرگرمی بنا رہا ہو اور کبھی کوئی ایسا وقفہ نہ پڑا ہو جب انور سدید کا نام رسالوں اور کتابوں میں نئی نسل کے ساتھ نظر نہ آرہا ہو۔ انھوں نے اپنی ادبی تخلیقی زندگی کا آغاز بچوں کے رسائل میں کہانیاں/ مضامین لکھنے سے کیا۔ ان کا پہلا مضمون بچوں کے رسالہ 'گلدستہ' لاہور میں شائع ہوا جس کے مدیر لالہ رگھوناتھ سہائے تھے۔ پھر افسانے لکھنے لگے اور فلمی رسائل چترا ویکلی، گورو گھنٹال، اور اسٹار سے گزر کر بیسویں صدی، چمنستان، اور کہکشاں تک پہنچے۔ ان رسالوں سے شہرت ملی تو پھر آہستہ آہستہ اس دور کے اہم ادبی رسالوں نیرنگ خیال، ہمایوں اور آجکل میں شائع ہونے لگے۔ وزیر آغا نے جب 1966 میں مولانا صلاح الدین احمد (مدیر ادبی دنیا، لاہور) کی یاد میں رسالہ 'اوراق' جاری کیا تو انھوں نے انور سدید کو باضابطہ تنقید لکھنے کی طرف مائل کیا۔ دسمبر 1988 میں محکمۂ آبپاشی پنجاب سے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے سبکدوشی کے بعد انھوں نے باقاعدہ صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ وہ روزنامہ 'جسارت' لاہور میں دید و بازدید نام سے ہفتہ وار ادبی کالم 1983 سے برسوں لکھتے رہے۔ روز نامہ حریت، کراچی میں 1985 سے 1989 تک، پھر روزنامہ مشرق میں 1989 تا 1999 تک دونوں میں سدیدیات نام کے کالم لکھے ہفت روزہ زندگی، لاہور میں عالم تمام نام کے کالم 1991 سے 1995 تک لکھے۔ روزنامہ خبریں، لاہور میں گفتنی نام سے کالم 1995 سے کئی برسوں تک لکھتے رہے۔ قومی زبان، کراچی میں ماہانہ کالم 'کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ دی اسٹیٹس مین، کراچی (1986 تا 1990) اور دی پاکستان ٹائمز، لاہور (1993 تا 1995) میں انگریزی میں ادبی کالم بھی لکھے۔ روزنامہ 'نوائے وقت' کے چیف ایڈیٹر مجید نظامی کی گذارشات پر اس ادارے میں شمولیت اختیار کرلی لیکن جولائی 2003 میں یہاں سے بھی سبکدوش ہوگئے لیکن مجید نظامی صاحب نے انھیں اپنے سے علیحدہ نہیں کیا اور گھر پر رہ کر ہی کام کرنے کی اجازت دی۔ نوائے وقت کے ساتھ ان کا تعلق آخری دم تک قائم رہا۔

معروف ادیب، نقاد، انشائیہ نگار، کالم نگار اور شاعر انور سدید کی پیدائش دسمبر 1928 کو ضلع سرگودھا کے ایک دورافتادہ علاقہ میانی، تحصیل بھلوال میں ہوئی تھی۔ ان کا اصلی نام محمد انوارالدین تھا۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان کے اسکولوں میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ ہائی اسکول، سرگودھا سے فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ آگے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے ان کے والدین نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ کرایا اور انھیں سائنس کی تعلیم حاصل کر کے انجینئر بننے کی تلقین کی۔ انھوں نے گورنمنٹ انجینئرنگ اسکول، رسول (منڈی بہاؤالدین)) سے اگست 1948 میں ڈپلومہ کورس کیا اور اول آئے اور طلائی تمغہ حاصل کیا۔ بعد ازاں انھیں 1949 میں محکمۂ آبپاشی میں بحیثیت سب انجینئر ملازمت مل گئی جو 1960 تک جاری رہی پھر 1961 سے 1977 تک ایس ڈی او کی حیثیت سے محکمۂ آبپاشی، پنجاب میں ملازمت کی۔ 1977 سے 1988 تک اسی شعبے میں ایگزیکیٹو انجینئر کے عہدے پر ترقی ملی۔ حالانکہ ان ملازمتوں سے پہلے انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمۂ آبپاشی میں لوئر گریڈ کلرک کی حیثیت سے ہی کیا تھا۔ وہ کئی برسوں کے بعد 1966 میں سول انجینئرنگ ڈگری کورس کا امتحان اے ایم انسٹی ٹیوٹ آف انجینئر ڈھاکا سے پاس کیا۔ انور سدید کو ادب سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا اپنی اس زندگی سے مطمئن تو تھے لیکن اردو ادب میں بھی کچھ کر گزرنے کی ان کی اندرونی روحانی طاقت اور بے پایاں دھن نے ہمیشہ متحرک رکھا۔ وہ اپنی شناخت ادب کے ایک سنجیدہ طالب علم کے طور پر کرانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دوبارہ تعلیم کی طرف رجوع ہوئے اور ایف اے،

بی اے اور ایم اے کے امتحانات ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے دیے۔ ایم اے میں فرسٹ کلاس حاصل کی اور بیرونی طلبا میں ایک ریکارڈ قائم کیا۔ سر میں سودا ہو تو سفر کہاں رکتا ہے، انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے بھی ڈول ڈال دیا اور 'اردو ادب کی تحریکیں' جیسا وسیع موضوع منتخب کیا اور اس کے لیے وزیر آغا کو اپنا نگراں اور رہنما بنایا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے اس مقالے کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کو ممتحن مقرر کیا گیا۔ دونوں نے انور سدید کے اس تحقیقی کام کو جی بھر کر سراہا اور اسی وقت یہ بات کہہ دی تھی کہ آنے والے زمانے میں یہ مقالہ طلبا کے لیے رہنما کتاب کی حیثیت اختیار کرے گا۔ اور یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی۔ انور سدید نے ساٹھ سے زیادہ کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں۔ درجنوں کتابوں کے ترجمے کیے۔ پندرہ سو سے زیادہ کتابوں پر تبصرے لکھے۔

انور سدید نے اپنی زندگی میں ادب کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا، حالانکہ یہ محاورہ عام سا ہو گیا ہے لیکن یہ ان پر سو فیصد صادق آتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے انھیں ایک خط میں لکھا تھا:

''پہلے مجھے یہ بتایئے کہ آپ کھاتے، پیتے اور سوتے کس وقت ہیں؟ کیونکہ جس رفتار سے آپ کی معلومات افزا اور نادر کتابیں شائع ہو رہی ہیں ان کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ آپ کے نظام الاوقات میں کھانے پینے اور سونے کے لیے وقت نظر نہیں آتا۔ بسیار نویسی اور نغز نگاری کا اجتماع اگر کہیں دیکھنا ہو تو وہ انور سدید کے پاس ہے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ انور سدید علم و ادب کا سمندر تھے انھوں نے جس تواتر سے لکھا، جتنا کچھ لکھا اور ادب کو جس قدر مالا مال کیا وہ اردو کے گنتی کے ناقدوں کے حصے میں آیا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے لکھنا ان کی زندگی کا مقصد بن گیا تھا، ان کا فطری ذوق بن گیا تھا جس کی نشو و نما میں انھوں نے بے تحاشا کتابوں، رسالوں، جریدوں کا مطالعہ کیا۔ اپنے اندر ایسی ناقدانہ بصیرت پیدا کی کہ ان کی تحریروں کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ ان کا لب و لہجہ ان کے تخصص کا اہم وسیلہ بنا۔ سلیم اختر نے کبھی بڑی اچھی بات کہی تھی کہ اپنے نام کی مناسبت سے انور سدید قول سدید کے قائل ہیں۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر دوٹوک الفاظ اور غیر مفاہمتی انداز میں بات کرنے کے خوگر ہیں۔ سلیم اختر نے جو کہا سو کہا لیکن حقیقت یہ ہے کہ انور سدید نے تعریف و تحسین اور کسی صلے کی پروا کیے بغیر اپنے ادبی سفر کو کسی پڑاؤ پر روکے/رکے بغیر جاری و ساری رکھا۔ وہ ادب میں حق گوئی کے قائل تھے اور ہمیشہ ادب کی پرکھ میں متوازن، صاف ستھرے ادبی میزان و محک سے کام لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب انسانی ذہن کا ایک عظیم تخلیقی کارنامہ ہے۔ ادب زندگی کی تنقید ہے، زندگی کا اظہاریہ ہے جس کا اصل مرکز و محور انسان ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے مغربی افکار و نظریات کے حوالے سے کیا اچھی بات کہی ہے، آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

'اردو ادب کی تحریکیں' ایک ایسی حوالہ جاتی کتاب ہے جس کی تصنیف میں انور سدید نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ انور سدید کی تمام کتابوں میں اس کتاب کو ان معنوں میں اولیت حاصل ہے کہ اس کے ہندوستان اور پاکستان میں دس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کی مختصر تاریخ بھی ان طلبا کے لیے ایک اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے جو ایک نظر میں اردو ادب کی مختصر تاریخ جاننے کے شائق ہیں۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ایک ایسا بھرپور کام ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جب ادب کو انسان کی تہذیبی رفعت کا وسیلہ قرار دیا جاتا ہے تو اس کے بین السطور بھی ادب کا ایک واضح مقصد موجود ہوتا ہے۔ یوں بھی انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کے ہر عمل میں ذاتی یا اجتماعی بہبود و نمود کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پوشیدہ ہوتا ہے۔ انسانی فطرت کے اس پہلو سے بینتھم (Bainthem) نے اکتساب مسرت کا اصول وضع کیا، بعد میں گرین (Greene) نے مسرت کو فرد کی ذات سے وابستہ کر دیا۔ انسانی فطرت کے اس روشن پہلو پر غور کرنے سے پہلے جو چند نادر جزئیات سامنے آتی ہیں۔ انھیں میکڈوگل (Mcdougal) نے پانچ تصورات سے تعبیر کیا ہے۔ انصاف کا تصور، افادیت کا تصور، ذات کا تصور، صداقت کا تصور، جمالیات کا تصور، بادی النظر میں یہ تمام تصورات انسانیت کی تشکیل و تعمیر میں اساسی کردار ادا کرتے ہیں۔ چونکہ ان کے بغیر کوئی انسانی عمل مکمل نہیں، بالواسطہ طور پر ان کی حیثیت نصب العین کی ہے۔ فنون لطیفہ میں سے ادب ایک ایسا آزاد عمل ہے جو زندگی کے کسی جزو کو گرفت میں نہیں بلکہ اس کے ''کل'' کو دائرہ نور میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔'' (بحوالہ: اردو ادب کی تحریکیں)

تاریخ ادب سے دلچسپی انور سدید کے تحقیقی اور فکری رویوں سے آگہی کی عمدہ مثال ہے۔ 'اردو ادب کی تحریکیں' ایک ایسی حوالہ جاتی کتاب ہے جس کی تصنیف میں انور سدید نے خون پسینہ ایک کر دیا۔ انور سدید کی تمام کتابوں میں اس کتاب کو ان معنوں میں اولیت حاصل ہے کہ اس کے ہندوستان اور پاکستان میں دس سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح اردو ادب کی مختصر تاریخ بھی ان طلبا کے لیے ایک اہم کتاب کا درجہ رکھتی ہے جو ایک نظر میں اردو ادب کی مختصر تاریخ جاننے کے شائق ہیں۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ایک ایسا بھرپور کام ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ادبی رسالوں کی تاریخ لکھنے میں جتنی محنت اور تحقیق درکار ہے، انور سدید ان سب مراحل سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ سیر حاصل اور پر مغز تحقیقی کاموں کے ضمن میں ہی ان کی اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب میں سفر نامہ اور اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش ایسی کتابیں ہیں جن پر انھوں نے اپنا سارا تحقیقی علم، تخلیقی صلاحیت اور تنقیدی بصیرت کو داؤ پر لگا دیا، اب یہ کتابیں آنے والی نسلوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ یہ کتابیں یونیورسٹی میں الگ الگ تحقیقی موضوعات کے تحت پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے اگر قبول کی جائیں تو زمانہ ان سے بہتر تحقیق اور سامنے نہیں لا سکتا۔ انور سدید کی سب بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ ادب کو انھوں نے کبھی پاکستان تک محدود نہیں رکھا۔ ان کے نزدیک اردو ادب کا مطلب پوری دنیا میں لکھے جانے والے اردو ادب سے رہا ہے۔ انشائیہ سے بے پناہ دلچسپی نے اردو ادب میں انشائیہ نگاری جیسی کتاب کی تصنیف کرا دی۔ اس طرح اردو ادب میں سفر نامہ میں جو تحقیقی انداز نظر اپنایا گیا ہے وہ لائق رشک ہے۔ اس میں انھوں نے صنف سفر نامہ سے فنی بحث تو کی ہے ساتھ ہی قدیم سیاح اور سفر نامے کے تذکرے سے ابتدا کرتے ہوئے 1987 تک کے سفر ناموں کا تذکرہ کیا ہے۔ حج کے سفر نامے، آزادی سے پہلے کے ہندوستان اور پاکستان کے سفر نامے، اردو کے منظوم سفر نامے، مزاح نگاروں کے سفر نامے، دوسری زبانوں کے سفر ناموں کے اردو تراجم غرض کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جس کا سفر نامہ سے تعلق ہو اور انور سدید نے چھوڑ دیا ہو۔ یہ کتاب سفر نامے کی تاریخ بھی ہے اور اس کا تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی بیان بھی۔

افسانہ انور سدید کا محبوب صنف ادب رہا ہے کیونکہ انھوں نے باقاعدہ اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز ہی اس صنف

سے کیا تھا۔ اس میدان میں ان کے جو کارنامے سامنے آئے ہیں ان سے ان کی تیز نگاہی اور دور اندیشی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش ایک ایسا موضوع تھا جس پر انور سدید نے 1975 میں ایک مختصر مقالہ لکھا تھا لیکن انھیں یہ موضوع اس قدر زرخیز نظر آیا کہ ایک اپنی پوری کتاب لکھ دی جس میں منشی پریم چند سے مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں مشمولہ دیہات کو متعدد زاویوں اور جہتوں سے پیش کر دیا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو مکمل کرنے کی تحریک دینے والوں میں اردو کے ایک سرکردہ ادیب و نقاد ساحل احمد (سابق صدر، شعبۂ اردو، ایونگ کرسچن کالج، الہ آباد۔ حال مقیم دہلی) کو اولیت حاصل ہے۔ انور سدید نے ان کے نام انتساب کرتے ہوئے لکھا ہے ''ساحل احمد کے نام جن کی محبت اور اصرار سے یہ کتاب تکمیل کو پہنچی''۔ اردو افسانے کے حوالے سے دوسری اہم کتاب 'اردو افسانے کی کروٹیں' ہے جس میں اردو افسانہ اور افسانہ نگاروں پر مختلف نوعیت کے مضامین ہیں۔ افسانہ نگاروں میں رحمان مذنب، جمیلہ ہاشمی، رشید امجد، فرخندہ لودھی، غلام الثقلین نقوی، رام لعل، عرش صدیقی، قدرت اللہ شہاب، سلطان جمیل نسیم، اشفاق احمد اور غلام عباس پر مضامین ہیں۔ چونکہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 1991 میں ہی چھپا تھا اس لیے اس کے بعد کے افسانہ نگاروں یا اردو افسانہ نگاروں پر مضامین نہیں ہیں جبکہ انور سدید نے کئی دوسرے اہم افسانہ نگاروں مثلاً مسعود مفتی، ہر چرن چاؤلہ، سید انور، جوگندر پال اور کئی دوسروں پر بھی مضامین لکھے ہیں جو ان کے دوسرے مجموعوں میں شامل ہیں۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ انور سدید صاحب نے اس کتاب کا ذاتی نسخہ دستخط کے ساتھ 12 مئی 1991 کو مجھے بھیجا تھا جو میری لائبریری میں محفوظ ہے۔ بات افسانے کی ہی چل رہی ہے تو ان کی مرتب کردہ کتاب 'مختصر اردو افسانہ: عہد بہ عہد' کا ذکر لازمی سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب پریم چند سے آصف فرخی تک کے 35 افسانہ نگاروں کے افسانوں کا انتخاب ہے۔ تقریباً ستر صفحوں کا طویل مقدمہ شامل کتاب ہے جس میں انھوں نے مختصر اردو افسانے کے تعارف و تفصیل میں اپنی جس ناقدانہ بصیرت، علمی قابلیت اور فنکارانہ صلاحیت کا استعمال کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ مثلاً غیاث احمد گدی کے بارے میں جہاں اور بہت کچھ لکھا ہے، یہ بھی لکھا ہے:

''قاری (غیاث احمد) گدی کو پڑھتے ہوئے زندگی کی بعض ایسی پرتوں سے آشنا ہوتا ہے جو پہلے اس کے

سوانحی کوائف

اصل نام: محمد انوار الدین　　**قلمی نام:** انور سدید

پیدائش: 4 دسمبر 1928 قصبہ میانی، تحصیل بھلوال، سرگودھا پاکستان　　**وفات:** 20 مارچ 2016 لاہور

تعلیم: سول انجینئرنگ ڈگری کورس 1966 انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز پاکستان ڈھاکہ، ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی اوّل بدرجہ اوّل 1، طلائی تمغہ، 2 بابائے اردو طلائی تمغہ، پی، ایچ، ڈی، پنجاب یونیورسٹی مقالہ اردو ادب کی تحریکیں

ملازمت: ایگزیکیوٹیو انجینئر محکمہ آب پاشی سے مدت ملازمت پوری کر کے ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔

کالم نگاری: روزنامہ مشرق لاہور ہفتہ وار ادبی کالم سدیدیات 1989 تا 1999، روزنامہ جسارت لاہور ہفتہ وار ادبی کالم دید و باز دید 1983 تا 1990 ہفت روزہ زندگی لاہور حالات جہاں کا کالم عالم تمام 1991 تا 1995، روزنامہ حیرت کراچی ہفتہ وار ادبی کالم سدیدیات 1985 تا 1989، ماہنامہ قومی زبان کراچی ماہانہ کالم کچھ وقت ہندوستانی کتابوں کے ساتھ 1982 تا حال، روزنامہ خبریں لاہور کالم گفتنی 1995 تا 1998، روزنامہ نوائے وقت کالم گفتنی 1999 تا 2016

انگریزی کالم نگاری: پاکستان ٹائمز لاہور ہفتہ وار ادبی کالم 1993 تا 1995، دی اسٹیٹس مین کراچی: ہفتہ وار ادبی کالم 1986 تا 1990۔

اعزازات: کتاب اقبال کے کلاسیکی نقوش رائٹرز گلڈ ایوارڈ داؤد ادبی انعام، مقالہ اردو ادب میں حج ناموں کی روایت نقوش ایوارڈ، کتاب اردو ادب کی تحریکیں ہجرہ ایوارڈ اکادمی ادبیات پاکستان، بہترین کالم نگاری آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹ a.p.n.s ایوارڈ، صدارتی تمغۂ امتیاز 14 اگست 2008 کو ادبی خدمات پر عطا کیا گیا۔

تصنیفات و تالیفات: (تعداد کتب: 88)، **اقبالیات:** اقبال کے کلاسیکی نقوش پہلا ایڈیشن 1977 دوسرا ایڈیشن 1989، اقبال شناسی اور ادبی دنیا 1989، اقبال شناسی اور اوراق 1989، **تحقیق:** اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش 1983، اردو ادب میں انشائیہ 1985، اردو ادب میں سفرنامہ 1989، ادبی تاریخ اردو ادب کی تحریکیں، تین ایڈیشن 1985، اردو ادب کی مختصر تاریخ 1990 تین ایڈیشن، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ 1992، **کلاسیکی شعرا پر کتب:** میر انیس کی اقلیم سخن 1985، غالب کا جہاں اور 1986، میر انیس کی قلمرو ترمیم و اضافہ شدہ 1989، **تنقیدی کتب:** فکر و خیال 1971، اختلافات 1975، کھردرے مضامین 1988، نئے ادبی جائزے 1989، شمع اردو کا سفر 1989، برسبیل تنقید 1990، موضوعات 1991، اردو افسانے کی کروٹیں 1992، اردو نظم کے ارباب اربعہ 2007، خطوط کے آئینے میں 2007، مشفق خواجہ ایک کتاب 2008، **شخصیات پر کتب:** مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ بہ اشتراک ڈاکٹر وزیر آغا 1990، وزیر آغا ایک مطالعہ 1983، شام کا سورج 1989، پاکستان کا ایک بطل جلیل حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی، مولانا صلاح الدین احمد شخصیت اور فن 2007، بانو قدسیہ شخصیت اور فن 2008، پروفیسر غلام جیلانی اصغر شخصیت اور فن زیر اشاعت، غلام الثقلین نقوی شخصیت اور فن زیر اشاعت، فرخندہ لودھی، شخصیت اور فن زیر قلم **انشائیے:** ذکر اس پری وش کا 1982، آسمان میں پتنگیں 1994، **طنز و مزاح:** غالب کے نئے خطوط 1982، دلاور فگاریاں 1990، **خاکہ نگاری:** محترم چہرے 1989، قلم کے لوگ 1999، ادیبانِ رفتہ 2007، زندہ لوگ 2008، تالیفات آخری نظمیں راجہ مہدی علی خاں 1976، بہترین ادب 1968، بہترین ادب 1990، رادھے شیام کے نام 1970، بہترین نظمیں 1976، بہترین نظمیں 1978، جدید اردو شاعری بہ اشتراک ڈاکٹر وزیر آغا 1980، وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام 1985، مکالمات وزیر آغا سے انٹرویوز 1992، سخن ہائے گسترانہ مشفق خواجہ کے کالم 2007، سفرنامہ اپنے وطن میں روزنامہ جسارت میں چھپا، دلی دور نہیں ماہنامہ تخلیق لاہور اور کتابی صورت میں چھپا۔ تراجم زلفی، بھٹو آف پاکستان والپورٹ قومی ڈائجسٹ لاہور میں چھپا۔ کشمیر سرد جہنم، گورنر جگ موہن قومی ڈائجسٹ لاہور میں چھپا، شہزادی ڈیانا کی محبت قومی ڈائجسٹ لاہور میں ہی چھپا، فریب کار فریڈرک فورساتھ، مائی فیوڈل لارڈ تہمینہ درانی زندگی، لاہور میں چھپا۔ ایک بے عنوان کتاب غلام اکبر قومی ڈائجسٹ لاہور میں چھپا۔ مون اسٹون ویکلی کالمز قومی ڈائجسٹ لاہور۔ جائزے نئے ادبی جائزے 1988، ادب کہانی 1996، ادب کہانی 1997، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ 2001، جائزہ اردو ادب 1998 تا 2008۔

ادبی رسائل میں گوشے: ماہنامہ 'تخلیق' لاہور، مدیر: اظہر جاوید، ماہنامہ 'جدید ادب' خان پور مدیر: حیدر قریشی، سہ ماہی 'اوراق' لاہور مدیر: ڈاکٹر وزیر آغا، ماہنامہ 'کوہسار' بھاگل پور بھارت مدیر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ماہنامہ 'چہار سو' راولپنڈی مدیر: گلزار جاوید، سہ ماہی 'ارتکاز' کراچی، مدیر: راغب شکیب، سہ ماہی 'روشنائی' کراچی، مدیر: احمد زین الدین، ماہنامہ 'اردو زبان' انور سدید نمبر، مدیر: پرویز بزمی، ایم ڈی شاد۔

یونیورسٹیوں میں ڈاکٹر انور سدید کے فن و شخصیت پر کام: (1) پنجاب یونیورسٹی، ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات، ایم اے کا مقالہ از محمد نعیم بزمی (2) گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، ڈاکٹر انور سدید کی تنقید، ایم فل کا مقالہ از شائستہ پرویز خان (3) گورکھپور یونیورسٹی بھارت، ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات، پی ایچ ڈی کا مقالہ از ڈاکٹر سلطان محمد (4) کرم دم جستجو انور سدید کے فن اور شخصیت پر مقالات کا مجموعہ پروفیسر سجاد نقوی (5) انور سدید، شخصیت اور فن اکادمی ادبیات پاکستان کے سلسلۂ پاکستانی ادب کے معمار کی کتاب زیر اشاعت۔

بحوالہ اردو ویب ڈاٹ آرگ

مشاہدے میں اتنی باریک بینی اور ایسی داخلی ژرف نگاہی سے نہیں آتی تھی۔انھوں نے اسطوری افسانے کو زندگی کی موجودہ فضا میں رچانے بسانے کے تجربے کیے۔ معنی کو مختلف ابعاد پہنانے کے لیے دیومالا کو استعمال کیا اور اپنے آخری دور میں علامت کا سہارا بھی لیا۔اس کا افسانہ 'نارومنی' اس کی ایک اچھی مثال ہے جو قدیم کا انسلاک جدید کے ساتھ کرتا اور کہانی کے داخلی عمل کو قائم رکھتا ہے۔''

اردو افسانہ ان کا خاص موضوع تو تھا ہی جس پر انھوں نے بہت لکھا۔کئی صد افسانوی مجموعوں پر تبصرے کیے اور پچاسوں افسانہ نگاروں کے فن پر مضامین قلم بند کیے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جدید ادب سے دلچسپی رکھنے والے اس شخص کو کلاسیکی ادب سے بھی اتنا ہی لگاؤ ہے۔ میر انیس پر ان کی دو کتابیں (میر انیس کی اقلیم سخن، میر انیس کی قلم رو) اور غالب پر 'غالب کا جہاں او' اس کا زندہ ثبوت ہیں۔میر انیس کو انھوں نے ایک منفرد اور الگ زاویہ نظر سے دیکھا اور جانچا ہے بلکہ سمجھا ہے۔انیس کی شاعری پر لکھنا کوئی آسان کام نہیں، بھرپور مطالعے کے بعد انیس پر سیر حاصل لکھنا انور سدید کا ہی کمال رہا ہے۔ غالب کو بھی انھوں نے بالکل مختلف انداز سے پیش کیا ہے اور غالب پر لکھنے کا جو ایلفیشن بنا ہوا تھا/ ہے اس بت کو انھوں نے پورے طور پر توڑنے کی کوشش کی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ غالب جیسے مشکل شاعر کے یہاں نئے جہاں معنی کی تلاش و تجزیہ میں ان کا بھرپور مطالعہ کام آیا ہے۔ غالب کی نو دریافت انور سدید کا ایک کارنامہ ہے۔اسی طرح علامہ اقبال پر ان کی کتاب اقبال کے کلاسیکی نقوش جس پر ان کو پاکستان کا داؤد ادبی انعام بھی مل چکا ہے،ان کتابوں سے بالکل الگ ہے جو بیشتر عمومی نوعیت سے اقبال کو موضوع بنا کر لکھا جاتا رہا ہے۔ وزیر آغا کی صحبت ان کی زندگی کا خوشگوار واقعہ رہا ہے۔ وزیر آغا نے ان کے اندر معیاری ادب کے مطالعے کا صحیح ذوق پیدا کیا اور فکری جہت سازی کی۔یہی سبب ہے کہ انھوں نے علامہ اقبال کی شاعری کے ان نقوش کی بازیافت کی ہے جن تک کئی ماہر اقبالیات کی رسائی بھی نہ ہو سکی۔اقبال پر انھوں نے دو کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ رسالہ ادبی دنیا میں اقبال پر شائع ہونے والے مضامین کو یکجا کر کے 'اقبال شناسی اور ادبی دنیا' کے نام سے ترتیب دیا، اسی طرح اوراق ، لاہور میں اقبال پر شائع ہونے والے مضامین کو 'اقبال شناسی اور اقبال' کے نام سے یکجا کیا۔ یہ دونوں کتابیں اقبال پر اعلیٰ پایے کے مضامین کا مجموعہ ہیں۔'ادبی دنیا' کے مولانا صلاح الدین احمد کے علمی و ادبی کارناموں سے وہ حددرجہ متاثر تھے۔مولانا صلاح الدین کا شمار اردو ادب کی ان اہم ادبی شخصیتوں میں ہوتا ہے جو ادب کو حسن، ضمیر اور صداقت کا مظہر تصور کرتے تھے۔ صلاح الدین احمد کا فسوں انور سدید پر اسکول کے زمانے سے چڑھا تھا۔ ان پر تین کتابیں سامنے آئیں۔مولانا صلاح الدین احمد۔ایک مطالعہ اور دوسری کتاب صلاح الدین احمد :فن اور شخصیت۔ اول الذکر کتاب پر انور سدید نے جم کر محنت کی۔ یہ مختلف عنوانات کے تحت مقالات کا مجموعہ بھی ہے اور ایک مربوط کتاب بھی۔ صلاح الدین احمد کے تمام احوال وکوائف جمع کر کے تیسری کتاب ''کتابیات :صلاح الدین احمد کے نام سے لکھی گئی جس میں ان کی تحریروں کا تفصیلی اشاریہ بھی پیش کیا گیا۔

انور سدید کی دلچسپی انشائیہ نگاری میں بھی خوب رہی حالانکہ جب انھوں نے اپنا پہلا انشائیہ 'اونگھنا' لکھا تھا تو غلام حسین اظہر نے اسے طنزیہ مزاحیہ مضمون کہہ کر انشائیہ کے مدار سے خارج کر دیا تھا لیکن یہی انشائیہ جب 'نیرنگ خیال' میں شائع ہوا تو وزیر آغا نے اسے خود انکشافی کے زاویوں سے 'انشائیہ' قرار دیا۔اب پھر کیا تھا۔ان کا اسپ قلم چل پڑا اور کئی انشائیے لکھ ڈالے۔جن کے دو مجموعے ''ذکر اس پری وش کا، اور 'آسمان میں پتنگیں' تیار ہو گئے۔ طنز و مزاح کے عناصر تو ان کے مزاج میں تھے، اس سے بھی وہ خود کو دور نہ رکھ سکے اور کئی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں لکھیں جو دو مجموعوں 'غالب کے نئے خطوط (پیروڈی)'، اور 'دلا ورفگاریاں' میں شامل ہیں۔خاکہ نگاری کا فن بھی ان کے ہاتھ سے دور نہ رہا اور مختلف احباب پر کئی اہم خاکے لکھے جن کے تین مجموعے 'محترم چہرے'، 'قلم کے لوگ' اور 'ادیبانِ رفتہ' شائع ہوئے۔ ان کتابوں کے عنوانات سے ہی اندازہ ہو جائے گا کہ ان میں کن لوگوں پر انھوں نے خاکے لکھے ہوں گے۔مختلف موضوعات پر کتابوں کو مرتب کرنے کے کام سے ان کو بڑی رغبت رہی۔کئی انتخابات شائع کیے لیکن وزیر آغا پر، وزیر آغا کے خطوط، وزیر آغا سے انٹرویو کا مجموعہ 'مکالمات' وزیر آغا پر مضامین کا مجموعہ 'شام کا سورج' اہم ہیں۔وزیر آغا پر ان کی اپنی ایک کتاب ہے جو 'وزیر آغا: ایک مطالعہ' کے نام سے چھپی ہے۔

ادبی حلقوں میں انور سدید کی مقبولیت کا ایک اہم سبب ان کا ادبی جائزے کا سلسلہ ہے۔میرے علم کے مطابق ان کا پہلا جائزہ فروری 1968 میں 'پاکستان میں اردو افسانے کے بیس سال' اوراق ، لاہور میں شائع ہوا تھا پھر اسی رسالے میں مارچ اپریل 1972 کے شمارہ میں ان کا جائزہ' 1971 کے افسانے' شائع ہوا۔ پورے اردو ادب کا سالانہ جائزہ انھوں نے 1973 سے لینا شروع کیا۔ سالانہ ادبی جائزہ ان کا ایک اہم کارنامہ رہا ہے۔ پہلے یہ ادبی جائزے زیادہ طول نہیں ہوتے تھے لیکن بعد کے برسوں میں تو طویل جائزوں نے ان کو بے حد مقبول بنا دیا۔ 1996 سے الگ الگ صنف کے تحت جائزوں کا سلسلہ کتابی شکل میں سامنے آیا۔ سالانہ ادبی گوشوارہ پیش کرنے کا یہ کام انھوں نے سید عبداللہ سے سیکھا جو اکثر ہمایوں یا ادبی دنیا میں سالانہ ادبی جائزہ پیش کرتے تھے حالانکہ 1945 کے آس پاس ممتاز شیریں بھی یہ کام دل جمعی سے کرتی تھیں۔

جنوری 1966 میں جب 'اوراق' کا پہلا شمارہ شائع ہوا تھا اسی زمانے سے انور سدید کتابوں پر تبصرہ لکھنے کے لیے مامور کیے گئے تھے۔اور اب تک پندرہ سو کتابوں پر طویل مختصر تبصرے شائع ہوئے۔اپنے آخری دنوں تک تبصرہ لکھنے/ املا کرانے کا کام کرتے رہے۔ وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ اوراق نے انھیں اظہار کی پوری آزادی عطا کی اور بے شمار موضوعات پر لکھنے کی ترغیب دی۔ان کی تبصرہ و جائزہ نگاری بھی اوراق کی تحریک سے شروع ہوئی۔'رسالہ'اوراق' نے ان کی پوری ادبی دنیا میں دوستوں کا وسیع حلقہ فراہم کیا۔

انور سدید کو تخلیقی ادب سے لگاؤ تھا۔انھوں نے شاعری بھی خوب کی اور بہت کچھ چھپایا اور بہت کچھ چھپایا۔لیکن شاعری میں ان کو وہ مقام نہ مل سکا جس کے وہ متمنی تھے۔مشفق خواجہ نے ایک جگہ لکھا ہے:

''تنقید، تحقیق، انشائیہ، طنز و مزاح یہاں تک کہ شاعری... آخر کون سی صنف ادب ہے جس میں انور سدید کے کمالات کا اظہار نہ ہوا ہو۔مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ انور سدید ایک فرد کا نام نہیں، کئی افراد کا 'مجموعی نام' ہے جو ادب کے الگ الگ شعبوں میں سرگرم عمل ہیں اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ۔''

انور سدید نے اردو ادب میں خود کو غرق کر دیا تھا اور کوئی بھی موضوع ان کی دسترس سے دور نہ تھا۔وہ ادب کی تمام سرگرمیوں اور پیش رفت سے خود کو باخبر رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔طویل علالت کے بعد 20 مارچ 2016 بروز اتوار وہ سرگودھا میں وفات پا گئے۔ادب سے اتنی گہری وابستگیوں کا آدمی اب کہاں ملنے کو۔

■

Choudhry Ibnun Naseer
9 Kanpur Road, Allahabad - (UP)

منور حسن کمال

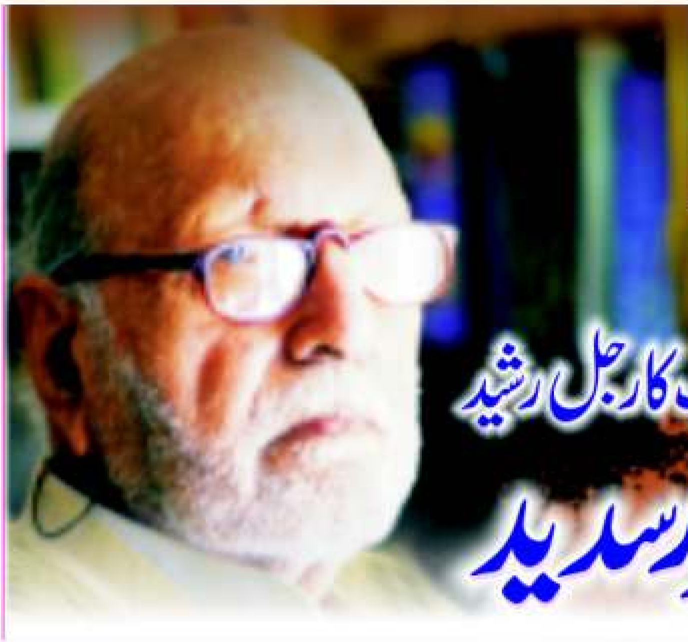

ادب کا رجل رشید
انور سدید

ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کے مختلف رنگ اور مختلف پہلو ہیں۔ وہ زندگی بھر ایک مشین کی طرح لکھتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے ادب کی طرف رغبت اور پھر صحافت کی خدمت تک ان کی زندگی کا کوئی گوشہ خالی نظر نہیں آتا۔ انور سدید کی عملی زندگی کا آغاز 1947 میں محکمہ آبپاشی میں -/35 روپے ماہانہ تنخواہ سے ہوا۔ بعد ازاں سول انجینئرنگ کا امتحان پاس کرکے 1948 میں محکمہ آبپاشی میں ہی میٹر کے عہدے پر مامور ہوگئے۔

انور سدید کو کہانیاں سننے کا شوق اپنی والدہ محترمہ کی سنائی گئی قصص الانبیاء کی کہانیوں سے ہوا۔ ذرا بڑے ہوئے تو اپنے بھائی معراج الدین کی 'ہوم لائبریری' سے بغیر اجازت کے راشد الخیری، پریم چند، خواجہ حسن نظامی، ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر معروف ادیبوں کے ناول اور افسانے پڑھ کر اپنے ادبی شوق کو پورا کرتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید کا تعلق ایک نومسلم راجپوت خاندان سے ہے۔ پہلے یہ خاندان سری نگر میں رہتا تھا اور ہندو مذہب سے وابستہ تھا۔ انور سدید کے خاندان کے ایک فرد میاں بشیر احمد کے مطابق آزادی سے قبل سری نگر سے ایک ہندو شجرہ نویس سرگودھا (پاکستان) آیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ان کے خاندان کی جنم پتریاں بھی تھیں۔ اس کی روایت کے مطابق اٹھارہویں صدی کے آخر میں ان (انور سدید) کے خاندان کے ایک بزرگ نے کشمیر کے ایک ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کرلیا۔ ڈوگرہ راج میں یہ خاندان نقل مکانی کرکے گجرات کے راستے بھیرو مہانی پہنچا اور پھر یہیں آباد ہوگیا۔ (پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر انور سدید۔ شخصیت اور فن، پروفیسر سجاد نقوی، ص 13، اکادمی ادبیات پاکستان مطبوعہ 2010)

بھیرو مہانی قصبہ میں ہی 4 دسمبر 1928 کی ایک پرکیف اور نیک ساعت میں محمد انور الحق جو بعد میں انور سدید کے قلمی نام سے مشہور ہوئے، پیدا ہوئے۔ روایتی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خاں کے اسکولوں میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دلچسپی نہ ہوتے ہوئے بھی والدین کی خواہش کے مطابق انسان خود کو ڈھالنے، بنانے اور سنوارنے میں مصروف ہوجاتا ہے اور اپنی دلچسپی، رجحان اور طبعی میلان کو پس پشت رکھنا پڑجاتا ہے۔ ایسا ہی انور سدید کے ساتھ بھی ہوا۔ والدین کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا انجینئر بنے، چنانچہ وہ انجینئر بنے اور اپنے ادبی رجحانات اور میلانات کو دبائے زندگی کے پیچ و خم سنوارنے میں مصروف ہوگئے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا بچپن سے ہی انھیں افسانوی ادب نے اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ انھوں نے محکمہ آبپاشی میں ملازمت کے دوران بھی تعلیمی سلسلے کو برقرار رکھا... اور فاصلاتی تعلیمی نظام کے توسط سے بی اے اور ایم اے کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد انھوں نے پی ایچ ڈی کے لیے 'اردو ادب کی تحریکیں' موضوع کا انتخاب کیا۔ اس سے قبل اس موضوع پر وہ ایک مفصل اور مبسوط مضمون قلم بند کرچکے تھے، جس کی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے نگراں ڈاکٹر وزیر آغا مقرر کیے گئے... اور انور سدید کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی۔

'اردو ادب کی تحریکیں' ڈاکٹر انور سدید کی ایسی علمی، تحقیقی اور تفصیلی کتاب ہے، جو پہلی مرتبہ جب 1985 میں شائع ہوئی تو اردو ادبا اور ناقدین نے اس کتاب کی ایسی پذیرائی کی، جو اس سے قبل شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب کے اب تک کم و بیش ایک درجن ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام تحریکات کا احاطہ کیا گیا ہے، جن میں کسی نہ کسی طور ادب کی شیرینی و چاشنی پائی جاتی ہے۔ اردو دنیا حیران تھی کہ انور سدید نے کس خوبی سے کتنی محنت اور مطالعے اور تحقیق سے اس موضوع کو ایسا دلچسپ تر بنا کر پیش کیا کہ اس کے مطالعے کے بعد اس موضوع پر کسی دوسری تصنیف کی گنجائش نہ کل تھی، نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہوگی۔ یہ بات یقین سے میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب میں برصغیر کی قدیم تحریکیں، یوروپ کی تحریکوں کے تقابلی جائزے، سیاسی اور ادبی تحریکیں، رومانی اور کلاسیکی تحریکیں، قرون وسطیٰ کی تحریکیں، تہذیبی ترقی کی روشنی میں دنیا کی قدیم تحریکوں کا مطالعہ، مسیحیت، اسلام، قرون وسطیٰ، مغربی ادب کی تحریک، تحریک وجودیت، نفسیات، تجریدیت، علامت نگاری کی تحریکات، ریختہ کی پہلی تحریک، صوفیا کی تحریک، علی گڑھ، انجمن پنجاب کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ اقبال کی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقۂ ارباب ذوق کی تحریک، تحریک ادب اسلامی اور پاکستان میں اردو ادب کی مختلف تحریکوں کا جائزہ، کوئی ایسا موضوع تلاش بسیار کے بعد بھی شاید نہ ملے، جو چھوٹ گیا ہو۔ اس کتاب کو ایسے ادبی حوالے کے طور پر دیکھا جاتا ہے، جو اپنی اولین اشاعت سے ہی اردو کے ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں کی رہنمائی کررہی ہے۔

میں میدان ادب میں کسی بھی طرح کی گروپ بازی کا قائل نہیں رہا ہوں، لیکن انور سدید سے متعلق گروپ بازی میں شمولیت کے واقعہ نے اس جانب سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ اب نظر دوڑاتا ہوں تو دور تک بہت سی گروپ بازیاں نظر آتی ہیں، لیکن یہ بات سچ ہے کہ مشہور ادیب، افسانہ نگار اور ناقد احمد ندیم قاسمی سے انور سدید کی گروپ بازی علمی اور دانشورانہ وقار کے ساتھ جاری رہی۔ بقول سعید آسی: احمد ندیم قاسمی کے گروپ میں ہمیں عطاء الحق، امجد اسلام امجد، خالد احمد اور دوسرے ممتاز قلم کار نظر آتے ہیں، جبکہ وزیر آغا کے لیے تمام سوالوں کے جوابات کی کمان اکیلے انور سدید کے ہاتھ میں رہی ہے۔

ادبی گروپوں میں تفریق 'فنون' اور 'اوراق' کے ذریعے اجاگر ہوتی ہے۔ 'فنون' احمد ندیم قاسمی کی زیر ادارت نکلتا تھا اور 'اوراق' کی ادارت ڈاکٹر وزیر آغا اور پھر ڈاکٹر انور سدید نے سنبھال رکھی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید اس لیے بھی نمایاں مقام و مرتبہ رکھتے ہیں کہ ان کی تصنیفات کی تعداد 80 سے زیادہ ہے۔ اور یہ کتابیں اتنے متنوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں، جو دور تک کسی کے

یہاں نظر آئے۔ افسانہ، تنقید، انشائیہ، خاکہ، ادارت، شاعری، تبصرہ، ادبی صحافت، جائزہ نویسی، شخصیت نگاری اور جو بھی ادب کی معلوم جہات و اصناف نظر آتی ہیں، اگر کسی ایک نابغہ روزگار شخصیت میں ڈھونڈیں تو وہ انور سدید کی ذات ہے۔ ادبیات کے بعض اہم گوشوں پر انھوں نے بڑے خوب صورت اور جامع انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

افسانے میں علامت سے متعلق انور سدید کی رائے ہے کہ ''علامت افسانے کی جان ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ ایک خاص علامت کو مدنظر رکھ کر اس کے گرد افسانے کا تارو پود بنایا جائے، جس افسانے کے موضوع میں گہرائی ہوگی، اس میں علامت خود بہ خود پیدا ہو جائے گی۔

نہ جانے کب ایک طوفان بے تغیری آیا کہ علامت نگاری کو مہمل گوئی کا بدل سمجھا جانے لگا۔ علامت کا مفہوم بدل گیا۔ علامت اور تجرید کو خلط ملط کر دیا گیا۔ کچھ ایسی گڑ بڑی ضرور ہوئی ہے کہ ادبی افسانہ جو پہلے ہی زیادہ مقبول نہیں رہا تھا، اب قطعی طور پر نامقبول اور مردہ قرار دے دیا گیا۔''

(اردو افسانہ کی کروٹیں، انور سدید، ص10، مکتبہ عالیہ لاہور، مطبوعہ 1991)

وزیر آغا جو ان کے تحقیقی مقالے 'اردو ادب کی تحریکیں' کے نگراں بھی تھے، انور سدید سے اپنی تفصیلی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: جب میری انور سدید سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور میں نے ادب اور ادیب کے بارے میں ان کی جچی تلی رائے سنی اور ہر رائے کے عقب میں مجھے ان کے خلوص، منصفانہ رویے اور وسیع مطالعے کا احساس ہوا تو میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ سنجیدگی سے تنقید کی طرف متوجہ ہوں۔ چند روز بعد انھوں نے اپنی مخصوص ملائمت اور انکساری سے مجھے بتایا کہ انھوں نے محض ارشاد کی تعمیل میں یہ چند بے ربط سطریں لکھی ہیں، ورنہ تنقید ان کا میدان نہیں ہے۔ مضمون پڑھ کر میں دنگ رہ گیا۔ جب یہ مضمون 'اوراق' میں چھپا تو مولانا صلاح الدین احمد کے اسلوب نگارش پر یہ پہلا وقیع مضمون قرار پایا۔ (پاکستانی ادب کے معمار، ڈاکٹر انور سدید-شخصیت اور فن، پروفیسر سجاد نقوی، ص 45-46، اکادمی ادبیات پاکستان مطبوعہ 2010)

محترمہ فرخندہ لودھی نے جنھیں خاکہ کھینچنے میں مہارت حاصل ہے، ڈاکٹر انور سدید کا خاکہ بڑے پرکشش انداز میں کھینچا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے انور سدید کی محبت کے اصول پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ لکھتی ہیں:

''محبت اور جنگ میں ہر حربہ استعمال کرنا رسم زمانہ ہے، لیکن انور سدید محبت میں صرف 'دیانت' کے قائل ہیں۔ اس دیانت کو زندہ رکھنے کے لیے وہ ریاکاری اور منافقت سے نفرت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ہرگز معاف نہیں کرتے، جو ریاکاری کے مرتکب ہوتے ہیں، جو ڈبل اسٹینڈرڈ کے خوگر ہیں، جنھوں نے اپنے چہرے پر کئی نقاب چڑھا رکھے ہیں اور چڑھتے سورج کی پوجا کرتے ہیں۔'' (ایضاً: ص28)

ڈاکٹر انور سدید کی صحافت کا آغاز 1980 میں محکمہ آبپاشی سے ریٹائر ہونے کے بعد ہوا۔ وہ قومی ڈائجسٹ، ہفت روزہ زندگی، روزنامہ خبریں لاہور سے چند برس منسلک رہنے کے بعد 'نوائے وقت' سے وابستہ ہوگئے، جب کہ اس سے قبل وہ 'اوراق' میں وزیر آغا کے ساتھ معاون مدیر کی حیثیت سے کام کر چکے تھے۔

وزیر آغا سے متعلق انور سدید کی رائے ہے کہ وہ علامت پسند شعرا کی صف اوّل میں شمار ہوتے ہیں، مگر وہ اپنے ہم خیال فن کاروں سے اعتدال اور توازن کے اعتبار سے منفرد و ممتاز ہیں۔ وزیر آغا کی نظموں کا مطالعہ دل میں چلمن سے لگے بیٹھے اس محبوب کا دلآویز تصور ابھارتا ہے، جو صاف چھپتا بھی نہیں، سامنے آتا بھی نہیں...... وزیر آغا کی نظموں کو پڑھ کر انور سدید یہ محسوس کرتے ہیں گویا شعر ایک ایسی علامت ہے جو ایک زندہ استعارے سے ابھرتی ہے۔

انور سدید کی ادبی زندگی پر سب سے زیادہ وزیر آغا کا ہی اثر تھا۔ انور سدید کو وزیر آغا سے محبت، عقیدت اور احترام کا جو ایقان تھا، اس کا انھوں نے اپنی کتاب 'ڈاکٹر وزیر آغا - ایک مطالعہ' میں 'حسرتِ عرض تمنا' کے تحت ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''اگر مجھ سے دریافت کیا جائے کہ میری ادبی زندگی پر سب سے زیادہ اثر کس نے ڈالا ہے، تو میں بلاتوقف ایک نام لوں گا— ڈاکٹر وزیر آغا۔''

اس تاثر کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انھیں وزیر آغا کے قریب رہنے کا موقع بہت سے دوسرے ادیبوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ملا، لیکن اس کو وہ بہت اہم قرار نہیں دیتے، بلکہ بڑی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ وزیر آغا نے ان کے دل میں ادب کی بجھی ہوئی قندیل کو دوبارہ روشن کر دیا۔ نیز ادب کو حصول مقاصد کا وسیلہ بنانے کے بجائے اس کے لیے خون دل جلانے کا ذوق و شوق عطا کیا۔ وزیر آغا نے انور سدید کو کوہ کنی کا عادی بنایا، جس کا حاصل نہ 'شیریں' ہے اور نہ 'جوئے شیر' بلکہ جس کا ثمر تخلیقی نکتہ آفرینی کی وہ لذتِ حیات آفریں ہے، جس سے روح سبک سار ہو جاتی ہے اور بدن کا تمام زنگ اتر جاتا ہے۔

(ڈاکٹر وزیر آغا-ایک مطالعہ، انور سدید، مکتبہ اسلوب کراچی، ص:8، 1962)

عظیم مفکر اور دانشور علامہ اقبال کی شاعری میں تصور حیات کو انور سدید نے بڑی معنی خیزی اور تبحر علمی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون 'اقبال کا تصور حیات' میں رقم طراز ہیں:

''اقبال کی شاعری میں زندگی کا تصور ایک مثبت حقیقت کے طور پر ابھرتا ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری میں حرکت و حرارت کو اس ساحرانہ قوت سے تسخیر کیا ہے کہ زندگی جو دراصل ان دو قوتوں کا مصدر ہے، خواہ انسان کے احاطۂ اختیار میں اسیر ہو جاتی ہے اور حیات محض سانس کی آمد و شد کا نام نہیں دیتا، بلکہ یہ خود کو اعتماد مہیا کر کے ایک طرف تسلیم و رضا کی خو پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف مطلوبِ حقیقی سے وصال کے لیے عشق صادق کا تند و تیز جذبہ عطا کر دیتا ہے۔''

انور سدید کو رومانیت سے بڑی حد تک عشق ہے۔ ایسا لگتا ہے ان کی زندگی پر رومانیت نے گہرا اور خوش گوار تاثر چھوڑا ہے۔ انھوں نے اردو ادب کی مقبول ترین کتاب 'اردو ادب کی تحریکیں' میں رومانیت پر بڑی مدلل اور باوزن گفتگو کی ہے۔

انور سدید اپنی ذات میں حقیقتاً ایک انجمن تھے۔ برصغیر کے ممتاز متعدد رسائل و جرائد ان پر خصوصی گوشے شائع کر چکے ہیں۔ میں یہ بات کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ان کے فن کی اساس ان کا وسیع مطالعہ ہے۔ اس کے لیے انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ مطالعات میں صرف کیا۔ ان کا تخلیقی اور تحقیقی دونوں کام غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی ان کا رومانی اسلوب ہے۔ جو تقریباً تمام اصناف ادب کے مزاج سے ہم آہنگ ہونے کے باوصف تخلیقیت کے جوہر سے مملو نظر آتا ہے۔ ایسے کشادہ نظر اور روشن خیال دانشور و ادیب چراغِ رخِ زیبا لے کر بھی ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ انھوں نے اپنے ورثے میں ادب و تحقیق کا جو گراں مایہ خزانہ چھوڑا ہے، اس سے اردو دنیا ان کی زندگی میں ہی فیض حاصل کرتی رہی ہے اور جب تک اردو کا ایک بھی قاری زندہ ہے، ان کے ادبی متون سے کسب فیض کرتا رہے گا۔ اس میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں زندہ ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بہ حیثیت محقق ان کی چند کتابیں درج ذیل ہیں:

اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش، انشائیہ اردو ادب میں، اردو ادب میں سفرنامہ، اردو ادب کی تاریخ، اردو ادب کی تحریکیں، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، کلاسیکی شعرا پر ان کی دو کتابیں میر انیس کی قلم رو، غالب کا جہاں اور، اقبالیات میں اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال شناسی اور ادبی دنیا اور اقبال شناسی اور اوراق قابل ذکر ہیں۔

■

Dr. Munawwar HasanKamal, Baitur Razia
G-5/A, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9818649521, Email.: mh2kamal@gmail.com

شائستہ یوسف

فوزیہ چودھری کی آخری ساعتیں

ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے کرناٹک اردو اکادمی کی چیئرپرسن کا عہدہ سنبھالتے ہی اردو دنیا میں ایک ہلچل مچادی، جس کا اعتراف آج پورا ہندوستان کررہا ہے۔ انھوں نے اردو کی خدمت کا اپنے جنون، اپنے جذبات اور اپنی فرض شناسی سے ایک اٹوٹ رشتہ قائم کرلیا۔ مسلسل کام کرنے کا یہی جنون اور والہانہ پن تھا جس کی وجہ سے انھیں اس قدر قلیل مدت میں اتنی زیادہ شہرت ملی۔ کام کرنے کا ایک بنیادی طریقہ انھوں نے اپنایا اور وہ تھا پوری ریاست کے ان تمام چھوٹے بڑے اداروں، انجمنوں اور تنظیموں کو اردو کے فروغ کی تحریک میں اور اردو کے کارواں میں شامل کرنا۔ محفل نسا بھی ایسی ہی تنظیموں میں سے ایک تنظیم ہے جس کی سرگرمیوں میں انھوں نے خصوصی دلچسپی لی اور یہی وجہ تھی جس کے باعث محفل، اردو اکادمی کے اشتراک سے کئی اہم پروگرام کامیابی کے ساتھ پیش کرسکی۔ یہ میرے ذاتی تجربے کی بنیاد پر دی گئی ایک مثال ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ترقی و ترویج کے کام میں مشغول ہر ادارے اور ہر انجمن کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہی تھا۔

صرف میں آج قارئین کو وہ منظر دکھانے کی جرأت کررہی ہوں جس کا صرف تذکرہ آپ نے سنا ہے لیکن تقدیر نے مجھے اور اس جلسے میں موجود دوسرے چند حاضرین کو اس کا چشم دید گواہ بنادیا۔

'حاصل مطالعہ' ایک بہت ہی سوچا سمجھا بامعنی پروگرام ہے جو ادب کے قارئین کے لیے ایک انمول تحفے سے کم نہیں۔ یوں تو تازہ کتابوں پر بحث و مباحثہ اور تجزیے کے کئی پروگرام ٹیلی ویژن پر پیش کیے جاتے ہیں اور رسائل میں کتابوں پر تبصرے بھی شائع ہوتے ہیں۔ لیکن 'حاصل مطالعہ' ایک الگ ہی ڈھنگ کا پروگرام ہے۔ جس میں ہم سب ایک سنجیدہ قاری کی زبانی کسی اچھی کتاب کے مطالعے سے اخذ کیے ہوئے نتائج، مطالعے سے اس کے ذہن پر مرتسم ہونے والے تاثرات اور اس کی اپنی فکر اور تجربے کی روشنی میں کتاب کے بارے میں اس کی رائے جاننے کا موقع پاتے ہیں۔ یہی نہیں مصنف کے خیالات، اس کے نقطۂ نظر اور اس کے تعصبات و ترجیحات پر گفتگو بھی اس میں شامل ہوجاتی ہے۔ جب ایک اچھا قاری ایک منتخب کتاب پر اپنے تاثرات پیش کرتا ہے تو قاری اور سامع دونوں اس کتاب کے خالق کے تجربے میں شامل ہوجاتے ہیں۔

24/فروری 2016 چہارشنبہ کی شام اس مہینے کے 'حاصل مطالعہ' کی شام تھی۔ اس شام کے دو معزز مہمان جناب چرنجیوی سنگھ سابق اڈیشنل چیف سکریٹری حکومت کرناٹک اور جناب م ن سعید سابق چیئرمین اردو اکادمی اور سابق صدر شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی تھے۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری اور پروگرام کے کنوینر جناب عزیزاللہ بیگ نے ان کے وسیع مطالعے، اپنے تاثرات پیش کرنے کی

غیر معمولی صلاحیت اور سنجیدہ مزاجی کی بنا پر ایک ساتھ دونوں کو اس پروگرام میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈائس پر جناب چرنجیوی سنگھ، جناب م ن سعید، جناب عزیز اللہ بیگ، اردو اکادمی کے رجسٹرار جناب سراج احمد خالد کے علاوہ ہمیشہ کی طرح جلسے کی روحِ رواں ڈاکٹر فوزیہ چودھری مسند صدارت پر موجود تھیں۔ اتفاق سے دونوں مہمان اس روز پانچ کے بجائے چھ بجے اکادمی پہنچے۔ اس دوران ڈاکٹر فوزیہ ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی جلسہ گاہ میں منتظر ہر شخص سے باتیں کرتی رہیں۔ پہلے پیچھے لگے بینر کی بات نکلی جو کہ ذرا چھوٹا ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر فوزیہ نے ہنستے ہوئے کہا یہ کچھ زیادہ ہی چھوٹا ہوگیا شاید یہ میری ہی ہوشیاری کا نتیجہ تھا۔ اس مزاحیہ انداز پر ہم سب ہنسنے لگے۔

پھر انھوں نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اکادمی میں اور اس کی لائبریری میں مرمت کا اور رنگ و روغن کا کام جاری ہے اور اس پروگرام کے لیے کتابوں کی الماریوں کو ایک طرف کرکے عارضی طور پر ایک جلسہ گاہ کی شکل دی گئی ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ لائبریری کی خوبصورتی اور قارئین کے لیے سہولتوں میں اضافے کے لیے وہ کئی چیزوں کا اضافہ کرنے والی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ دشواریاں تو اپنی جگہ ہیں لیکن اکادمی کے پروگرام کسی بھی وجہ سے رکنے نہیں چاہئیں اس لیے وہ بضد تھیں کہ فروری کے پروگرام 24/اور 25/فروری کو کرلیے جائیں تاکہ مارچ کے پروگراموں پر پوری توجہ سے کام ہوسکے۔ ان کا مزاج ہی ایسا بن گیا تھا کہ وہ کم وقت میں بہت سارا کام کرنا چاہتی تھیں۔ جلسے کے آغاز سے پہلے کسی نے ذکر چھیڑا چیئرپرسن کی حیثیت سے وہ مزید کتنے ایوارڈ دیں گی۔ انھوں نے ہنستے ہوئے پراعتماد لہجے میں جواب دیا کہ ابھی ان کی چیئرمین شپ کا ڈیڑھ سال باقی ہے۔ بلکہ انھوں نے مہینے اور سال کا بھی ذکر کیا کہ وہ اپریل 2017 تک لگاتار کام کریں گی، کئی منصوبے تیار ہیں اور انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے سب کو ساتھ لے کر کام کرنا ہے۔ یہ باتیں ہورہی تھیں کی ای ٹی وی کے شاہد آ پہنچے۔ انھوں نے مجھ سے اور فریدہ رحمت اللہ سے کہا کہ آپ لوگ آج کے جلسے کے تعلق سے ٹی وی کے لیے کچھ کہہ دیں تاکہ وقت بچ جائے۔ ہم لوگ جونہی دروازے کی جانب بڑھے، چرنجیوی سنگھ صاحب آتے دکھائی دیے۔ عزیز اللہ بیگ اور ہم نے ان کا خیر مقدم کیا اور شاہد نے ان سے درخواست کی کہ جلسے کے آغاز سے پہلے وہ اپنے تاثرات اس کتاب کے اور پروگرام کے بارے میں ریکارڈ کروادیں۔ ریکارڈنگ ہو ہی رہی تھی کہ فوزیہ بھی باہر آگئیں اور ہم سب چرنجیوی سنگھ صاحب کو لے کر لائبریری ہال کے اندر داخل ہوئے۔

ہم اندر پہنچے ہی تھے کہ پروفیسر م ن سعید بھی تشریف لے آئے اور چند حاضرین جو باہر منتظر تھے وہ بھی اندر آگئے۔ فوزیہ کا چہرہ کھل اٹھا۔ جلسے کا آغاز شاعر عزیز کی حمد سے ہوا اور منیر احمد جامی نے جو نظامت کے فرائض انجام دے رہے تھے، رجسٹرار سراج احمد خالد سے گزارش کی کہ وہ مہمانوں کا خیر مقدم کریں۔ مختصر سے خیر مقدمی کلمات کے بعد جامی نے پروفیسر سعید صاحب کو اپنا حاصل مطالعہ پیش کرنے کی دعوت دی۔

پروفیسر م ن سعید نے اس پروگرام کے لیے راولپنڈی سازش کیس پر مبنی ایک کتاب کا انتخاب کیا تھا جو اس عنوان سے آکسفورڈ پریس (پاکستان) نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہندوستان میں دستیاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ حسن ظہیر کی یہ کتاب انگریزی میں بھی "The Tinc and Trial of Rawalpindi conspiracy 1951" کے ٹائٹل کے ساتھ آکسفورڈ ہی سے شائع ہوئی ہے۔

پروفیسر م۔ن۔ سعید نے اپنے مخصوص انداز میں پہلے تو اس مقدمے سے فیض احمد فیض کے تعلق کا تذکرہ کیا اور پھر اس شاعری کا تذکرہ کیا جس کی تخلیق اس کیس کے نتیجے میں جیل میں ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ 'زندان شاعری' میں فیض کے مجموعے 'زنداں نامہ' کی شاعری ایک خاص مقام اور اہمیت کی حامل ہے۔ اس تمہید کے بعد انھوں نے کتاب کے مشمولات پر روشنی ڈالی۔

انھوں نے ایسے کئی حقائق پر سے پردہ اٹھایا جن کا فیض کی شخصیت اور ان کی شاعری کے چاہنے والوں کو چنداں خبر نہیں تھی۔ فیض احمد فیض اردو ادب کا ایک ایسا نام ہے جو اپنی زندگی ہی میں ایک Legendary Figure بن چکے تھے۔ فیض نے کبھی ان حقائق پر روشنی نہیں ڈالی جن کی وجہ سے ان کی سجاد ظہیر کی اور دوسرے ساتھیوں کی گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ لیکن فیض کے چاہنے والے عام طور پر یہی سمجھتے رہے کہ فیض صاحب کو خواہ مخواہ اس میں پھنسایا گیا تھا۔ کتاب کے حوالے سے پروفیسر سعید نے بتایا کہ راولپنڈی سازش کا کلیدی کردار سیاسی شعور سے عاری ایک فوجی افسر کرنل اکبر خاں تھا جو کشمیر میں پاک فوجی دستے کے کمانڈر تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کرنل اکبر خان کی بیگم نسیم اکبر خاں کمیونسٹ پارٹی کی رکن تھیں اور ایک بڑے باپ کی بیٹی تھیں۔ وہ بلند عزائم رکھتی تھیں اور متمول طبقے کے تمام افراد سے ان کے مراسم تھے چاہے ان کا تعلق سیاست سے ہو یا فوج سے۔ چونکہ فیض احمد فیض ترقی پسند تحریک کے اہم رکن تھے اور کمیونسٹ پارٹی کے اہم لیڈر بھی تھے بیگم نسیم کے حلقے میں ان کا بھی اٹھنا بیٹھنا تھا۔

اس کتاب کے مصنف نے جو پاکستان سول سروس کے ایک اہم رکن رہے ہیں اور کابینہ سکریٹری کے عہدے پر بھی فائز تھے۔ راولپنڈی سازش کیس سے متعلق سارے دستاویزات، شواہد اور گواہوں کے بیانات کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اس سازش کی روح رواں دراصل بیگم نسیم اکبر خاں تھیں اور ان کے شوہر ان کے اشاروں پر ناچتے تھے اور انھیں کے ایما پر کرنل اکبر خان نے فوجی افسروں کو بغاوت پر آمادہ کیا اور یہ سازش رچی گئی۔ انھوں نے بتایا کہ کمیونسٹ پارٹی کے صف اوّل کے لیڈروں نے یہ طے کیا کہ فوجی افسروں کے ذریعے حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے اور اس کے بعد ایک عوامی حکومت قائم کی جائے جو عام شہریوں کے مسائل حل کرسکے اور ان کے مصائب کا خاتمہ ہوسکے۔

بہرحال کرنل اکبر خان کی نااہلی اور خود فوجی افسروں کی طرف سے سرد مہری کی وجہ سے سازش ناکام ہوگئی اور اس میں ملوث تمام افراد گرفتار کرلیے گئے۔ جن میں فیض صاحب بھی شامل تھے۔ سعید صاحب کا کہنا تھا کہ ان حقائق پر سے پردہ اٹھ جانے سے فیض کی شاعرانہ حیثیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی ان کی شاعری کی قدر و قیمت گھٹ جاتی ہے۔ بلکہ جیل میں تخلیق کی گئی فیض کی نظمیں اردو ادب کا ایک سرمایہ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ دنیا کے وقیع ادب میں زنداں میں لکھے گئے ادب کی بڑی اہمیت ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مولانا آزاد کی غبار خاطر اور چند نامور ادیبوں کی شاہکار تخلیقات کا بھی ذکر کیا۔ آج جس طرح کا ادب تخلیق ہورہا ہے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے از راہ مذاق سعید صاحب نے کہا کہ غالباً آج کے شاعروں اور ادیبوں کو جیل کا تجربہ کروانا چاہیے۔

جیل کے ذکر پر شاید قاری ضرور یاد کریں گے کہ ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے جیل کے اندر مشاعرہ کروانے کا ایک انوکھا تجربہ کیا تھا جسے لوگوں نے خوب سراہا اور جو بے حد کامیاب مشاعرہ ثابت ہوا تھا۔ سعید صاحب کی گفتگو کے دوران ڈاکٹر فوزیہ اطمینان کے ساتھ ان کی باتیں سن رہی تھیں، ہنس بول رہی تھیں۔

سعید صاحب کے بعد جناب چرنجیوی نے اظہار خیال شروع کیا۔ انھوں نے تمہید کے طور پر کہا کہ جب

ان سے اس پروگرام میں شرکت کے لیے شائستہ یوسف نے اور پھر عزیزاللہ بیگ نے خواہش کی تو انھوں نے بخوشی یہ دعوت قبول کرلی اور ان کا پہلے یہ ارادہ تھا کہ شمس الرحمٰن فاروقی کے معرکتہ الآراء ناول 'کئی چاند تھے سرِ آسماں' پر اظہار خیال کروں لیکن پھر انھوں نے سوچا کہ اردو والے تو یہ ناول پڑھ چکے ہوں گے اور اس سے لطف اندوز ہو چکے ہوں گے اس لیے کیوں نہ انھیں پنجابی کے ایک قدآور اور مشہور شاعر کے فن کی سیر شناس کروائی جائے جنھیں وہ بیسویں صدی کا ایک عظیم شاعر مانتے ہیں۔ جناب چرنجیوی سنگھ کا یہ خیال ہے کہ نظیرا کبرآبادی اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے اور ان کی نظر یں نظیر کی شاعری میراور غالب کی شاعری سے بھی زیادہ عہد آفریں شاعری ہے اور جس پنجابی شاعر دھنی رام چاترک کا تذکرہ وہ کرنے جارہے ہیں وہ نظیرا کبرآبادی کے ہم پلہ شاعر ہیں۔ انھوں نے دھنی رام چاترک کی شاعری کے چندنمونے پیش کیے اور بتایا کہ انسان زندگی کا اور خاص طور پر عوامی زندگی کا کوئی ایسا پہلو یا ایسا گوشہ نہیں ہے جس پر دھنی رام نے قلم نہ اٹھایا ہو اور بہت بلند پایہ نظمیں نہ لکھی ہوں۔

جناب چرنجیوی سنگھ نے یہ بھی کہا کہ پنجاب کا کوئی بھی شاعر ایسا نہیں ہے جس نے بسنت پر نظم نہ لکھی ہو چاہے اس کی شاعری کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں انھوں نے حفیظ جالندھری کا تذکرہ کیا جن کا بسنت پر لکھا ہوا مشہور گیت ملکہ پکھراج کی دلفریب آواز میں زندہ جاوید ہو گیا ہے۔

'حاصل مطالعہ' کی خوبی یہی ہے کہ ایک اچھا قاری زیرتذکرہ کتاب کے بارے میں باتیں کرتے کرتے کئی نکتے ہمارے سامنے رکھ جاتا ہے۔ جو اس کے اپنے تجربے، مشاہدے، نظریات اور نقطہ نظر کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ ایک ستم ظریف نے ترقی پسند ادب پر اچھا فقرہ کسا ہے کہ اس میں ادب پر مباحثہ بہت ہوا اور ادب کی ترقی کم ہی ہوئی۔ کلاسیکی ادب پر ان کی رائے یہ ہے کہ اس میں ہمیں علم وفن کا خزانہ ملتا ہے۔ انھوں نے ایک اور پتے کی بات کہی کہ ہندی اور سنسکرت اور اس برادری کی جتنی زبانیں ہیں وہ ڈھائی کتاب سے ماخوذ کہی جاسکتی ہیں یعنی ان تمام زبانوں کے ادب کی جڑیں رامائن، مہابھارت اور بر-تھ کتھا کے ایک حصے میں ملتی ہیں۔ لیکن یہ بات پنجابی، اردو، سندھی وغیرہ زبانوں کے ادب کے تعلق سے نہیں کہی جاسکتی۔ کیوں کہ ان زبانوں کی ادبی روایات کا رشتہ فارسی اور عربی ادبی روایات سے جاملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں داستان گوئی کی روایت کی خاص اہمیت ہے اور یہ کہ ان زبانوں نے ملتان اور لاہور کے صوفی سنتوں کی زمین سے جنم لیا ہے۔ پنجابی ادب میں قصے کی روایت کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے ہیررانجھا جیسے رومانی قصوں کا تذکرہ کیا۔ اسی طرح مرزا صاحبان، شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور دوسری داستانیں ہماری ادبی روایات کا حصہ ہیں۔ آپ کو کنڑ زبان کے ادب میں یا تلگو ادب میں ان روایات کا کوئی اثر نہیں ملے گا۔

جناب چرنجیوی سنگھ نے ابتدا ہی میں ایک اور بے حد دلچسپ بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ جب وہ آئی اے ایس میں 1969 میں داخل ہوئے اور پہلی بار کرناٹک آئے اور دکن زبان کے الفاظ ان کے کانوں میں پڑے تو انھیں ایک عجیب یگانگت اور مانوسیت محسوس ہوئی، تب انھیں احساس ہوا کہ دکن اور پنجابی میں کس قدر مماثلت ہے اسی لیے وہ سمجھتے ہیں کہ اردو کی ابتدائی شکل بیجاپور، بیدر، میں نمودار ہوئی اور غالباً فوجیوں، تاجروں کے ذریعے یہ شمالی علاقوں میں پہنچی۔ انھوں نے بتایا کہ پنجابی اور اردو کی شعری روایات ایک دوسرے سے زیادہ الگ نہیں ہیں۔ فارسی کے ذریعے جو شعری روایات اردو کا حصہ بن چکی ہیں عین وہی روایات پنجابی میں بھی ہیں اور لفظیات بھی تقریباً وہی ہیں جو ہمیں اردو میں ملتی ہیں۔

کلاسیکی پنجابی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ وارث شاہ، بلھے شاہ اور حسین شاہ نے جو بیت اور چھند لکھے تو ان میں موسیقیت اتنی ہوتی تھی کہ وہ پڑھنے کی نہیں بلکہ گانے کی اور سننے کی چیز ہوتی تھی اسی لیے اکثر جو شعری تخلیقات ہوتی تھیں ان کے ساتھ آخر میں یہ بھی بتا دیا جاتا تھا کہ اسے کس راگ میں گایا جانا چاہیے۔ 1950 تک چھند بھی لکھا گیا اور گانے کی روایت بھی باقی رہی لیکن ترقی پسند ادب کی رو میں ہمارے لکھنے والے ان سب چیزوں کو پیچھے چھوڑ گئے اور مغرب کے اثرات کے تحت انھوں نے جو سیاسی موضوعات پر زور دیا اس کے نتیجے میں مشرقی شعری روایات پر کاری ضرب پڑی۔ انھوں نے بتایا کہ ان کی تبدیلیوں کے باوجود پنجابی ادب کی جو بنیادی روایات ہیں وہ جوں کی توں باقی ہیں اس لیے ہمیں ان مشترکہ روایتوں کا عصری پنجابی ادب میں عکس نظر آتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ پنجابی شاعروں میں خالق، خلق، برکت، سخاوت، معرفت، بلبل، گلاب، شمع پروانہ، زنداں، قفس وغیرہ کے استعارات کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔

جب تک چرنجیوی سنگھ بولتے رہے کچھ اندھیرا ہو چلا تھا۔ ڈائس پر روشنی ناکافی محسوس ہو رہی تھی اور چرنجیوی سنگھ کو نظموں کے اقتباسات سنانے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر فوزیہ نے اپنا ہینڈ بیگ منگوایا اور اس میں سے اپنا موبائل نکال کر پروفیسر م ن سعید کے حوالے کیا کہ ٹارچ کھولیں۔ اس طرح سعید صاحب ٹارچ کی روشنی چرنجیوی سنگھ صاحب کی کتاب پر ڈال رہے تھے۔ اس وقت ہم سب نے محسوس کیا کہ فوزیہ چاہتی تھیں کہ جلسہ جلد اختتام کو پہنچے کیونکہ دوسرے دن کے پروگرام کے لیے اور مہینے کے باقی پروگراموں کے لیے انھیں تیاری کرنی تھی۔ انھیں اپنی صدارتی تقریر بھی کرنی تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے عزیزاللہ بیگ سے کہا کہ وہ بھی اظہار خیال کریں لیکن انھوں نے موقع کی نزاکت کا اندازہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ سے کہا کافی وقت ہو چلا ہے آپ صدارتی کلمات ادا کر کے جلسہ ختم کریں۔ اس وقت شام کے سات بج چکے تھے اور چند ایک حاضرین بھی آہستہ آہستہ کھسکنے لگے تھے۔ آفس کا عملہ بھی سوائے رجسٹرار سراج احمد خالد، عرفان اللہ، انور اور اکاؤنٹینٹ سید صاحب کے جلسہ گاہ میں موجود نہیں تھا۔ مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ میرے اور فوزیہ کے علاوہ ہال میں کوئی تیسری خاتون موجود نہیں تھی۔

فوزیہ چودھری نے مائک سنبھالا اور تقریر شروع کی۔ جیسا کہ اکثر ان کی عادت تھی وہ اس روز کے موضوع کو چھوڑ کر ملت کی صورت حال اور بیداری کی ضرورت کا موضوع چھیڑ بیٹھیں۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ وہ اپنی بلند آواز میں بہت اچھی تقریر کرتی تھیں۔ وہ اس طرح بول رہی تھیں گویا پورے ملک سے مخاطب ہوں۔ 'حاصل مطالعہ' کے تعلق سے دو چار جملے کہنے کے بعد اچانک انھیں کوئی بات یاد آگئی اور کسی خیال نے ان کے اندر جوش بھر دیا۔ میں تو عین ان کے روبرو پہلی صف میں بیٹھی ہوئی تھی اور انھیں بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مائک میں 'شش' کی آواز گونجی۔ پھر انھوں نے ایک پوسٹر کا تذکرہ کیا جو واٹس اپ پر آیا تھا اور جس میں ایک تصویر تھی ہونٹوں پر انگلی رکھی ہوئی اور یہ لکھا تھا کہ ''شش خاموش! قوم سو رہی ہے۔ فوزیہ نے کم از کم تین مرتبہ شش اور اس جملے کو دہرایا۔ ان کی آواز میں اب جوش اور گرج شامل ہوگئی تھی، انھوں نے کہا آج ضرورت ہے قوم کو جگانے کی بیدار کرنے کی۔ ہر جگہ یہ پیغام پہنچانے کی کہ ہم اچھے اور صحیح کام کر رہے ہیں اور ہمیں ترقی کی جانب بڑھنے کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی دھن میں بولتی چلی گئیں۔ ان کے اندازِ بیان

سے سب لوگ واقف ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ اکادمی کی چیئرپرسن بنی تھیں تو پہلے ہی جلسے میں انھوں نے بڑے جوش وخروش سے کہا تھا کہ اب اردو کے اچھے دن آگئے ہیں، اور واقعی انھوں نے اردو کے پرچم کو لے کر سارے کرناٹک میں دھوم مچادی۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جلسہ ہر روز تقریر، جگہ جگہ مقابلے۔ تین سال سے جو کام التوا میں پڑے ہوئے تھے وہ سارے کام نمٹا دیے۔ جتنی کتابیں اشاعت کے لیے منتخب ہوئی تھیں وہ سب کی سب شائع کروادیں۔ تین سال سے جو ایوارڈ نہیں دیے گئے تھے ایک ہی تقریب میں وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں تفویض کردیے گئے۔ موبائل لائبریری کا خواب دیکھا اور اس پر عمل بھی کرکے دکھادیا۔

غالب کے اشعار پر پینٹنگ کروائیں اور نمائش کا اہتمام کیا۔ تقریر، تحریر، ڈراما، غزل گائکی ادب اور کلچر کے کسی شعبے کو نہیں چھوڑا۔ اب اسکولوں پر کام کرنے اور اردو آنگن واڑیوں کے لیے تحریک چلانے کا تہیہ کیے بیٹھی تھیں۔ مجھے بعد میں یہ معلوم ہوا کہ 24 فروری کی صبح وہ آنگن واڑی تحریک کے سلسلے میں میمورنڈم لے کر ریٹائرڈ ونگ کمانڈر محمود خان کے ساتھ کسی افسر سے ملنے گئی تھیں اور بارہ بجے دفتر پہنچی تھیں۔ اسی طرح ادیبوں شاعروں کے علاج معالجے کے لیے مالی امداد بھی ان کے نزدیک بہت اہم کام تھا۔

اکادمی کے بجٹ میں اضافے کے لیے وہ مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔ وہ اس لحاظ سے بڑی خوش قسمت تھیں کہ موجودہ وزیر برائے اقلیتی امور جناب قمرالاسلام نے ہمیشہ ان کے ہر ارادے کو کامیاب بنانے میں ان کی ہمت بڑھائی اور حکومت سے بھرپور تعاون انھیں ملتا رہا۔ اس طرح وہ نہ صرف اکادمی کے لیے دو کروڑ روپے کا بجٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئیں بلکہ اسے استعمال کرنے میں اپنی محنت، لگن اور مسلسل کام کے ذریعے کامیابی کے زینے سر کررہی تھیں۔ اس قدر لگن، محنت اور توانائی کا مظاہرہ کسی بھی اکادمی کے چیئرمین میں نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ قمرالاسلام صاحب اکثر کہتے ہیں کہ مجھے اقلیتی امور کی وزارت کے دو سو کروڑ کے بجٹ کے بارے میں اتنی فکر نہیں رہتی جتنی کہ اردو اکادمی کے دو کروڑ کے بارے میں رہتی ہے۔ کیونکہ فوزیہ دن رات تگ ودو میں رہتی ہیں اس معاملے میں قمرالاسلام صاحب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ انھوں نے اردو زبان کا پورا پورا حق ادا کیا۔ ڈیڑھ برس میں جو کام ہوا وہ شاید کوئی دوسرا دس برس میں کرتا۔ اپنا کام تو ہر کوئی کرتا ہے لیکن پچھلوں کے بقایا کام کی تکمیل کے لیے جی جان لگانا دل گردے کی بات ہے۔

فوزیہ جو تقریر کررہی تھیں اس میں ان کے خیالات، جذبات ان کی لگن اور ان کے خواب اور ایک روشن مستقبل کی تمنا گونج رہی تھی۔

پھر بولتے بولتے وہ خلیل جبران کے قول پر آگئیں جس کا مطلب بھی کم وبیش انسانی تعلقات ہوش مندی اور عمل سے تھا۔ اسی بات کو جب انھوں نے خلیل جبران .... کہہ کر دہرایا تو میں نے لمحہ کے چھوٹے سے حصے میں ایک وقفہ محسوس کیا جس کا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے اور پھر انھیں الفاظ کے ساتھ وہ منہ کے بل مائک کے ساتھ اوندھی گر پڑیں۔ ان کا گرنا اتنی جلدی عمل میں آیا کہ نہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر پکڑ سکے نہ ہم سامنے بیٹھنے والے کچھ کرسکے۔ صرف ارے ارے کی آوازیں نکالتے ہوئے ہم لوگ ان کے قریب آئے۔ بڑی مشکل سے ان کو پلٹ کر سیدھا کیا۔ شاید ہم تمام کا اس وقت یہی خیال تھا کہ تھکن یا جوش کی وجہ سے گر گئیں اور بے ہوش ہوگئی ہیں پانی کے چھینٹے دینے سے اٹھ جائیں گی۔ عرفان اللہ زمین پر بیٹھے اور ان کا سر گود میں رکھا۔ میں جھک کر ان کو تھپتھپاتی رہی اور پھر جب احساس ہوا کہ اب انھیں صرف پانی سے کام نہیں چلے گا جلدی سے ڈاکٹر کو بلائیں کی آواز لگائی اور سبھی کا ایک ہی خیال تھا کہ جلد از جلد انھیں اسپتال لے جایا جائے۔ ایمبولینس کے لیے فون کیا لوگوں کو دوڑایا ادھر ایمبولینس آنے تک میں سر پر ہاتھ پھیر کر جگانے کی کوشش کرتی رہی پھر کرسی لے کر ان کے قریب بیٹھ گئی جامی بھی پیروں کے پاس بیٹھے تھے۔ بشیر صاحب بھی دوسری طرف کھڑے تھے۔ چرنجیوی سنگھ بھی بے چینی سے ڈاکٹر کو بلانے اور ان کی نبض دیکھنے کی تلقین کرتے رہے۔ میں نے ہتھیلیاں مسلیں۔ بالوں پہ ہاتھ پھیرتی رہی وہ آنکھیں بند تھیں اچانک میں نے ان کے گلے سے ایک ہلکی سی آواز سنی جیسے کوئی خراٹا بھرتا ہے اور پھر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی زبان کچھ گول ہورہی ہے اور پانی کے قطرے معمولی سے کف کے ساتھ گال پر بہے جوں ہی اس کو صاف کیا ہونٹ بالکل ایسے مل گئے جیسے ان کے چہرے پر عموماً مسکراتے وقت نظر آتے ہیں۔ میرے دل میں وسوسہ جاگ رہا تھا اور شاید قریب سے دیکھنے والے ہر شخص کے دل میں بھی:

فوزیہ جو تقریر کررہی تھیں اس میں ان کے خیالات، جذبات ان کی لگن اور ان کے خواب اور ایک روشن مستقبل کی تمنا گونج رہی تھی۔
پھر بولتے بولتے وہ خلیل جبران کے قول پر آگئیں جس کا مطلب بھی کم وبیش انسانی تعلقات ہوش مندی اور عمل سے تھا۔ اسی بات کو جب انھوں نے خلیل جبران .... کہہ کر دہرایا تو میں نے لمحہ کے چھوٹے سے حصے میں ایک وقفہ محسوس کیا جس کا ہم اندازہ بھی نہیں لگا سکتے اور پھر انھیں الفاظ کے ساتھ وہ منہ کے بل مائک کے ساتھ اوندھی گر پڑیں۔ ان کا گرنا اتنی جلدی عمل میں آیا کہ نہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ اٹھ کر پکڑ سکے نہ ہم سامنے بیٹھنے والے کچھ کرسکے۔

تھا میرے دل میں وسوسہ جس کا
سبھی اس بات سے پریشاں تھے

بشیر صاحب کو بھی نبض نہیں مل رہی تھی۔ میں نے سینے پر ہاتھ رکھا سبھی مجھے دھڑکن دیکھنے کو کہہ رہے تھے۔ میں نے ہاتھ رکھ کر دیکھا اور سینہ سہلاتی رہی۔ لیکن کسی سے یہ کہنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ میری ہتھیلی کو کسی طرح کی دھڑکن کا احساس نہیں ہے۔ نعیم صاحب مجھے سانس کو ناک کے قریب محسوس کرنے کو کہہ رہے تھے میں نے کہہ دیا میں نہیں دیکھ سکتی۔ خیر جامی بھی کوشش کررہے تھے۔ میں ہاتھ میں ہاتھ رکھ کر دباتی اور گرمی کو محسوس کرتی رہی اس وقت تک ان کا جسم گرم تھا لیکن کوئی حرکت جسم کے کسی حصے میں نہیں ہورہی تھی۔ میں لگاتار پڑھ رہی تھی۔ کبھی کلمہ کبھی آیۃ الکرسی کبھی اللہ کے ناموں کی تسبیح اور عرفان اور منیر احمد کو بھی وہی کہہ رہی تھی۔ جامی نے کہا میں بھی پڑھ رہا ہوں۔

ایمبولینس آگئی اور قریبی اسپتال مارتھا ہی تھا ہم اب اس سفر کو چل پڑے۔ اب ایمبولینس میں میں، عرفان اللہ، سراج صاحب اور شاید سعید صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم لوگوں کو پھر بھی یہ امید تھی کہ شاید آکسیجن لگاتے ہی کچھ فرق پڑے گا۔ ایمبولینس کے ساتھ والا وارڈ بوائے بھی صحیح شخص تھا اس نے اپنے طور پر کوششیں شروع کیں۔ آکسیجن لگایا پھر بی پی دیکھنے کے لیے انگلی میں آلہ لگا کر مانیٹر پر دیکھا عجیب عالم تھا میری نظر مانیٹر کو دیکھ رہی تھی لیکن کیا بولوں سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ مانیٹر پر سارے اشارے خاموش تھے۔ صرف یہ دعا کررہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ اٹھ جائیں۔ اس لڑکے نے زور زور سے سینے میں رگڑ پیدا کرنے کی کوشش کی ناک کے ساتھ بلون لگا کر بار بار پمپ کرتا رہا اور سانس کو جاری رکھنے کی

کوشش کی۔ اسپتال آ گیا شاید وارڈ بوائے کا اشارہ دیکھ کر اسپتال والوں نے ایمبولینس کو کارڈیاک سینٹر کی جانب موڑنے کے لیے کہا۔ اور اس طرح انھیں کارڈیاک سینٹر میں لے جایا گیا فوراً کئی ڈاکٹرز آ گئے۔ Ecg لیا گیا آکسیجن لگایا اور سب کو باہر نکال دیا اپنے طور پر کوشش کرتے رہے پھر دس منٹ میں باہر آ کر اعلان کر دیا کہ ''شی از نو مور۔''

اللہ اس طرح کے کیفیت اور ان حالات سے دشمن کو بھی نہ گزارے ایسی بات سننا اور برداشت کرنا کتنا مشکل تھا یہ۔ قاری میری بات پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اب مشکل مرحلہ ان کی بچی اور ان کے شوہر کو بتانے کا تھا۔ لیکن بتانا پڑا دونوں میرے ساتھ اندر گئے۔ ان کے شوہر نے ایک ہی سوال کیا ''کیا اچھی طرح دیکھ لیا یہ زندہ نہیں ہے؟'' پھر فوزیہ کے پیروں پر ہاتھ رکھ کر بولے ''مجھے کیسے چھوڑ سکتی ہے'' فوزیہ کی چھوٹی بیٹی کا حال دیوانوں جیسا ہو رہا تھا اتفاق سے ان کی دونوں بڑی بیٹیاں شہر میں ہی تھیں صرف یہی چھوٹی بیٹی والد کے ساتھ تنہا تھی۔ پریشان ہوگئی میں نے سینے سے لگا کر دلاسہ دیا پھر وہ مجھ سے بولی ''مجھے گھر والوں کو کسی نہ کسی طرح فوراً اطلاع کرنا ہے ورنہ میں گھٹن سے مرجاؤں گی۔'' میں اس کی حالت پوری طرح سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی میں نے فوزیہ کے گلے سے زیور نکال کر بچی کے حوالے کیا اور پھر وہ لوگ چلے گئے تاکہ ان کو گھر لے جانے کا بندوبست کیا جائے۔ اب سبھی لوگ چلے گئے، سب باہر۔ وارڈ سے دور۔ میں اب فوزیہ کے ساتھ تھی جو خاموش کہتے کہتے خود خاموش ہوگئی۔ آنکھیں بند لب بھی ملے ہوئے، چہرہ ویسا ہی ہشاش بشاش نہ شکن نہ پریشانی بس جیسے کوئی اچھا پروگرام پیش کر کے سکون سے لیٹی ہو۔ مجھے اس فوزیہ کا چہرہ یاد آ رہا تھا جب وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی کوئنس روڈ، میرے گھر تک آئی تھی۔ مجھ سے کہا شحنہ یادگیر نے میرے بارے میں اتنا کچھ بتایا تھا کہ اسے مجھ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ اور اتنی گرمجوشی سے گلے لگا کر بہت جلد بہت کچھ کہہ دیا۔ اب بھی مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ ''اب اٹھے گی اور دوبارہ مجھے گلے لگا کر کہے گی'' جاؤ بلالاؤ سب کو کیا جی! میں اتنی جلدی ہار مان جاؤں گی! ایک ایک کو ٹھیک کر دوں گی۔ ابھی بہت کام باقی ہیں بہت کچھ کرنا ہے۔ اردو ہال کی زمین کے لیے خوب جھگڑی ہوں۔ کیا یوں ہی خاموش رہ جاؤں گی، اردو ہال بنا کر چھوڑوں گی۔''

اف! وہ وقت کتنا مشکل معلوم ہو رہا تھا مجھے۔ کتنی بے بس تھی میں میرے سامنے ایک جیتی جاگتی عورت لیٹی ہوئی تھی اور اسے ڈاکٹرز ڈیڈ باڈی کہہ رہے تھے۔ میں نے اپنی دھڑکن ٹٹولی کیا میں بھی زندہ ہوں یا صرف مجھے یہ سب ایسا نظر آ رہا ہے۔ آخر کون ہے جو اس طرح اچانک جسم سے نکل کر چلا جاتا ہے اور یہ بدن دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ مجھے ایک زمانے میں ایک شعر نے بہت مضطرب رکھا تھا اور آج بھی وہ صحیح معنوں میں میرے ذہن میں گونج رہا تھا:

تنگِ محفل میرا اٹھنا میرا چلنا بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

زندگی بھی بڑی عجیب ہے، دکھ، حالات، دنیا، وقت جب ہم گذرتے ہیں تو برسوں کا سفر صدیوں کا معلوم ہوتا ہے اور آنکھیں موند لو تو ایک لمحہ۔ کیسے سارے مناظر حال اور مستقبل سبھی غائب ہو جاتا ہے اور ماضی ہی ماضی رہ جاتا ہے۔

اتنے میں وارڈ بوائے اور نرس نے آ کر کہا ''آپ کب تک اس ڈیڈ باڈی کے پاس کھڑی رہیں گی یہاں الاؤ نہیں ہے۔ آپ باہر انتظار کریں ہم نے ساری فارمولیٹیس پوری کر لی ہیں ان کو لے جانے کے لیے گاڑی آ جائے گی۔'' مجھے یہ احساس ستا رہا تھا کہ میں اس کو تنہا کیسے چھوڑ دوں۔

میں باہر آ گئی یہاں شاعر عزیز صاحب، جمیل صاحب، اقبال بیگ صاحب، عزیز اللہ بیگ صاحب، چرنجیوی سنگھ صاحب سبھی تھے۔ اور وہ وقت آ گیا ایمولینس آئی اور اب کے کچھ اور لوگ جمع ہو گئے۔ اس حیران کر دینے والی شخصیت نے اپنی اچانک موت سے ہر ایک کو حیران کر دیا اب میڈیا اور بہت سارے چہرے سامنے تھے نعمان صاحب اور سعیدہ صاحبہ مجھے قریب نظر آئے۔ میں، عرفان اللہ اور سعیدہ ہم تینوں اب خاموش فوزیہ کے ساتھ سفر پر تھے۔ ایمولینس میں بہت گرمی تھی، ایک لمحے کے لیے میں بھول گئی کہ وہ مردہ ہیں مجھے لگا چادر منہ پہ ڈھک دی ہے کتنی گرمی ہو رہی ہوگی۔ میرا ہی دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے خیال آیا جانے وہ کیسی موت تھی کہ ساری منطق مجھے بے معنی نظر آئی کیونکہ میں نے جب ان کی پیشانی اور سینے پر ہاتھ پھیرا تھا تو انھیں پسینہ تک نہیں آیا تھا ویسے اگر دل کا دورہ ہو تو کچھ علامتیں ہم تمام بھی جانتے تھے وہاں تو ہمیں کسی طرح کی کوئی علامت نظر ہی نہیں آئی پھر یہ کیسے! جیسے اچانک کسی نے بٹن بند کر دیا ہو اور بلب بے نور ہو گیا۔ بجلی کا کون سا تار تھا جو کٹ گیا۔ وہ عورت جو کہہ رہی تھی کہ ابھی ڈیڑھ سال میں اس عہدے پر ہوں وہ اچانک کیسے غائب ہوگئی۔ کیا شاعر نے ایسے ہی کسی تجربے سے دوچار ہو کر کہا تھا کہ:

سامان سو برس کا ہے
پل کی خبر نہیں

جو روزانہ سیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلیٹ میں پہنچتی تھیں آج انھیں چار لوگ لے جا رہے تھے۔ ان کے شوہر ان کی بچیوں کا ایک ہی سوال تھا کہ کیا ڈاکٹرز نے وقت پر انھیں صحیح ٹریٹ منٹ دیا؟ کیا انھوں نے کچھ کہا...؟ کیا آخر میں کسی کو پکارا۔ لیکن اچانک بچھڑ جانے والی کو یہ احساس بھی نہیں تھا وہ اگلے پل اس دنیا ہی کو چھوڑ جائیں گی۔ زندگی کے معاملات ایک انسان کبھی مکمل نہیں کر سکتا۔ دنیا کی ترقی و ترویج اس کی بہتری میں بھی کئی اذہان کا حصہ اور تجربہ ہے۔ ہر عہد ایک نئے عہد کو جنم دیتا ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ خالی کر دیتا ہے اور دوسرا اسے پُر کرتا ہے۔ لیکن جس طرح قدرت نے تمام انسان بنائے لیکن ایک ہی مخلوق ہونے کے باوجود ہر چہرہ الگ الگ شناخت رکھتا ہے اور الگ الگ فطرت۔ اسی طرح اس کی محنت اس کا عمل اس کے اخلاق بھی دنیا کو وہی کچھ دے جاتے ہیں جو اس نے دینا چاہا۔

انسان جب بھی کوئی کام کرے اور پلان بنائے تو اس کی ترتیب ایسی ہو کہ ہم رہیں نہ رہیں کچھ ایسے لوگوں کو تربیت کریں اور اس قابل بنائیں جو ہمارے خوابوں کو تعبیر دے سکیں۔ اس کے لیے اپنے نفس کی نفی اور مٹی میں مل جانے والے جسم کی حقیقت کی شناخت بہت ضروری ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری جس نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر جس جوش و خروش سے اردو اکادمی کی چیئر پرسن کے عہدے کو قبول کیا وہ قابلِ داد ہے۔ لوگ نادانی سمجھتے تھے لیکن غیب کا علم صرف عالم الغیب کو تھا۔ اللہ نے ان کو کچھ عرصے میں وہ سب کچھ دے دیا جس کی انھوں نے تمنا کی۔ وہ خاتون جو کہتی رہیں کہ میں ساری کشتیاں جلا کر اس عہدے پر آئی ہوں۔ اللہ فوزیہ کی خدمات کا اجر دے اور اسے جنت الفردوس میں جگہ دے۔۔ اتنا ہی کہوں گی:

بس وہی لمحہ آنکھ دیکھے گی
جس پہ لکھا ہوا ہو نام اپنا

آخری سانس تک بھی عہدہ ان سے الگ نہ ہو سکا۔ وہ لوگوں کے دلوں میں بطور اردو اکادمی کی چیئر پرسن زندہ رہ گئیں اللہ کبھی کسی کے ساتھ بے انصافی نہیں کرتا ہر فرد کو اس کی محنت کا پھل ضرور ملتا ہے۔

بشکریہ: روزنامہ 'سالار' بنگلور

■

Ms. Shaista Yousof
Fordham House, IInd Floor Flat 21 Harris Road
Benson Town, Bangalore - 560046 (Karnataka)

سید وصی اللہ بختیاری عمری

ڈاکٹر فوزیہ چودھری

ڈاکٹر فوزیہ چودھری - ایک متحرک و فعال، سرگرمِ عمل، کام کی دھنی اور جہدِ مسلسل سے عبارت شخصیت کا نام تھا۔ آپ کرناٹک اردو اکادمی کی چیئر پرسن کی حیثیت سے اردو زبان کی ترویج واشاعت اور فروغ واستحکام کے لیے تاحیات ہمہ تن کوشاں رہیں۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری کا انتقال 24 فروری 2016 کو بنگلور میں کرناٹک اردو اکادمی کے ایک پروگرام میں دورانِ تقریر ہوگیا۔ اردو دنیا میں آپ کے انتقال پر رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ آپ کے انتقال کی خبر ایک حادثہ فاجعہ سے کم نہیں ہے۔ کرناٹک اردو اکادمی کی چیئر پرسن کی حیثیت سے انھوں نے قلیل مدت میں شاندار اور نمایاں کارکردگی انجام دی۔ آپ کے تقرر کے بعد اردو اکادمی کی سرگرمیوں میں بہت اضافہ ہوا۔ آپ ایک فعال اور عملی شخصیت تھیں۔

14 فروری 1963 کو ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی ولادت تماپور میں ہوئی جو اس وقت کرناٹک کے ضلع گلبرگہ میں شامل تھا۔ آج کل ضلع یادگیر میں ہے۔ آپ کے والد چودھری عبد الواحد ایڈووکیٹ ایک مخلص سماجی خدمت گزار تھے، انھوں نے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا تھا۔ آپ کی والدہ ثریا بیگم شحنہ تھیں، جو اپنے دور میں میسور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کر چکی تھیں، علمی و ادبی شغف واشتغال رکھتی تھیں۔ انھوں نے قرآنِ مجید کا ایک اردو ترجمہ بھی کیا جو مختصر بین السطور اشارات کے ساتھ 'تبیین القرآن' کے نام سے' جامعہ دارالسلام عمرآباد کے تین اساتذہ کی تقاریظ کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری اپنے چھ بھائی بہنوں میں دوسری اور بڑی بہن تھیں۔ آپ نے اپنے آبائی قصبہ تماپور میں ابتدائی تعلیم کے بعد وہیں گورنمنٹ ہائی اسکول سے اردو میڈیم کے ذریعے دسویں جماعت کا امتحان نمایاں نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ کے والد نے آپ کو گلبرگہ بھیجا، جہاں آپ نے پی یو سی، بی اے اور ایم اے اردو کی اسناد حاصل کیں۔ آپ کی ایک خالہ اختر شحنہ صاحبہ بھی آپ کے ساتھ تعلیمی سفر میں ساتھ ساتھ رہیں۔ ایم اے کے بعد گلبرگہ یونیورسٹی سے ڈاکٹر راہی قریشی کی نگرانی میں 'آزادی کے بعد ادبِ اطفال' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اپنے شوق اور دلچسپی سے آپ نے جامعہ عثمانیہ' حیدرآباد سے عربی میں بھی ایم اے کر لیا تھا۔

14 جنوری 1980 کو جناب عبدالواجد سے آپ کی شادی ہوئی۔ پھر آپ بنگلور منتقل ہو گئیں۔ 1996 میں کرناٹک کے سرکاری کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے منتخب ہوئیں اور رام نگرم کے گورنمنٹ کالج میں اردو لیکچرار کی حیثیت سے تدریسی خدمات کا آغاز کیا۔ تبادلے پر کولار کے گورنمنٹ فرسٹ گریڈ کالج، بنگلور کے مہارانی کالج اور پھر بنگلور کے گورنمنٹ ہوم سائنس کالج کے شعبۂ اردو میں خدمات انجام دیں۔ ہر کالج میں بڑی نیک نامی اور محنت کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں۔ طلبہ میں مختلف قسم کے مسابقتی پروگراموں کے انعقاد کے ساتھ طلبہ میں بیداری اور صلاحیتوں کو جلا بخشنے کے لیے آپ ہمیشہ مستعد رہتی تھیں۔ بنگلور کے گورنمنٹ ہوم سائنس کالج کے شعبۂ اردو کے صدر اور اسوسی ایٹ پروفیسر ڈاکٹر آر محمد عمری نے آپ کی تدریسی اور انتظامی صلاحیتوں کے بارے میں ایک جگہ تفصیل سے لکھا ہے۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری کو ادبِ اطفال سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے بچوں کے لیے ایک ماہنامہ 'غبارہ' جاری کیا تھا، جو تقریباً چار سال تک مسلسل جاری رہا۔ آپ نے بچوں کے لیے ایک 'منتخب اشعار' کا مجموعہ بھی شائع کیا تاکہ بیت بازی کے لیے معاون ثابت ہو۔ ایک 'لطیفوں کا خزانہ' بھی جمع کر کے شائع کیا تھا جو بچوں کی پسند اور معیار کے مطابق تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے بہت خوبصورت خاکے لکھے ہیں۔ عمدہ اسلوب اور شگفتہ طرز تحریر میں آپ کے شخصی خاکے بہت اہمیت کے حامل ہیں جو حیدرآباد کرناٹک اور علاقۂ کرناٹک کی مختلف ادبی شخصیات پر مشتمل ہیں۔ خاکوں کا پہلا مجموعہ 'مہرباں کیسے کیسے' اور دوسرا مجموعہ 'درون بینی' کے نام سے شائع ہوا۔ ان خاکوں کے مجموعوں کے علاوہ ایک اور کتاب 'حیدرآباد کرناٹک میں خاکہ نگاری' شائع ہوئی۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری کے وظیفہ یاب ہونے میں تقریباً دس سال باقی تھے کہ آپ اپنی ملازمت سے مستعفی ہوگئیں۔ 31 مئی 2014 کو آپ کے نام کرناٹک گورنمنٹ کا حکم نامہ جاری ہوا، جس کے تحت آپ اردو اکادمی، کرناٹک کی چیئر پرسن بنیں۔ اوائل جون سے آپ نے اردو اکادمی میں بحیثیت چیئر پرسن اپنی خدمات کا آغاز کیا۔

اردو اکادمی کرناٹک میں آپ کا دور ہمیشہ یادگار رہے گا۔ آپ نے اکادمی میں کئی اسکیمیں شروع کیں۔ کرناٹک اردو اکادمی کے بجٹ کو بڑھا کر تقریباً دو کروڑ روپے کر دیا گیا۔ اردو کے ادیبوں اور صحافیوں کے لیے طبی امداد کا ایک پروگرام شروع کیا جس کے ذریعے وظائف اور مالی امداد جاری کی گئی جو تقریباً پچیس ہزار روپوں پر مشتمل ہے۔ آپ نے اردو گھر کی تعمیر کا ایک پراجیکٹ شروع کیا۔ جس کے ذریعے شہر گلستان بنگلور اور کرناٹک کے ہر ضلع میں ایک اردو گھر اور اردو ہال کی تعمیر کا منصوبہ تھا لیکن یہ خواب صرف یادگیر شہر میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ مگر افسوس کہ اس اردو ہال کے افتتاح میں وہ خود شریک نہیں ہوسکیں کیونکہ اس کے افتتاح سے پہلے انتقال کر گئیں۔

اردو اکادمی کرناٹک کی چیئر پرسن کی حیثیت سے انھوں نے اکادمی کو نہایت متحرک اور فعال بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ مختلف اسکیموں اور ایوارڈز کو بحال کرنے کے علاوہ، صحافیوں کو مالی امداد اور زیر علاج صحافیوں اور ادبا و شعرا کے لیے وظائف کا نظم کیا گیا۔ اکادمی کی جانب سے اردو کتابوں کی اشاعت کا جو سلسلہ تین سال سے رک گیا تھا، دوبارہ جاری کیا گیا۔

اردو اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے 'حاصلِ مطالعہ' اور 'ان سے ملیے' پروگرام شروع کیا۔ آپ نے عروض پر ورک شاپ کا بھی اہتمام کیا۔ کارنر ڈرامہ فیسٹیول، اذکار کی پابندی سے اشاعت، موبائیل لائبریری جس کے ذریعے ہر گاؤں تک اردو پہنچ سکے۔

ابھی پچھلے مہینے انھوں نے اردو اکادمی کرناٹک کے لیے ایک رجسٹرار کے تقرر کو یقینی بنایا۔ گویا ڈاکٹر صاحبہ ہمیشہ اکادمی کی سرگرمیوں اور مختلف پروگراموں میں مشغول رہتی تھیں۔ تلنگانہ کے معروف صحافی جناب یحییٰ خان صاحب نے بھی کئی مرتبہ مجھ سے فون پر ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی متحرک اور سرگرم شخصیت کے بارے میں بات کی۔ مسلسل جدو جہد اور حرکیاتی شخصیت کے بارے میں فرماتے کہ بیدر حیدرآباد سے قریب ہے اور بنگلور سے بہت دور، لیکن اس کے باوجود محترمہ مستعدی سے سفر کرتی ہیں۔ کرناٹک کے دور دراز علاقوں کے اردو پروگراموں میں شرکت کے لیے ہر جگہ خندہ پیشانی کے ساتھ پہنچ جاتیں۔ واقعی، کہاں بنگلور، کہاں بیجاپور، کہاں بیدر، اور کہاں گلبرگہ وشیموگہ اور دھارواڑ، اس کے علاوہ کبھی پٹنہ، کبھی ممبئی، کبھی کیرالا اور اکثر دہلی کے اسفار کیونکہ آپ قومی کونسل برائے فروغ اردو کی ایک ذیلی کمیٹی کی رکن تھیں۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری، بنگلور کی خواتین کی علمی وادبی تنظیم 'محفلِ نسا' سے بھی وابستہ تھیں۔ اس کے پروگراموں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتیں۔ اس کے علاوہ مختلف سمیناروں، کانفرنسوں اور ادبی محفلوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتیں۔ آپ کے مزاج میں سادگی اور کام کی دھن سوار رہتی تھی۔ مجھے ان کے ساتھ متعدد سمیناروں میں شرکت کا موقعہ ملا ہے اور اس طرح ان سے ملاقاتوں کے مواقع حاصل رہے ہیں۔ میرے ساتھ ڈاکٹر ایس محمد یاسر صاحب ہر ملاقات میں ساتھ رہتے۔ میل وشارم، ترو پتی، چینائی، آمبور، مدراس یونیورسٹی، ایس آئی ای ٹی زنانہ کالج، مدراس اور دیگر کئی مقامات پر ادبی پروگراموں میں ملاقاتیں رہیں۔

پچھلے چند مہینوں سے ڈاکٹر فوزیہ چودھری صاحبہ ذہنی تناؤ، الجھن اور پریشانی کا شکار ہوگئی تھیں، کرناٹک اردو اکادمی کی جانب سے بنگلور میں اکادمی کے ہال میں 24 فروری 2016 کی شام ایک پروگرام حاصلِ مطالعہ کے دوران تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر فوزیہ چودھری انتہائی جذباتی ہوگئیں اور تقریر کے دوران گر پڑیں، فوراً اسپتال لے جایا گیا، لیکن ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ پروفیسر م ن سعید صاحب بھی 'حاصلِ مطالعہ' پروگرام میں شامل تھے، آپ نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحبہ اس پروگرام کی صدارت کر رہی تھیں، بے چینی کا اظہار کیا، اپنی نشست سے دوسری کرسی پر بیٹھیں، اور پھر اپنی تقریر میں قوم کی زبوں حالی پر کچھ کہتی رہیں، اہلِ اردو کے رویے پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا اور پھر دورانِ تقریر گر پڑیں۔ اسی دوران انتقال ہو چکا تھا اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ سابق چیئر مین کرناٹک اردو اکادمی، پروفیسر م ن سعید صاحب نے مزید فرمایا کہ موجودہ حکومت میں اکادمی کا بجٹ ستر لاکھ سالانہ سے بڑھ کر دو کروڑ ہو چکا تھا، جس کی وجہ سے اکادمی کی کارکردگی میں بہت سہولت پیدا ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر شائستہ یوسف نے 'حاصلِ مطالعہ اور ڈاکٹر فوزیہ چودھری کی آخری ساعتیں' کے نام سے روزنامہ سالار، بنگلور میں لکھا ہے۔

جناب اکرم نقاش، مدیر اذکار، کرناٹک اردو اکادمی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر فوزیہ چودھری ایک پریکٹیکل اور ایکٹیو متحرک خاتون تھیں۔ بہت تعمیری مزاج کی حامل تھیں اور کنسٹرکٹیو تھیں، کام کی دھنی اور اذکار کی اشاعت کے لیے ہر طرح کا تعاون کرتی تھیں، رسالے کی اشاعت میں تسلسل کی خواہشمند رہتی تھیں کہ ہر شمارہ وقت پر شائع ہو، لیکن معیاری تخلیقات کا حصول چونکہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں، لہٰذا کبھی کبھی اشاعت میں تاخیر ہوجایا کرتی تھی۔

ڈاکٹر آر محمد عمری جنہیں ڈاکٹر فوزیہ چودھری کے رفیقِ کار کی حیثیت سے گورنمنٹ ہوم سائنس کالج میں چار سال کام کرنے کا موقعہ ملا ہے، کہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کے تعلقات دنیائے ادب کی بیشتر شخصیات سے استوار تھے۔ آپ کے پاس سب کے پتے اور ٹیلی فون کے نمبرات موجود ہوتے تھے۔ آپ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرنے کی جستجو میں لگی رہتیں۔ آپ نے ایک مرتبہ کالج میں عظیم الشان پیمانے پر 'ریاستی سطح پر کرناٹک کی شاعرات کا مشاعرہ' منعقد کیا تھا۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری کے شوہر جناب عبد الواجد کہتے ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ وہ ہر معاملے میں مجھ سے مشورہ کیا کرتی تھیں۔ میرا بہت احترام کرتی تھیں۔ ابھی ان کے اردو اکادمی کی چیئر پرسن کی حیثیت سے تیرہ مہینے باقی تھے۔ انھوں نے اردو کے لیے اپنی جدو جہد کی راہ میں گویا شہادت پائی ہے، وہ یقیناً 'شہیدِ اردو' ہیں۔

ڈاکٹر فوزیہ چودھری کے بھائی شیخ نذیر احمد عمری مدنی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ مختلف مقامات پر تعزیتی پروگرام منعقد کیے گئے۔ آپ کی اس اچانک اور غیر متوقع موت پر پوری اردو دنیا سوگوار ہے۔

■

Dr. Sayed Wasiullah Bakhtiyari Umri Dept. of Urdu, Government Degree College, Rayachoti, Distt.: Kudappa-516269 (Andhra Pradesh)

فیروز بخت احمد

’غالب کی حویلی‘ کو زندہ یادگار بنانے کی داستانِ جدوجہد

یوں تو غالب نے اپنی زندگی میں نہ صرف بے تحاشہ سفر کیا بلکہ وہ غالباً ایک ایسے شاعر ہیں کہ جنھوں نے بے شمار قیام گاہوں میں اپنی زندگی گزاری۔ چاہے وہ آگرہ میں رہے ہوں، رامپور میں سکونت اختیار کی ہو، بنارس میں رہے ہوں، پٹیالہ میں حکیم محمود خان کی قیام گاہ میں رہے ہوں، ہمدرد دواخانے کے سامنے گلی قاسم جان میں داخل ہوتے ہی دائیں طرف کڑوڑہ والی حویلی ہو، اسمٰعیل خان کا مکان ہو کہ جس کا کرایہ پانچ روپیہ آٹھ آنے تھا، اپنے سسر نواب الٰہی بخش خان معروف کے مسکن یعنی محل سرا میں وقت گزارا ہو، کلکتہ میں رہے ہوں یا کہیں بھی رہے ہوں، انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ جہاں تک ان کی آخری قیام گاہ یعنی جسے حویلیِ غالب کے نام سے جانا جاتا ہے، کی بات ہے تو پرانی دہلی کے اس شاہجہاں آبادی خطے میں غالب کی یہ رہائش گاہ اب ان کی آخری سکونت کے طور پر جانی جاتی ہے۔ دراصل تمام عمر شاعری کرنے کے بعد اور حاکم وقت شہنشاہ بہادر شاہ ظفر سے قربت ہونے کے باوجود، غالب کا ذاتی مکان نہ ہوا۔ غالب کی گلی قاسم جان والی یہ آخری قیام گاہ ان کے انتقال کے بعد مختلف ہاتھوں میں منتقل ہوتی رہی۔ ویسے اس کی ملکیت شریف خانی حکیموں کی ملکیت تھی۔ غالب کے وقت میں یہ ایک وسیع وعریض حویلی تھی جس کا رقبہ 400 گز سے بھی زیادہ تھا۔ اور قاسم جان کی گلی سے لے کر کٹرہ عالم بیگ تک یہ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے کئی مالک اور کرایہ دار بدلے۔

حویلیِ غالب کے سلسلے میں اہالیانِ علاقہ نے کافی دلچسپی دکھائی۔ بلیماران کی شریف منزل میں مقیم حکیم اجمل خاں کے خاندان کے نبیرزادہ جناب مسرور خاں جو کہ شریف خانی حویلی میں ایک گیسٹ ہاؤس چلاتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ حکیم محمد حسن خاں پٹیالہ والے نے کسی زمانے میں حکیموں والی حویلی تعمیر کی تھی۔ یہ حویلی کافی طویل وعریض و وسیع تھی۔ اس کے بعد تقریباً 90 برس تک یہ ایک مالک سے دوسرے مالک کے پاس منتقل ہوتی رہی۔ آخر میں اس کو دہلی سرکار نے نیلام کر دیا۔ دلی کے ایک معزز شہری اور سماجی کارکن حاجی فاروق صاحب نے اس حویلی کو خریدا اور اب ان کے پوتے یہاں کیپٹل لیدر آرٹ اسٹور چلا رہے ہیں۔ حویلی کے دوسرے حصے کے بارے میں مسرور خان صاحب نے ہمیں بتایا کہ تقریباً 1960 کی دہائی میں اس کو حکیم محمد شریف نے جو کہ کانگریس پارٹی سے اس علاقے کے کارپوریشن ممبر بھی تھے، جناب محمد ابراہیم صاحب کو فروخت کر دیا۔ انھوں نے یہاں لکڑی اور کوئلے کی ٹال کھول لی۔ اس کے بعد جب مٹی کے تیل کے اور گیس کے چولھوں کا رواج بڑھا تو انھوں نے لکڑی کا کام چھوڑ کر بلڈنگ بنانے کا سامان فروخت کرنا شروع کر دیا۔

دہلی کی تاریخی گلی، گلی قاسم جان میں حویلیِ غالب کا دروازہ محراب نما اور اس کے اندر کی دیواریں دو چھتی لخوری اینٹوں سے بنی ہوئی تھیں۔ دائیں طرف ایک ایس۔ٹی۔ڈی۔ کی دکان اور بائیں جانب تین در ہوا کرتے تھے۔ تمام حویلی بڑی خستہ حالت میں تھیں اور در حقیقت در کتی، تڑختی دیواروں کے بیچ سے اکثر سبزہ زار دکھائی دیا کرتا تھا، ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ غالب کا یہ شعر: ’’اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے!‘‘

سات، آٹھ سال کی عمر کے بعد جب تھوڑا اور ہوش

آیا تو پتہ چلا کہ اگلے وقتوں میں کوئی نامی گرامی شاعر مرزا غالب کے نام سے ہوا کرتے تھے جو یہاں مکین تھے۔ اسی دور سے غالب کی اس قیام گاہ کے تعلق سے تجسس بڑھتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ رغبت بھی۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، غالب کی اہمیت کا اندازہ بھی ہوتا چلا گیا اور طبیعت کو یہ بات بھی ستانے لگی کہ آخر بین الاقوامی شہرت یافتہ اردو کے اس شاعر کی رہائش گاہ اتنی بدحال و نامراد کیوں ہے۔ راقم نے تب ہی سے اس بات کا فیصلہ کرلیا کہ اپنی تعلیم کے چلتے ہوئے یا اس کے بعد وہ غالب کے مکان کو ایک یادگار میں تبدیل کرانے کی مکمل جدوجہد کرے گا۔

برسرِ روزگار ہونے کے بعد راقم نے مختلف سرکاری ایجنسیوں، سیاست دانوں اور ایوان اقتدار سے جڑی چھوٹی بڑی ہستیوں سے تحریری گزارش کی کہ وہ لوگ حویلیِ غالب کو محفوظ کریں۔ کبھی میونسپل کارپوریشن تو کبھی علاقہ کے کارپوریٹر یا پارلیمانی ممبر یا کبھی مختلف وزارتوں کو خطوط لکھے گئے، جن کا جواب تک دینے کی کسی نے زحمت نہ کی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے غالب کو چاہنے والے تو بہت ہیں مگر ان کی حویلی کو محفوظ کرنے میں کسی کو دلچسپی نہ تھی۔

راقم بھی کہاں ہمت ہارنے والا تھا۔ اس نے اردو، ہندی و انگریزی کے جرائد و اخبارات میں مستقل طور سے بازیابیِ حویلیِ غالب کے تعلق سے مضامین تحریر کرنے شروع کر دیے۔ اسی دوران ہمارے ایک ہمدرد دوست اور معروف قانون داں جناب محمد اطیب صدیقی صاحب نے رائے دی کہ کب تک کاغذ کالے کرتے رہوگے، حویلیِ غالب محفوظ ہونے والی نہیں ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک حویلیِ غالب کو محفوظ کرانے کے لیے ایک مقدمہ برائے فلاح عامہ دہلی ہائی کورٹ میں دائر نہیں کیا جائے گا تب تک کوئی حاصل وصول نہیں ہونے والا۔ راقم کو یہ بات سمجھ میں آ گئی اور اس نے وکیل صاحب سے دریافت کیا کہ اس کے لیے کیا کرنا ہوگا۔ اس پر انھوں نے بتایا کہ راقم کسی کثیر الاشاعت انگریزی روزنامہ میں حویلیِ غالب پر مضمون شائع کرائے تا کہ اس کی بنیاد پر یہ مقدمہ برائے فلاح عامہ شروع کیا جائے۔ راقم نے 'ہندوستان ٹائمز' کے مورخہ 25 ستمبر 1996 میں ایک مضمون بعنوان 'اے کلچرل ڈیتھ' (A Cultural Death) شائع کرایا۔ اس کو مقدمہ دائر کرنے کی بنیاد کے طور پر استعمال کیا گیا۔ یہی نہیں راقم نے دیگر اردو، ہندی و انگریزی اخبارات میں بھی، جیسے ٹائمز آف انڈیا، انڈین ایکسپریس، دا ہندو، دا پائنیئر، السٹریٹڈ ویکلی، قومی آواز، راشٹریہ سہارا، سیاست، (حیدرآباد)، انقلاب (بمبئی)،

دھلی کی تاریخی گلی، گلی قاسم جان میں حویلی غالب کا دروازہ محراب نما اور اس کے اندر کی دیواریں دو چھتی لخوری اینٹوں سے بنی ھوئی تھیں۔ دائیں طرف ایک ایس۔ٹی۔ڈی۔ کی دکان اور بائیں جانب تین در ھوا کرتے تھے۔تمام حویلی بڑی خستہ حالت میں تھیں اور در حقیقت درکتی، تڑختی دیواروں کے بیچ سے اکثر سبزہ زار دکھائی دیا کرتا تھا، ٹھیک اسی طرح سے جیسے کہ غالب کا یہ شعر: ”اگ رھا ھے درو دیوار پہ سبزہ غالب/ ہم بیاباں میں ھیں اور گھر میں بہار آئی ھے!“

اردو ہفت روزہ، نئی دنیا، اخبارِ نو، عوام (دہلی)، نو بھارت ٹائمز، جن ستا، دینک ہندوستان، دینک جاگرن، پنجاب کیسری، ویرارجن، کبیر ٹائمز، جے وی جی ٹائمز وغیرہ میں بھی مضامین شائع کروائے۔

اس وقت حویلیِ غالب میں ہیٹر کا ایک کارخانہ تھا اور بلڈنگ مٹیریل کی فروخت کا سلسلہ تھا۔ وہاں پر بسے لوگ اتنی آسانی سے اس جگہ کو خالی کرنے والے نہیں تھے۔ حویلیِ غالب کا میونسپل وارڈ کے خسرہ کا مکان نمبر 2290 سے 2300 تک تھا جس کے لیے پٹیشن داخل کی گئی۔ یہ مقدمہ جسٹس چندر موہن نیر کے کورٹ میں لگا۔ مقدمے کو فلاحی تنظیم 'فرینڈز فار ایجوکیشن' کی معرفت راقم کو بطور اس کے چیئرمین داخل کیا گیا۔

درخواست میں کورٹ سے اپیل کی گئی کہ یادگارِ غالب میں ایک لائبریری، ایک چھوٹا سا میوزیم اور ایک دفتر و اسٹور بنایا جائے کہ جہاں غالب کے دیوان و تصاویر بآسانی میسر ہوں۔ اس کیس کے وکیل مسٹر صدیقی نے یہ اپیل بھی کی کہ حویلی کے اندر مقیم لوگوں کو ڈی۔ ڈی۔ اے۔ اور دلی میونسپل کارپوریشن کی طرف سے جلد از جلد ٹھیک اسی طرح سے متبادل جگہیں الاٹ کی جائیں کہ جیسے راقم کی کوششوں سے مزارِ ذوق کے سلسلے میں پہاڑ گنج کے نبی کریم علاقے کی چنیوٹ بستی کے سات مکان مالکوں اور دو دکانداروں کو دی گئی تھیں۔ دراصل مزارِ ذوق پر جو کہ کلو کا تکیہ قبرستان میں ہوا کرتا تھا، پارٹیشن کے بعد شرنارتھیوں نے قبضہ کرلیا تھا اور 1961 میں دہلی میونسپل کارپوریشن نے تمام مزارات وقبروں کو مسمار کر کے یہاں مردوں وخواتین کے بیت الخلا بنوا دیے۔ یہاں پر ایک نہ دو بلکہ پورے 14 بیت الخلا تھے جن میں 7 خواتین کے تھے تو باقی 7 مردوں کے تھے۔

حویلیِ غالب میں جو لوگ مقیم تھے، انھیں متبادل جگہیں فراہم تو کر دی گئی تھیں مگر ان سے وہ مطمئن نہ تھے۔ بقول شفیق الدین، حویلیِ غالب کو بچائے رکھنے میں ان کے والد جناب ابراہیم صاحب کی بڑی خدمات وقربانیاں تھیں۔ جو جگہ کورٹ کے آرڈر پر یادگارِ غالب کے لیے لی گئی تھی، اس میں سب سے بڑا حصہ شفیق الدین صاحب کا ہی تھا۔ انھیں شکایت تھی کہ جو جگہ انھیں دی گئی ہے، وہ مارکیٹ ریٹ کے اعتبار سے بہت کم ہے۔

عدالت میں وکیل صاحب کے ذریعے یہ تجویز بھی رکھی گئی کہ اس کام کی سرپرستی کے لیے ایک کمیٹی بھی بنائی جائے جو بطور پریشر گروپ یہ دیکھے کہ تمام شعبے صحیح وقت پر اپنے کام انجام دے رہے ہیں۔ کمیٹی کے ممبران میں جناب مشیر الحسن، قائم مقام وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، پروفیسر گوپی چند نارنگ، راقم، جناب مجتبیٰ حسین زیدی اور محکمۂ آثار قدیمہ، حلقۂ دہلی کے ڈائریکٹر جناب دھرم ویر شرما کے نام تجویز کیے گئے۔ یہ کمیٹی تو قائم ہوگئی مگر بہت زیادہ دنوں تک نہیں چلی کیونکہ کئی ممبران ہم خیال نہ

تھے۔ اس بات کے زیرِ نظر راقم نے عدالت کو رائے دی کہ اس قسم کی کمیٹیاں بہت دنوں تک متحد نہیں رہ پاتی ہیں، لہٰذا مناسب یہی رہے گا کہ سرکاری ایجنسیاں یا ادارے اس کام کو انجام دیں۔ تاریخیں لگتی گئیں اور آخر 8 اگست 1997 کو جسٹس چندر موہن نیر نے ایک تاریخی فیصلہ سنایا کہ 6 ماہ کے اندر دہلی سرکار کو چاہیے کہ غالب کی رہائش گاہ کو محفوظ کرکے اس شاعرِ عظیم کے شایانِ شان ایک ایسی یادگار تعمیر کی جائے کہ جو بے مثال ہو۔

اس کے بعد کا قصہ سنیے! جسٹس سی۔ ایم۔ نیر تو ایک تاریخ ساز فیصلہ دے کر سبکدوش ہو گئے مگر دہلی کی مختلف ایجنسیوں نے یادگار غالب کے ساتھ انصاف تو دور، کورٹ کے دس فیصد حکم کو بھی نہیں مانا۔ غالب کی چند فوٹو کاپی کی گئی تصاویر کو لیمینٹ کرا کر نہایت ہی بھونڈے طریقے سے چسپاں کر دیا گیا۔

جب راقم کو پتہ چلا کہ حویلیِ غالب کے اصل 412 گز رقبے کی جگہ کورٹ نے محض 130 گز جگہ ہی دی ہے، تو اسے بڑا اچنبھا ہوا۔ شروع میں تو کافی بڑا رقبہ تھا جس میں مسجد کو چھوڑتے ہوئے ''کیپٹل لیدر آرٹ اسٹور'' و دیگر دکانیں و مکانات شامل تھے۔ یہی نہیں، راقم نے پہلی منزل کو بھی اکوائر کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔

عدالت کے حکم پر، اس یادگار کی تعمیر کا ذمہ چونکہ دہلی سرکار کے ڈپارٹمنٹ آف آرکیٹیکچر کو دیا گیا تھا، اس کے انچارج اس وقت ایک مسٹر ماکھن لال ہوا کرتے تھے۔ ان سے جب راقم نے درخواست کی کہ تزئین کاری کے سلسلے میں اس سے رجوع کر لیں تو انھیں یہ بات کچھ ناگوار سی گزری جس کے بعد راقم نے وزیر اعلیٰ صاحبہ کو خط بھی لکھا۔ اس خط کا کوئی جواب نہیں آیا۔

اللہ، اللہ کر کے حویلی تیار کی گئی۔ 15 فروری 2000 کو جب اس حویلی کو دہلی سرکار کی جانب سے عوام الناس کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ایک بہت بڑی تقریب عمل میں آئی۔ مزے کی بات یہ کہ اس تقریب کا کوئی دعوت نامہ راقم کے پاس نہیں آیا۔ راقم کو جب میڈیا ایجنسیوں سے پتہ چلا کہ اس طرح کی کوئی تقریب ہے کہ جس میں دہلی سرکار اس حویلی کو اپنی جانب سے عوام کو پیش کر رہی ہے تو اس نے وہاں بن بلائے مہمان کی طرح ہی سہی، پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ تمام بازار بلی ماران و گلی قاسم جان کو پھولوں سے سجا دیا گیا تھا۔ دونوں جانب سے ٹریفک پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہمیں یہ سب بڑا عجیب و غریب محسوس ہو رہا

تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی صلے یا ستائش کی کوئی تمنا نہ تھی کیونکہ راقم نے اس حویلی کو غالب کے چاہنے والوں کے لیے ہی محفوظ کرانے کی نیت کی تھی۔ ہاں اسے یہ ضرور ناگوار گزرا کہ اس کی تحریک کو سیاستدانوں نے یرغمال کر لیا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں پر سرکار ایک ریڈنگ روم اور غالب پر مختلف زبانوں میں کتابوں اور اردو و ہندی میں ترجمہ شدہ دیوانوں کی فروخت کا سلسلہ شروع کرے کیونکہ اس جگہ روزانہ دنیا کے مختلف حصوں سے غالب کے چاہنے والے آتے ہیں۔ کم سے کم ان کے لیے اتنا تو ہو کہ وہ مطالعہ گاہ میں کچھ دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ لیں یا حویلی کے تعلق سے کچھ نوٹ کر لیں۔

حالانکہ حویلیِ غالب کسی کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ چہار دانگِ عالم میں ان کے چاہنے والوں کی میراث ہے۔ اب ہو یہ رہا ہے کہ کبھی کوئی فلمی ڈائریکٹر، کبھی دیگر سیاستداں، کبھی کوئی اور، غالب کے نام کو بھنا رہا ہے۔ یہ سچائی ہے کہ راقم نے اپنا قیمتی وقت دے کر اور اپنی خون پسینے کی کمائی سے غالب کی اس قیام گاہ کو محفوظ کرایا مگر کبھی اس شاعرِ عظیم کے نام کو بھنایا نہیں۔

اخیر میں راقم یہ بتانا چاہے گا کہ اس یادگار کو ایک جیتی جاگتی حویلی کی شکل میں زندہ رکھنے کے لیے اس نے وزیر اعلیٰ کو کئی مرتبہ خطوط دیے کہ اس میں وہ ایک ریڈنگ روم، غالب کی کتابوں و تصاویر کے لیے اسٹور یا اردو سے جڑی کوئی سرگرمی جیسے علاقے کے بچوں کے لیے کمپیوٹر پر اردو سکھانا جیسے کام جاری رہنے چاہئیں۔ افسوس کہ ان کی جانب سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بیچ میں راقم کو پتہ چلا کہ حویلی کے اندر گارڈ اس آثار قدیمہ کا غلط فائدہ اٹھا رہا ہے تو اس نے دوبارہ کورٹ میں شکایت کرکے اس نے وہاں سے ہٹوایا۔ یہ گارڈ کی ہی وجہ تھی کہ اس نے حویلی میں ولیمہ کی تقریبات وغیرہ کے لیے جگہ دینی شروع کر دی جس کی شکایت نہ صرف پولیس اسٹیشن اور دلی سرکار کو کی گئی بلکہ میڈیا کو بھی اس کی اطلاع دی گئی۔ آج بھی راقم کی دیرینہ خواہش ہے کہ اس یادگار کو زندہ یادگار بنایا جائے، شام کو یہ اندھیرے میں ڈوب جاتی ہے اور سوائے غالب کے یومِ پیدائش اور یومِ وفات کے، اس میں چراغاں نہیں ہوتا۔

کیا ہی اچھا ہو کہ یہاں پر سرکار ایک ریڈنگ روم اور غالب پر مختلف زبانوں میں کتابوں اور اردو و ہندی میں ترجمہ شدہ دیوانوں کی فروخت کا سلسلہ شروع کرے کیونکہ اس جگہ روزانہ دنیا کے مختلف حصوں سے غالب کے چاہنے والے آتے ہیں۔ کم سے کم ان کے لیے اتنا تو ہو کہ وہ مطالعہ گاہ میں کچھ دیر بیٹھ کر کچھ پڑھ لیں یا حویلی کے تعلق سے کچھ نوٹ کر لیں۔

■

Feeroz Bakht Ahmed
A-202, Adeeba Market & Apartments
Near Rahmani Masjid, Main Road, Zakir Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9810933050
Email.: ferozbakhtahmed08@gmail.com

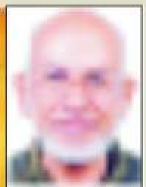

انیس الحسن صدیقی

قرانِ عطارد
(Transit of Mercury)

9 مئی 2016 کو ہماری دنیا کے لیے ایک آسمانی واقعہ قرانِ عطارد کے نام سے ہونے جارہا ہے۔ یہ واقعہ دن بھر ساڑھے سات گھنٹوں تک دنیا کے مختلف خطوں سے دکھائی دے گا لیکن ہمارے ہندوستان کی سرزمین سے ہندوستانی وقت کے مطابق شام کے چار بج کر 42 منٹ سے سورج کے غروب ہونے تک دیکھا جا سکتا ہے۔

دراصل قرانِ عطارد ایک ایسا آسمانی واقعہ ہے جو 3,10,3, 3,10,7,13 سالوں کے وقفے کے بعد واقع ہوتا ہے۔ پچھلی مرتبہ یہ 8 نومبر 2006 کو ہوا تھا۔ اب یہ تقریباً 10 سال کے بعد واقع ہونے جا رہا ہے۔ اس کے بعد یہ واقعہ 11 نومبر 2019 کو ہوگا۔ یہ سب سے لمبے وقفے یعنی ساڑھے سات گھنٹوں تک ہوگا لیکن ہندوستان میں کم وقفے کے لیے دکھائی دے گا۔ یہ آسمان میں بڑا ہی دلکش منظر ہے جس کے ذریعے لاکھوں لوگ لطف اندوز ہوتے ہیں اور دنیا کے ہیئت داں اور سائنسداں اپنے اپنے مشاہدوں اور تجربوں میں منہمک رہتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرانِ عطارد کیا ہے؟

قِران کے معنی گزرنے کے عمل کے ہیں لیکن علمِ ہیئت میں کسی مقام کی سمت الراس پر کسی جرمِ سماوی کا نظر آنے والا گزر یا سفر مانا گیا ہے۔ یہ اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ کسی چھوٹے جرمِ فلکی کا سورج کے سامنے سے گزر یا چاند کا کسی سیارہ کے سامنے سے ہو کر نکلنا ہے۔

سیارہ عطارد ہمارے شمسی نظام کے آٹھ سیاروں میں سے ایک ہے۔ یہ ہمارے سورج کے سب سے نزدیک اور سب سے چھوٹا چٹانی سیارہ ہے۔ اس کا قُطر 4, 879 کلومیٹر ہے۔ کثافت کے معاملے میں یہ ہمارے کرۂ ارض سے تقریباً ملتا جلتا ہے۔ ہمارے کرۂ ارض کی کثافت 5.515g/cm3 ہے جبکہ سیارہ عطارد کی 5.427g/cm3 ہے۔ اس کا ہمارے سورج سے اوسطاً فاصلہ 57,90,950 کلومیٹر ہے۔ یہ سیارہ ہمارے سورج کے گرد دوسرے سیاروں کے مقابلے میں بہت تیز گردش کرتا ہے یعنی تقریباً 48 کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے۔ اس سیارہ کف سورج کے گرد اپنا سفر طے کرنے میں ہمارے کرۂ ارض کے 88 دن لگتے ہیں لیکن اس کو اپنے محور پر گھومنے میں ہمارے کرۂ ارض کے 59 دن لگتے ہیں یعنی اس کا ایک دن سورج کے طلوع ہونے سے اور دوبارہ سورج کے طلوع ہونے تک ہمارے کرۂ ارض کے 59 دنوں کے برابر! اس سیارہ کے گرد کوئی بھی فضا نہیں ہے اور نہ ہی وہاں طوفان ہیں۔ اس لیے اس کی سطح پر سب سے زیادہ خلائی اجرام گرتے ہیں۔ اس سیارہ کی سطح پر بہت سارے سوراخ اور بڑے بڑے گڈھے ہیں۔ موسم نہ ہونے سے وہاں گڈھے ہمیشہ سے موجود ہیں۔ سیارہ عطارد پر دن کے وقت اتنی گرمی ہوتی ہے جتنی کہ ایک پڑا کے اوون میں لیکن رات کے وقت درجۂ حرارت 600 درجہ سینٹی گریڈ سے بھی زیادہ گر جاتا ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ سیارہ عطارد کی پتلی فضا سورج کی گرمی کو قائم نہیں رکھ سکتی ہے۔ 1974 میں سیارچہ میرینر۔دہم نے سیارہ عطارد کی سطح سے 100 کلومیٹر قریب جا کر نصف سیارہ کے فوٹو اتارے تھے۔

جب ہمارا چاند ہمارے کرۂ ارض کی گردش کرتے کرتے سورج اور کرۂ ارض کے درمیان حائل ہوتا ہے تو سورج گرہن واقع ہوتا ہے اور جب سیارہ عطارد یا سیارہ زہرہ اپنے اپنے مدار میں سورج کے گرد گردش کرتے کرتے سورج اور کرۂ ارض کے درمیان میں حائل ہوتے ہیں تو قرانِ عطارد یا قرانِ زہرہ کہلاتے ہیں جیسا کہ سیارہ عطارد اور سیارہ زہرہ ہمارے کرۂ ارض سے چھوٹے اور دور ہیں۔ اس لیے اپنے اپنے قران کے دوران ہمارے کرۂ ارض کی سطح سے سورج پر سے گزرتی ہوئی ایک بندی کے مانند دکھائی دیتے ہیں۔ قرانِ عطارد ایک صدی میں 13 مرتبہ ہوتا ہے۔ قرانِ زہرہ اور قرانِ عطارد بہت ہی دلکش آسمانی منظر ہیں۔

اگر اس واقعہ کی تاریخ کے پنّوں کا مطالعہ کیا جائے تو پتہ لگتا ہے کہ قرانِ زہرہ اور قرانِ عطارد نا معلوم کب سے آسمان میں واقع ہو رہے ہیں لیکن اس کا علم آج سے 400 سالوں پہلے تب ہوا تھا جب دوربین کا استعمال آسمانی اجرام کا مشاہدہ کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ سب سے پہلا قرانِ زہرہ کا مشاہدہ

7 نومبر 1631 میں فرانسیسی ہیئت داں پیئیری گسینڈی (Pierre Gasendi) نے کیا تھا جس کی پیشن گوئی جوہانس کیپلر (Johans Kepler) نے کی تھی۔ پھر 3 جون 1769 کو قرانِ زہرہ اور 9 نومبر 1769 کو قرانِ عطارد کا مشاہدہ کیپٹن کوک (Captin Cook) اور ہیئت داں چارلس گرین (Charles Green) نے اپنے عالمی سمندری مشن کے دوران کی کیا تھا۔ برطانوی ہیئت داں جیریمی شیکرلے (Jeremy Shakerley) نے ہندوستان کی سرزمین میں سورت کے مقام سے 24 اکتوبر 1651 میں قرانِ عطارد کا اپنی دوربین کے ذریعے کیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ 1874 میں قرانِ زہرہ کا مشاہدہ جناب ڈاکٹر رگھوناتا چاری ایف آر اے ایس کے ذریعے ہندوستان کی سرزمین سے کیا گیا تھا اور انھوں نے اس واقعہ کو اردو زبان میں کتاب قرانِ زہرہ میں قلم بند کر کے شائع کیا تھا۔ یہ کتاب آج کل ناپید ہے لیکن پھر بھی اس کتاب کا ایک نسخہ وگیان پرسر, C-49 قُطب انسٹی ٹیوشنل ایریا نئی دہلی۔16 کے پاس موجود ہے جس کی ایک فوٹو کاپی راقم الحروف کو وہاں کے ڈائریکٹر صاحب نے اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ کے لیے 2004 میں قرانِ زہرہ کے واقعہ کے موقع پر دی تھی۔ یہ کتاب پُرانی اردو میں ہے۔

اُنیسویں صدی کے بعد اکیسویں صدی میں 8 جون 2004 کو قرانِ زہرہ کا مشاہدہ جو کہ 105 1/2 سالوں بعد واقع ہوا تھا۔ دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں کے ذریعے دیکھا گیا تھا۔ دنیا بھر کے سائنسدانوں اور ہیئت دانوں نے اس کی پہلے ہی سے تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ پچھلے تمام مشاہدوں میں جو اڑچنیں آئی تھیں اُن کا حل نفیس ترین آلات کے ذریعے نکال لیا گیا تھا مثلاً سیارہ زہرہ سے سورج تک کا فاصلہ ناپنے کے لیے سیاہ اثر ایک بڑی اڑچن تھی جس کی وجہ سے سیارہ زہرہ کی بندی سورج کو چھونے کا صحیح وقت معلوم نہیں کرنے دیتی تھی اس لیے

سیارہ زہرہ کی بندی کس وقت سورج کو چھوتی ہے اور کس وقت سورج کو چھوڑتی ہے ان دونوں موقعوں کا صحیح وقت جاننے کے لیے پہلی مرتبہ راڈار کا استعمال کیا گیا تھا جو کہ اس صدی کا بہت ہی کامیاب تجربہ تھا۔ پھر 6 جون 2012 کے قرانِ زہرہ کے مشاہدہ کے بارے میں دنیا بھر کے تمام سائنسداں اور ہیئت داں کو پوری امید تھی کہ بہترین نفیس ترین آلات ایجاد ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعے ہمارے شمسی نظام کے باہر دودھیہ کہکشاں میں جتنے بھی رہائشی سیارے موجود ہیں قرانِ زہرہ کے اس چھوٹے سے

سورج کے سامنے سے گزرنے کا راستہ عالمی وقت کے مطابق پونے پانچ گھنٹے

راستہ جو ساڑھے سات گھنٹوں میں طے ہوگا عالمی وقت کے مطابق

سیارہ عطارد کے گڈھے بالکل ہمارے چاند کی طرح لگتے ہیں اور یہ ہمیں اس کے ادوار بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کے ساتھ سورج کا دھبہ بھی نظر آرہا ہے۔

قران عطارد دوم (8 نومبر 2008) کے ساتھ سورج کا دھبہ بھی نظر آرہا ہے۔

وقفے میں ان کا مشاہدہ کر کے پتہ لگ سکتا ہے کہ رہائشی سیاروں میں انسانوں کی طرح ذہین زندگی (Intelligent life) موجود ہے کہ نہیں۔ اس صدی کے سب سے بڑے تجربے کی کامیابی پر ہمارے سیارہ کُرۂ ارض کی ذہین زندگی کی سوچ میں ایک بہت بڑا نیا موڑ آیا ہے۔ قرانِ زہرہ چھ گھنٹے قائم رہا تھا یعنی سیارہ زہرہ کو سورج کی سطح پار کرنے میں چھ گھنٹے صرف ہوتے ہیں اور قرانِ زہرہ کے شروع ہوتے ہی سیارہ کُرۂ ارض کی سطح پر سورج کی چمک میں کمی محسوس ہوئی تھی اور اس چمک کی کمی میں ہماری نفیس ترین دوربینوں کی قطار کے ذریعے رہائشی سیاروں کا مطالعہ کیا گیا تھا حالانکہ چھ گھنٹوں کا وقفہ بہت کم تھا لیکن کمپیوٹروں اور بصری نفیس ترین دوربینوں کی قطار کے ذریعے بہت کچھ ممکن ہوا تھا جس کے لیے پہلے سے تیاریاں کی گئی تھیں۔

بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہمارے ملک ہندوستان میں علمِ ہیئت میں بہت ہی زیادہ دلچسپی کی ایک تاریخ ہے جو کہ سنہری لفظوں میں لکھی گئی ہے اور اس ماڈرن زمانے میں تو اور بھی زیادہ ہے۔ آج کل ہندوستان کے بڑے شہروں میں نہرو اور برلا پلینیٹوریم (تارہ منڈل) کے ناموں سے مشاہدہ گاہیں موجود ہیں جہاں ہر طالبِ علم کو علمِ ہیئت کے بارے میں مفت میں ٹریننگ دی جاتی ہے۔ علمِ ہیئت سے متعلق تازہ ترین و جدید فلمیں دکھائی جاتی ہے۔ ہیئت دانوں و سائنسدانوں کے ذریعے لیکچروں کا اہتمام کیا جاتا ہے اور ہیئتی و سائنسی سمیناروں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے اور فلکیاتی واقعہ کے وقت تمام پبلک کو اس کا مشاہدہ کرنے کے لیے مدعو کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس تاریخی واقعہ کا مشاہدہ کرنے کے لیے آپ کسی بھی نزدیکی تارہ منڈل سے ٹیلیفون یا انٹرنیٹ کے ذریعے براہ راست جانکاری حاصل کر سکتے ہیں اور آسانی سے مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ نہیں تو 9 مئی 2016 کو قرانِ عطارد کا مشاہدہ کرنے کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں کے ذریعے آپ خود بھی کر سکتے ہیں:

1. سورج، سورج گرہن یا قرانِ سیارہ کا مشاہدہ بذریعہ کھلی آنکھ یا دوربین یا بائنا کلر بغیر سولر فلٹر کے کرنا بہت ہی زیادہ نُقصاندہ ہے۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو آپ کی آنکھوں کی بینائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا سکتی ہے۔ اس لیے آپ کبھی بھی براہ راست اپنی کھلی آنکھوں یا دوربین کے بغیر فلٹر کے یا دھوپ کے چشمہ کے ذریعے سورج، سورج گرہن یا قرانِ سیارہ کا کبھی بھی مشاہدہ نہ کریں۔ اس کے مشاہدہ کے لیے سولر ویوور (Solar viewer) جس پر سولر فلٹر لگا ہوتا ہے آسانی سے پچاس سے سو روپے تک آپ شہر کے پلینیٹوریم (تارہ منڈل) یا اسپیس تنظیموں سے حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ سولر فلٹر سورج حفاظتی کالی پولیمر (Sun safe black polymer film) کے ذریعے بنایا جاتا ہے جو کہ امریکہ کی ایک فرم تھاؤزینڈ اوکس آپٹیکل (Thousand oaks optical) مہیا کرتی ہے۔ پچھلے قرانِ زہرہ اور قرانِ عطارد کے موقعوں پر وِگیان پراسر C-24 قُطب انسٹی ٹیوشنل ایریا، نئی دہلی۔ 16 (ٹیلیفون نمبر 011-26967532) نے سولر کِٹ (Solar kit) کے نام سے ایک پیکٹ جس میں سورج گرہن، چاند گرہن و قرانِ سیارہ سے متعلق تمام معلومات 250 روپوں میں مہیا کیے تھے جس میں سولر ویوور بھی شامل ہے امید ہے کہ اس موقعے پر بھی یہی کِٹ آپ وگیان پراسر سے حاصل کر سکتے ہیں اور قران عطارد و دیگر تجربے خود بھی کر سکتے ہیں۔

2. قرانِ عطارد یا سورج گرہن کا حفاظتی مشاہدہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ سولر فلٹر کو اپنی دوربین یا بائنا کلر پر لگا کر بذریعہ دوربین یا بائنا کلر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ سولر فلٹر آپ کا جعلی نہ ہو بلکہ یہ سولر فلٹر سورج حفاظتی کالی پولیمر فلم امریکہ کی تھاؤزینڈ اوکس آپٹیکل کا اصلی ہی ہو۔ یہ مہنگا ضرور ہے لیکن آپ کے آنکھوں کی بینائی کے مقابلے میں سستا ہے۔

3. تیسرا حفاظتی طریقہ معمولی منعطفی دوربین (Refrector Telescope) یا بائنا کلر کی مدد کے ذریعے سورج کا عکس ایک کاغذ یا دیوار پر ڈالنے کا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ کو ایک مستطیل نما گتے کا ڈبہ جس کا سائز 4' x 1' x 1 1/2' ہو بنانا ہوگا۔ اس ڈبے کے ایک طرف اپنی معمولی دوربین یا بائنا کلر آئی پیس کی طرف سے ڈبے میں فٹ کرنے کے لیے اس کے حساب سے سوراخ کر لیے جائیں تا کہ ان سوراخوں پر اُلٹی دوربین یا اُلٹا بائنا کلر فٹ آسکے۔ ڈبے کی لمبی سائیڈ میں 1' x 1' کے برابر ایک کھڑکی سورج کا عکس دیکھنے کے لیے کھولی جائے۔ اب یہ ڈبہ سورج کا عکس ایک کاغذ پر ڈالنے کے لیے تیار ہے۔

اب آپ اپنی معمولی منعطفی دوربین یا بائنا کلر لگے ہوئے ڈبے کو دھوپ میں رکھیں گے تو دوربین یا بائنا کلر کی پرچھائیں ڈبے کی سائڈ پر پڑے گی۔ اب ڈبے کو ذرا اس طرح سورج کی طرف ترچھا کریں تا کہ دوربین یا بائنا کلر کی پرچھائیں بالکل ختم ہو جائے۔ جیسے ہی ایسا ہوگا ویسے ہی سورج کا عکس ڈبے کے اندر ظاہر ہو جائے گا۔

سورج کے عکس میں آپ کو ایک بندی بھی دکھائی دے گی اور یہ بندی بہت ہی آہستہ آہستہ سفر کرتی نظر آئے گی۔ اس کا دھیان رکھیں کہ اس ڈبے پر اپنی دوربین کا ذرا سا بھی سایہ بننے نہ دیں کونکہ دھوپ مسلسل اسپیڈ کے ساتھ جا رہی ہے۔ اگر آپ سورج کے عکس کو کاغذ پر اتارنے میں کامیاب ہو سکتے ہوں تو آپ اس عکس کی مدد سے اور ریاضی کے فارمولوں کے ذریعے اپنے کُرۂ ارض سے سورج کا فاصلہ، سورج کا قُطر، سیارہ عطارد کا قُطر وغیرہ کا حساب کتاب لگا سکتے ہیں۔ صرف آپ کو اپنے سائنس کے اُستاد کی دیکھ ریکھ میں یہ تجربہ کرنا ہوگا۔

■

Aneesul Hasan Siddiquj 679, Sector - 22B,
Gurgaon - 122015 (Haryana)
Mob.:9654949434
E-mail.: aneessiddiqui2003@gmail.com

(1) مثنوی 'کدم راؤ پدم راؤ' کو کس نے مرتب کر کے شائع کیا؟
(الف) ڈاکٹر جمیل جالبی (ب) پروفیسر مسعود حسین خان
(ج) ڈاکٹر زور (د) پروفیسر گیان چند جین

(2) 'دکن میں اردو' کس کی کتاب ہے؟
(الف) عبدالحق (ب) سید شمس اللہ قادری
(ج) نصیر الدین ہاشمی (د) ڈاکٹر جمیل جالبی

(3) مثنوی 'نوسرہار' کا سنہ تصنیف کیا ہے؟
(الف) 1502 (ب) 1501
(ج) 1504 (د) 1503

(4) مثنوی 'خوش نغز' کتنے اشعار اور ابواب پر مشتمل ہیں؟
(الف) 73 اشعار 8 ابواب
(ب) 70 اشعار 10 ابواب
(ج) 71 اشعار 6 ابواب
(د) 72 اشعار 9 ابواب

(5) چندا اور لورک کس مثنوی کے کردار ہیں؟
(الف) بہرام و گل اندام (ب) پھول بن
(ج) میناستونتی (د) طوطی نامہ

(6) 'کلمۃ الحقائق' کس کی تصنیف ہے؟
(الف) حضرت بندہ نواز گیسو دراز
(ب) میراں جی شمس العشاق
(ج) برہان الدین جانم
(د) شاہ امین الدین اعلیٰ

(7) مثنوی 'سیف الملوک و بدیع الجمال' کس بادشاہ کے زمانہ حیات میں لکھی گئی؟
(الف) سلطان محمد قلی قطب شاہ
(ب) سلطان ابراہیم قطب شاہ
(ج) سلطان محمد قلی قطب شاہ
(د) سلطان نظام شاہ

(8) ڈاکٹر زور نے کس مثنوی کو دکن کی بہترین مثنوی قرار دیا ہے؟
(الف) قصہ بے نظیر (ب) جنت سنگار
(ج) خاور نامہ (د) میزبانی نامہ

(9) کس مثنوی کو دکن کا شاہنامہ قرار دیا گیا؟
(الف) خاور نامہ (ب) علی نامہ
(ج) من لگن (د) قطب مشتری

(10) 'پھول بن' میں کتنے مرکزی قصے ہیں؟
(الف) تین (ب) پانچ
(ج) چھ (د) چار

(11) ان میں سے رزمیہ مثنوی کون سی ہے؟
(الف) قطب مشتری (ب) علی نامہ
(ج) طوطی نامہ (د) میناستونتی

(12) کس کی فرمائش پر ملک خوشنود نے مثنوی جنت سنگار لکھی؟
(الف) سلطان سکندر عادل شاہ
(ب) سلطان علی عادل شاہ ثانی
(ج) سلطان اسماعیل عادل شاہ
(د) سلطان محمد عادل شاہ

(13) فائز کی مثنوی 'رضوان شاہ و روح افزا' کے بارے میں یہ الفاظ کس نے کہے؟
''یہ قطب شاہی عہد کی آخری مثنوی ہے اور دکنی اردو کو ریختہ سے ملانے والی پہلی مثنوی ہے''
(الف) عبدالحق
(ب) ڈاکٹر زور
(ج) نصیر الدین ہاشمی
(د) پروفیسر اشرف رفیع

(14) احمد جنیدی نے مثنوی 'ماہ پیکر' کب لکھی؟
(الف) 1064ھ (ب) 1062ھ
(ج) 1065 (د) 1063

(15) ابوالحسن تاناشاہ کے عہد میں کون سی مثنوی لکھی گئی؟
(الف) پھول بن (ب) ماہ پیکر
(ج) نجات نامہ (د) بہرام وگل واندام

(16) 'یوسف زلیخا' دبستان گولکنڈا کی پہلی مثنوی ہے، یہ الفاظ کس کے ہیں؟
(الف) عبدالقادر سروری (ب) ڈاکٹر جمیل جالبی
(ج) پروفیسر گیان چندجین
(د) شمس الرحمٰن فاروقی

(17) غواصی کی مثنوی 'مینا ستونتی' کو کس نے مرتب کرکے شائع کیا ہے؟
(الف) غلام عمر خان (ب) غلام محمد خان
(ج) عمر خان (د) میر سعادت علی رضوی

(18) 'طوطی نامہ' 1639 میں بہ عہد عبداللہ قطب شاہ کے کس شاعر نے لکھی:
(الف) فیروز (ب) غواصی
(ج) قدرتی (د) نصرتی

(19) 'روضۃ الشہدا' کا اردو ترجمہ کس نے کیا؟
(الف) قدرتی (ب) ملک خوشنود
(ب) فیروز (د) احمد جنیدی

(20) 'اردو مثنوی کا ارتقا' کس کی کتاب ہے؟
(الف) گوپی چند نارنگ (ب) آل احمد سرور
(ج) عبدالقادر سروری (د) وزیر آغا

(21) مثنوی کے بارے میں یہ الفاظ کس کے ہیں؟
''یہ صنف تمام انواع شاعری کی بہ نسبت زیادہ مفید، زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے''
(الف) حالی (ب) شبلی
(ج) محمد حسین آزاد (د) علی سردار جعفری

(22) 'منوہر' کس مثنوی کا کردار ہے؟
(الف) گلشن عشق (ب) قطب مشتری
(ج) سیف الملوک بدیع الجمال
(د) خاور نامہ

(23) مثنوی کس زبان کا لفظ ہے؟
(الف) ترکی (ب) عربی
(ج) فارسی (د) دکنی

(24) کس بادشاہ کے عشق کی داستان قطب مشتری میں بیان کی گئی ہیں؟
(الف) محمد قلی قطب شاہ (ب) عبداللہ قطب شاہ
(ج) محمد قطب شاہ (د) ابراہیم قطب شاہ

(25) اردو کا پہلا مثنوی نگار کون ہے؟
(الف) نصرتی (ب) فخر دین نظامی
(ج) غواصی (د) ابن نشاطی

(26) شمالی ہند کی قدیم ترین مثنوی 'فقہ ہندی' کس نے لکھی؟
(الف) محبوب عالم (ب) جعفر زٹلی
(ج) فائز (د) شیخ عبداللہ امین

(27) سودا نے کل کتنی مثنویاں لکھی ہیں؟
(الف) 21 (ب) 23
(ج) 24 (د) 20

(28) میر تقی میر نے کس مثنوی میں پرس رام اور اس کی بیوی کا قصہ بیان کیا ہے؟
(الف) شعلۂ عشق (ب) دریائے عشق
(ج) اعجاز عشق (د) خواب وخیال

(29) سعادت یار خان رنگین کی مثنوی 'دل پذیر' کے بارے میں یہ الفاظ کس کے ہیں؟
''اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سحرالبیان اور 'گلزار نسیم' کے بعد شمالی ہند کی بہترین داستانی مثنوی ہے''
(الف) فرمان فتح پوری (ب) گوپی چند نارنگ
(ج) وہاب اشرفی
(د) پروفیسر گیان چندجین

(30) 'بحرالمحبت' مثنوی کس نے لکھی؟
(الف) انشا (ب) خواجہ میر اثر
(ج) مصحفی (د) رنگین

(31) مثنوی 'زہر عشق' کا پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا؟
(الف) 1861 (ب) 1862
(ج) 1863 (د) 1864

(32) 'لکھنؤ کی تہذیبی تاریخ' کس مثنوی کو کہا جاتا ہے؟
(الف) بوستانِ خیال (ب) فریبِ عشق
(ج) گلزار ارم (د) سحرالبیان

(33) مثنوی 'سحرالبیان' کو نثر میں کس نے 'نثر بے نظیر' کے نام سے پیش کیا؟
(الف) میر امن (ب) میر شیر علی افسوس
(ج) کاظم علی جواں (د) میر بہادر علی حسینی

(34) محمد حسین آزاد نے کس مثنوی کو تمثیلی انداز میں لکھا؟
(الف) خوابِ امن (ب) شبِ قدر
(ج) دادِ انصاف (د) موسمِ زمستاں

(35) مثنوی 'گلزارِ نسیم' کب شائع ہوئی؟
(الف) 1841 (ب) 1844
(ج) 1843 (د) 1845

صحیح جوابات

1. الف	2. ج	3. د	4. د	5. ج
6. ج	7. الف	8. ج	9. ب	10. الف
11. ب	12. د	13. د	14. الف	15. د
16. ب	17. الف	18. ب	19. الف	20. ج
21. ب	22. الف	23. ب	24. الف	25. ب
26. د	27. ج	28. الف	29. د	30. ج
31. ب	32. د	33. د	34. الف	35. ب

■

Imteyaz Ahmad Olai Research Scholar, Punjabi University, Patiala (Punjab)

کلیات مصحفی (جلد نہم)

شاعر: مصحفی امروہوی
صفحات: 395 قیمت: 189 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دلّی
مبصر: خلیق الزماں نصرت، فلیٹ نمبر 15، بلڈنگ نمبر 4 پہلی منزل سائی نگر کالونی، بھیونڈی، مہاراشٹر

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہہ میں 1750 میں پیدا ہوئے۔ پہلے دلّی اور اس کے بعد لکھنؤ آئے۔ مرزا سلیماں شکوہ کی سلطنت میں ملازم ہوئے اور شکوہ کا کلام دیکھنے لگے۔ مصحفی کی قادر الکلامی مسلّم تھی۔ سیکڑوں شاگرد ہوئے۔ اردو میں آٹھ دیوان شائع ہوئے، قصیدے کا یہ مجموعہ نواں اور آخری مجموعہ ہے۔ اس طرح مصحفی کا تمام کلام مکمل ہوگیا۔ قصیدے میں اپنے ممدوح کی تعریف وتوصیف بیان کی جاتی ہے۔ کلیات مصحفی، جلد نہم میں حمد سے ابتدا ہے:

قابلِ حمد و ثنا ہے وہ خدا وندِ کریم — جس نے انساں کے تئیں طرزِ سخن کی تعلیم
علم حکمت کیا اس نے عطا آدم کو — جس نے افہامِ بنی نوع پہ پائی تقسیم

پھر نبی کریمؐ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ منقبت حضرت امیر، مدح حضرت امام حسن، مدح حضرت امام حسین اس کے آگے کئی قصیدے، صاحب عالم جہاندار شاہ، نواب وزیر آصف الدولہ، صاحب عالم سلیمان شکوہ اور دیگر امراء وسلاطین کی مدح میں ہیں۔ ہزاروں مدح کے انداز میں چند ایک دیکھے جاسکتے ہیں:

فلک وقار سلیماں شکوہ عالی جاہ — کہ جس کا غاشیہ لے کر چلے ہے شہ چنگار
خموش مصحفی اتنا نہ دے کلام کو طول — ادب کی جا ہے میاں بادشاہوں کا دربار
زباں کو بند کر اور دعا میں ہاتھ اٹھا — رجوع دل سے بہ درگاہ داور دوّار

شاعر کے قصیدے کے مطالعے سے بادشاہوں نوابوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ کا پتہ لگتا ہے۔

ان میں بھی باکمالوں کی خوبیاں اور علمی مسائل بھی ہیں۔ ان قصیدوں سے مصحفی کی علمیت، قابلیت اور قادر الکلامی کا علم ہوتا ہے، مشکل زمینوں میں قصیدے کہہ کر مصحفی نے اپنی استادی کا لوہا منوالیا ہے، ان میں بے ساختگی اور برجستگی ہے، پڑھنے والوں کو شک بھی نہیں ہوتا ہے کہ مصحفی نے کہیں غلو سے کام لیا ہے، چاہے وہ ممدوح کا ذکر ہو یا اس کی تعریف ہو۔

مصحفی نے اپنے قصیدے میں سودا سے خود کو بہتر بتایا ہے (قصیدہ نمبر 11/12,44) اس سے اختلاف کی گنجائش پیدا تو ہوئی تھی لیکن جو گناہ انھوں نے نہیں کیا اس کے لیے انھوں نے قصیدہ نمبر 63 میں صفائی پیش کردی ہے، یہ عمل لائق تحسین ہے اسے شاعری میں ایک اضافہ کہا جاسکتا ہے، ایسے موقعے پر شعر میں مصحفی کی متانت دیکھی جاسکتی ہے، ایسی حالت سے مصحفی پر ذہنی وفکری اور جھنجھلاہٹ کا ذرہ برابر اثر نہیں ہوتا ہے، روش عام سے ہٹ کر مصحفی نے راہ نکالی ہے۔ ہوا یوں کہ سودا اور مصحفی کے تعلقات کو اور زیادہ خراب کرنے کے لیے کسی شریر شاعر نے سودا کی ہجو کہہ کر مصحفی کے نام سے منسوب کردیا، سودا اور ان کے شاگرد مصحفی سے ناراض ہوگئے۔

ان میں سے دوسرے قصیدہ نگاروں کی طرح ایسے بھی قصیدے ہیں جن کا کما حقہ سمجھ لینا بہت مشکل ہے۔ وہ زمانہ اور تھا جس میں علم کے قدر داں موجود تھے۔ ان کی زبان فارسی تھی۔ ان قصیدوں کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کس موقع پر کہے گئے ہیں۔ یہ بھی بتایا جائے اس لیے نورالحسن نقوی (ترتیب وتدوین) نے اپنے مقدمے میں ایسے قصیدوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس سے پڑھنے والوں میں دلچسپی پیدا ہوئی ہے۔

آخر میں فرہنگ بھی ہے اسے مرتب کی جانفشانی کہی جاسکتی ہے۔ یہ تمام کام بڑی پتہ ماری کا ہے۔ اصل مسودے میں عنوانات نہیں تھے۔ اس کے لیے عنوانات دیے گئے ہیں۔ قصیدے عہد بہ عہد ترتیب دیے گئے ہیں۔ یہ نسخہ کئی نسخوں کو سامنے رکھ کر شائع کیا گیا ہے، مرتب نے حواشی کے عنوان سے کئی نسخوں کا مطالعہ کرکے اختلافات کا جائزہ لیا ہے اور اسے بطور ضمیمہ کتاب کے آخر میں شامل کیا گیا ہے، یہ بھی ایک معلوماتی پہلو ہے، اس کے مطالعے سے ہم جان جائیں گے کہ تحقیق کے لیے کتنی مشقت درکار ہے، یہ کام آسان نہیں۔

انشا سے چپقلش ہوئی تو مصحفی نے ہجو یعنی اس کی تحقیر یا مذمت کے لیے اشعار لکھے جو ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ اس میں شامل ہیں۔

قومی اردو کونسل نے قدیم شعراء کے تذکرے اور کلیات کو ترتیب دینے کا کام زور شور سے شروع کیا ہے۔ اب اس عمل میں بڑی تیزی آگئی ہے۔ اور اسے بحسن خوبی انجام دیا جارہا ہے۔ اس سے اردو ادب میں اضافہ ہوگا۔

پڑھنے والوں کو گذرے ہوئے دنوں کے ثقافتی ادبی اور تہذیبی روایات معلوم ہوسکیں گے۔ اس کتاب کی قیمت عام کتابوں کے بہ نسبت بہت کم ہے اور کاغذ بہت نفیس ہے۔

اردو کی کہانی

مصنف: سید احتشام حسین
صفحات: 104، قیمت: 25 روپے، ساتویں طباعت: 2015
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد جسیم الدین، بی 633، فورتھ فلور، گلی نمبر 9، ذاکر نگر، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب پروفیسر سید احتشام حسین کی تصنیف ہے، پروفیسر موصوف کا مقصد اس تصنیف سے یہ تھا کہ باشندگان ہند کو اپنی زبان کی تاریخی حیثیت کا علم ہوجائے، اردو ادب کی تہذیبی خصوصیات سے بھی واقفیت حاصل ہوجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں بھی اس زبان کا ناقابل فراموش کردار رہا ہے، اس سے

بھی آگہی ضروری ہے، انھیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس مختصر کتاب میں اردو کی کہانی کو تاریخی انداز میں بیان کیا گیا ہے، پروفیسر احتشام حسین نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا اس زبان کے ساتھ زیادتی ہے۔ یہ زبان اسی ملک میں پروان چڑھی، یہ بدقسمتی ہے کہ اس کی تاریخ پر گرد ڈالنے کی کوشش ہورہی ہے اور اردو کو ایک خاص طبقے کی زبان قرار دینے کوشش کی جارہی ہے۔ پروفیسر احتشام کی یہ تصنیف اس وقت منظر عام پر آئی جب ملک میں قومی یکجہتی کی بات ہورہی تھی اور زبانوں سے واقفیت کا شوق لوگوں میں بڑھ رہا تھا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ پروفیسر احتشام حسین کی یہ تصنیف آج بھی اسی قدر مقبول ہے، جتنی کہ ان کی زندگی میں تھی۔ اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ازسرنو طباعت کرا کر اردو والوں کو اردو کی کہانی سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر احتشام حسین کا شمار اردو کے نام نامور نقادوں میں ہوتا ہے، خاص طور پر ترقی پسند تنقید کا ذکر ان کے نام کے بغیر نامکمل ہے، لیکن وہ صرف نقاد ہی نہیں تھے، بلکہ استاد، افسانہ نگار، سفرنامہ نگار، ڈرامہ نگار اور شاعر بھی تھے۔ ان کے نامور شاگرد بر صغیر ہندو پاک میں پھیلے ہوئے ہیں، جنھوں نے ہر جگہ ان کے نام کو سربلند رکھا ہے۔

کتاب 'اردو کی کہانی' میں انھوں نے زبانوں کا گھر ہندوستان کے عنوان سے پہلے اردو زبان کا ہندوستان میں کیا پس منظر رہا اس کو بیان کیا ہے، پھر اردو زبان کی ابتدا کیسے ہوئی اس پر روشنی ڈالی ہے، دلی کی شاعری، ترقی کا زمانہ، پچھم سے پورب تک، نظیر اکبرآبادی، دبستان لکھنؤ، نثر کی ترقی، دلی میں ایک بہار اور، نئی منزل کی طرف، کچھ نئے کچھ پرانے، نیا زمانہ نیا ادب اور کچھ ضروری اشارے جیسے جلی عناوین کے تحت اردو کی تاریخی حیثیت کو عام فہم انداز میں بالتفصیل بیان کیا ہے۔ زبان کی اہمیت کے تعلق سے کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر سید احتشام حسین خود رقمطراز ہیں کہ ''ہر بچہ جو تندرست ہے کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ وہی زبان بولتا ہے جو اس کے باپ یا اس کے گردوپیش رہنے والے استعمال کرتے ہیں، یہی اس کی اصل زبان ہوتی ہے۔ بڑا ہوکر وہ کئی اور زبانیں سیکھ لیتا ہے، لیکن اس کے جذبات اور خیالات کی زبان وہی ہوگی، جس میں اس نے ابتداء بات کرنا سیکھا ہے اور جسے وہ برسوں کام میں لاتا ہے، اپنی زبان سے بچہ کا یہ تعلق جذباتی ہوتا ہے، ہمارے تعلیمی نظام کا فرض ہے کہ اس تعلق کو علمی اور پائیدار بھی بنائے، اس لیے ہر شخص کے لیے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی زبان کی تاریخ اور ادب کی رفتار سے واقف ہو۔''

پروفیسر موصوف کا یہ خیال ان کی دور بینی اور فراست کو بتاتا ہے کہ وہ اپنی نئی نسل کے لیے کس قدر فکرمند تھے۔ یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اپنی تاریخ اور وراثت کی حفاظت کے لیے زبان کا بھی تحفظ ضروری ہے، زبان کی بقا کا انحصار اس کے بولنے والوں پر ہے، اگر اردو زبان کو زندہ و پائندہ بنانا ہے تو اس کے لیے اردو کے محبین و مخلصین کو سمینار و کانفرنس کی حدود سے باہر نکال کر اس کو عام کرنا ہوگا، تبھی پروفیسر احتشام حسین کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ احتشام حسین مارکسی تنقید نگار ضرور تھے، لیکن ادب کے بارے میں وہ ایک وسیع نظریہ رکھتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب ہم لفظ تہذیب استعمال کرتے ہیں تو اسے کسی قوم یا ملک کے داخلی یا خارجی زندگی کے تمام اہم پہلوؤں سے مجموعی طور پر پیدا ہونے والی وہ امتیازی خصوصیات مراد ہوتی ہیں جنھیں اس ملک کے لوگ عزیز رکھتے ہیں اور جن کے حوالے سے وہ دنیا میں پہچانا جاتا ہے۔ انسان قدروں کے بنانے اور محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں اپنی قومی تہذیب پیدا کرتا ہے۔ وہ تہذیب اس کے ماضی سے ہم آہنگ ہوتی ہے اور دنیا کی عام رفتار ترقی سے نسبت رکھتی ہے۔ تہذیب قومی زندگی کی ساری جذباتی، روحانی اور مادی امنگوں اور خواہشوں کا احاطہ کرلیتی ہے۔ اس کو بناتی اور سنوارتی ہے، اسے ایک ایسا نصب العین بخشتی ہے جو زمانے کی ضروریات کا ساتھ دے سکے۔ وہ ان ساری طاقتوں کو سمیٹے ہوئے آگے بڑھتی ہے جو ماضی نے اسے عطا کی ہیں۔'' پروفیسر موصوف کی یہ کتاب اپنی زبان سے محبت اور اس کی خدمت کا صحت مند جذبہ پیدا کرے گی۔ قومی کونسل کا یہ اقدام قابل ستائش ہے کہ اس نے اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھا ہے۔

کلیات ابراهیم یوسف

مرتب: محمد نعمان خان
صفحات: 718 (جلد اول) 786 (جلد دوم)
قیمت: چار جلدوں کا مکمل سیٹ 1343 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: زیب النسا سعید، شعبۂ اردو، سی ایم پی ڈگری کالج (الہ آباد یونیورسٹی) الہ آباد

ابراہیم یوسف (15 مئی 1925، 30 اکتوبر 1999) اردو کے معروف ڈرما نگار، ادیب اور نقاد تھے۔ ان کی تحریروں کو محمد نعمان خان نے چار جلدوں میں یکجا کردیا ہے جسے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے۔ جلد اول اور جلد دوم میں ابراہیم یوسف کے ڈراموں کو شامل کیا گیا ہے۔

ابراہیم یوسف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا لیکن بھوپال کے مشہور شاعر اور شارح غالب سہا مجددی کے مشوروں پر انھوں نے 1943 سے ڈراما لکھنا شروع کیا اور پہلا ڈراما 'بہشت ارضی' کے نام سے لکھا۔ فنِ ڈراما سے ان کی دلچسپی جنوں کی حد تک بڑھی اور انھوں نے 250 سے زائد ڈرامے تصنیف کیے۔ ان کے ڈرامے ہندو پاک کے متعدد ادبی رسائل میں شائع بھی ہوتے رہے اور وقتاً فوقتاً اسٹیج پر کھیلے گئے۔ ان کے ڈراموں کے سات مجموعے شائع ہوئے جن کے نام یوں ہیں: (1) سوکھے درخت۔ 1952، (2) طنزیہ ڈرامے۔ 1974، (3) دھوئیں کے آنچل۔ 1976، (4) پانچ چھ ڈرامے۔ 1978، (5) اداس موڑ۔ 1983، (6) الجھاوے۔ 1990، (7) پرچھائیوں کا پیچھا۔ 1990

جلد اول میں شروع کے پانچ مجموعوں کے مشمولہ ڈراموں کو شائع کیا گیا ہے جبکہ جلد دوم میں آخری دو مجموعوں کے ڈراموں کو شامل کیا گیا ہے علاوہ ازیں اس جلد میں رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے 123 ایسے ڈراموں کو بھی شامل کیا گیا ہے جو ان کے کسی مجموعے میں نہیں ہیں۔ محمد نعمان خان نے 38 صفحوں کا طویل مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں انھوں نے ابراہیم یوسف کے ڈراموں کے حوالے سے نیز ان کے ڈرامے کی تنقید کے تناظر میں سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ فی الحال ان دو جلدوں پر ہی تبصرہ مقصود ہے۔ بقیہ دو جلدوں پر گفتگو آئندہ کے لیے اٹھا رکھتی ہوں۔

اردو ڈرامے کی تاحال شہادتوں کے پیش نظر جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ اردو کا سب سے پہلا ڈراما کون سا ہے اس کے متعلق بھی بالتحقیق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس ضمن میں جن معدودے چند آرا کا اظہار ملتا ہے ان میں کافی حد تک اختلاف بلکہ تضاد پایا جاتا ہے چنانچہ ان خیال آرائیوں کو تشکیک و تذبذب کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا لیکن ڈرامے نے جو ارتقائی سفر طے کیا اور اردو کے لکھنے والوں میں اس سے دلچسپی پیدا ہوئی یہ امر باعث فخر و انبساط ہے اور اردو ادب کے سرمایے میں گرانقدر اضافہ لیکن پھر بھی اردو ڈرامے کو وہ عروج حاصل نہ ہو سکا جو اسٹیج اور ادب کے تعلق کے بعد دنیا کے دوسرے ملکوں کے ڈراموں کو حاصل ہوا۔ معیاری اور اہم اردو ڈرامے لکھنے والوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے لیکن جب بھی اردو ڈرامے کی تاریخ لکھی جائے گی ابراہیم یوسف کا نام اس میں نمایاں نظر آئے گا۔ ابراہیم یوسف نے اپنی زندگی ڈرامے کی تخلیق، تحقیق

اور تنقید میں گزار دی۔ ان کو فن ڈراما کے متعلقات پر اس قدر قدرت حاصل تھی کہ وہ دوسری زبانوں کے مقابلے میں اردو ڈرامے کو کھڑا کر کے دیکھتے، پرکھتے اور لکھتے تھے۔ ڈرامے کے نئے رجحان سے وابستگی نے ان کے اندر کے اس فنکار کو جلا بخشی جس کے دل میں انسانی دردمندی انسانیت کی سربلندی اور سماجی گھٹن کے لاکھوں درد تھے۔ ان دو جلدوں میں شامل ڈراموں کے مطالعے سے یہ آشکارا ہوتا ہے کہ ابراہیم یوسف نے زندگی، سماج اور حکومت سے متعلق زیادہ تر موضوعات کو اپنے ڈرامے کا حصہ بنایا ہے۔ قومی اور بین الاقوامی مسائل اور حالات، انسانی متعصب ذہنیت کے تناظر میں فسادات، جدید سماجی بے راہ رویوں کے وقوعات، غرض کہ انھوں نے ڈرامے کو ایسا آلہ کار بنایا جس سے صرف سماجی حقیقت نگاری کا ہی کام نہ لیا بلکہ قومی اور بین الاقوامی موشگافیوں کا بھی پردہ فاش کیا۔ ڈرامے کے ذریعے معاشرتی مسائل اور آفاقی حقائق کو جس خوش اسلوبی سے مکالماتی انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے افسانہ اور ناول اس کے بہت کم متحمل ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ڈرامے کو عوامی مقبولیت ملی۔ ابراہیم یوسف نے مختلف النوع موضوعات کو بڑے خلوص اور دل سوزی سے ڈرامے کے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کے ڈراموں میں تکنیکی محاسن کے علاوہ زندگی کا گہرا احساس و شعور ہے جو صنف ڈراما کو رفعت و عظمت کے اردو مدارج تک پہنچاتا ہے۔

ڈراما نگار کسی خاص نقطۂ نظر کی وضاحت اور مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لیے مواد کو ایک خاص انداز میں ترتیب دیتا ہے۔ مواد کی اس مخصوص اور متناسب صورت گری کو ہم پلاٹ کا نام دیتے ہیں۔ پلاٹ میں مواد کے مختلف عناصر، واقعات، ماحول، صورت حال اور کردار کی پیشکش کو ایک خاص انداز اور ایک خاص ربط و تسلسل کے ساتھ مرتب کیا جاتا ہے۔ مختلف چیزوں کی تنظیم میں تناسب پلاٹ کا لازمہ ہے۔ ترتیب وقوعات کو نقطۂ عروج کی طرف بڑھاتی ہے اور ڈرامائی کیفیت کو ابھارتی ہے، ابراہیم یوسف کے بیشتر ڈرامے اس مفروضے پر کامیاب اترتے ہیں۔ ڈرامے سے ان کی گہری وابستگی کے باعث ان کا فن درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔ ان کے طنزیہ ڈرامے بھی خوب ہیں۔

250 سے زائد ڈراموں کے خالق ابراہیم یوسف کے ڈراموں کو ہر لحاظ سے کامیاب، اثر انگیز اور معیاری کہا جاسکتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ان کے کلیات کو شائع کر کے ایک اہم ترین فریضہ انجام دیا ہے اور موجودہ عہد میں اردو ڈرامے کی گرتی ہوئی ساکھ کو بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ محمد نعمان خان ان معنوں میں ڈھیروں مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی بھرپور محنت، انتھک چھان بین اور شب و روز کی تلاش و جستجو سے ابراہیم یوسف کی تحریروں کو جمع کیا جو اردو ڈرامے کے قارئین پر ایک بڑا احسان ہے۔ اردو افسانہ اور ناول سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی یہ نعمت غیر مترقبہ ہے کیونکہ مجھے تو ابراہیم یوسف کے یہاں موضوعات کی بنت کاری اور ماحول، کردار اور وقوعات کی پیش کش میں افسانہ اور ناول کی بھی آمیزش دکھائی دیتی ہے جو ان کے بیشتر ڈراموں کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔

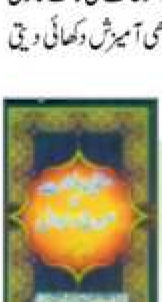

مغلیہ سلطنت کا عروج وزوال

مصنف: آر پی ترپاٹھی

صفحات: 584، قیمت: 242 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عاقل زیاد، ولیج بہدورا، پوسٹ ہردیا، ضلع سمستی پور، بہار- 848209

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کردہ کتاب 'مغلیہ سلطنت کا عروج و زوال' کی پہلی اشاعت 1980 میں ہوئی تھی اور اب چوتھا ایڈیشن سامنے ہے۔ گویا اب تک اس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب کافی مقبول ہے اور قارئین اس سے فیض حاصل کر پا رہے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف آر پی ترپاٹھی ہیں اور ان کا نام ماہر تاریخ نویسوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں اصل کتاب کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہے اور نا ہی مصنف کے بارے میں ہی کوئی تفصیل دی گئی ہے۔ تاہم اس کے مطالعے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ ریاض احمد شروانی نے اسے بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے۔ مصنف کا دیباچہ بھی قابل مطالعہ ہے، جس میں آر پی ترپاٹھی نے بڑے کھلے دماغ سے کتاب کی تکمیل کے محرکات کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں: "اس کتاب میں دیگر علما و فضلا کے نظریات پر پوری اہمیت و توجہ دی گئی ہے، تاہم یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ اس کتاب میں ان کے نظریات فوری و بآسانی دستیاب ہوسکتے ہیں۔ مختصراً یہ کتاب ان نتائج کا مجموعہ ہے جو مصنف نے ابتدائی وقدیمی منابع و مآخذ اور جدید مصنفین کے آثار کے مطالعے کے بعد اخذ کیے ہیں۔"

ان باتوں سے قطع نظر کتاب کے مطالعے کے دوران کچھ باتوں سے ذہن میں کچھ کنفیوژن بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر بابر کو ہی لیا جائے، صفحہ 46 پر درج ہے کہ دولت خان نے دلاور خان کو گرفتار کرلیا اور عالم خان کو اس جاگیر سے جو بابر نے عطا کی تھی مار بھگایا۔ صفحہ 47 پر درج ہے کہ بابر کو چھوڑ کر عالم خان دولت خان کے پھسلانے میں آ گیا۔ امرا نے مشورہ کر کے ایک نیا منصوبہ بنایا گیا اور طے پایا کہ عالم خان اور دلاور خان دہلی پر حملہ کر کے اسے فتح کرلیں۔ مگر اس سے پہلے صفحہ 46 کے آخری پیرا پر غور کریں جس میں لکھا ہے، "عالم خان لودی الگ منصوبے باندھ رہا تھا۔ اس نے بابر کو یہ تجویز پیش کی کہ وہ اگر دہلی کا تخت حاصل کرنے میں اس کی مدد کرے تو اس کو پنجاب کا صوبہ منتقل کردے گا۔ ممکن ہے اسی وقت رانا سانگا نے بھی اس بات پر اپنی آمادگی کا اظہار کردیا ہو کہ وہ ابراہیم لودی پر حملہ کرنے کے سلسلے میں بابر کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالے گا، بشرطیکہ رانا کو راجپوتانہ کے ان شمالی علاقوں پر جو میواڑ اور لودی سلطنت کے درمیان باعث نزاع تھے قبضہ کرنے دیا جائے۔" ترتیب واقعہ پر توجہ دی جائے تو الجھن ہوتی ہے کہ جس عالم خان کو جاگیر سے دستبردار کر کے مار بھگایا گیا وہی عالم خان پھر دولت خان کی باتوں میں کیوں کر آ گیا۔ گویا دولت خان نے بابر کی طرف توجہ دینے کی کوشش نہیں کی، تاہم دہلی کا تخت حاصل کرنے کے لیے بابر کو عالم خان لودی نے تجویز پیش کی تھی اور رانا سانگا نے (ممکن ہے) اس پر اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہو۔ مصنف کے اس فلسفیانہ اظہار کے برخلاف میرے علم میں یہ ہے کہ ابراہیم لودی کی حکمرانی جو رانا سانگا کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح کھٹکتا تھا، اس نے بابر کو حملے پر آمادہ کرلیا تھا، جس میں اس کی معاونت کی یقین دہانی بھی شامل تھی۔ مگر پانی پت کی عین لڑائی کے وقت رانا نے بابر کا ساتھ نہیں دیا۔ کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ بابر کے حملے سے تھکی ہاری ابراہیم لودی کی فوج اس کا مقابلہ نہیں کرپائے گی اور وہ خود دہلی کے تخت پر قابض ہوجائے گا۔ مصنف نے آگے صفحہ 52 پر لکھا ہے جو لائق توجہ ہے:

"رانا سانگا پانی پت کی جنگ میں شریک نہ ہوسکا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو گجرات کے بادشاہ مظفر شاہ کا خطرہ لاحق تھا۔ مظفر شاہ 15 اپریل 1526 کو یعنی پانی پت کی جنگ سے صرف پندرہ روز پہلے فوت ہوگیا۔ اس مختصری مدت میں رانا سانگا ایک موثر فوج جمع کر کے پانی پت نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

مصنف کے جملے پر غور کریں تو سوال اٹھتا ہے کہ پانی پت کی لڑائی مظفر شاہ کی موت کے پندرہ دن بعد ہوئی تو پھر رانا کو خطرہ کس بات کا تھا۔ یہاں اس بات کی وضاحت نہیں ہے کہ مظفر شاہ حادثاتی طور پر فوت ہوگیا یا بہ سبب علالت اس کی موت ہوئی۔ اسی طرح کتاب کے باب 7 کے تحت 'دوسری افغان سلطنت کا انحطاط' میں مبارز خان کو ایک کمینہ، نکما اور اوباش آدمی کہا گیا ہے۔ اس سے آگے کی سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنید خان فوجدار کو جس ہیمو نے شکست دی تھی وہ عادل شاہ (مبارز خان) کا ایک ہندو افسر تھا۔ اسلام شاہ کے انتقال

کے بعد اس نے عادل شاہ کا ساتھ دیا۔ پھر ان جملوں پر غور کیا جائے کہ عادل شاہ سرکش ومفسد افغانوں سے عاجز آچکا تھا۔ چنانچہ اس نے اسلام شاہ کی تقلید کی۔ یعنی جو خود نکما، اوباش اور کمینہ آدمی تھا وہ مفسدوں کی سرکشی سے عاجز ہونے لگا۔؟ صفحہ 191 کا آخری پیرا دیکھیے ؛ ''......شاہ محمد فرملی کا بیٹا سکندر خاں جو کہ ایک تندمزاج جوان تھا، یہ سن کر بپھر گیا اور ایک دم برہم ہوکر بولا: 'اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ہم سے ہماری جاگیریں چھینی جارہی ہیں اور ان کو سربانی سگ فروشوں کو دیا جارہا ہے۔'' اول تو 'سربانی سگ فروش' کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا اور دوئم کہ برہمی کے انداز میں بولے گئے مکالمہ کی تصدیق کے لیے کسی حوالے کی ضرورت درکار تھی۔ اسی باب میں دوسرے پیرا کے آگے لکھا گیا ہے: ''عادل شاہ نے اس باغی سردار (تاج شاہ کرانی، کتاب میں اس کا ذکر ہے) کا تعاقب کیا۔ ہیمو نے چیراماؤ کے مقام پر اس کو جالیا اور شکست دی۔'' یہاں اس واقعہ میں ایک فرار ہوئے شخص کا تعاقب کرکے اس کا قتل کردینا تو سمجھ میں آتا ہے، مگر اسے شکست دینا چہ معنی دارد۔؟ صفحہ 228 پر دلپت شاہ مہوبہ کے چندیل راجہ شالی بھان کی لڑکی درگاوتی کی شادی اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو پڑھنے کے بعد ماتھے پر شکنیں پڑنے لگتی ہیں۔

تاریخ نویسی میں واقعات کی صحت پر توجہ نہیں دینے سے کنفیوژن تو ہوتی ہے اور یہ حساس ذہن کے لیے فطری عمل ہے۔ ان باتوں سے الگ اجمالی طور پر کتاب یقیناً اسکولوں اور کالجوں کے طلبا کے لیے مفید ہے۔ اس کی وجہ یہ کہ اس میں ترتیب واقعات کو بہت ہی سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ کوئی سنی سنائی کہانی کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ یہاں پیش لفظ میں ڈائرکٹر این سی پی یو ایل پروفیسر ارتضی کریم صاحب کی اس عبارت پر بھی نظر جاتی ہے جہاں انھوں نے تحریر کیا ہے: ''لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔'' اس سے بھلا کسے انکار ہوگا اور غالباً اسی فارمولے کے پیش نظر تاریخ نویسی کو دیکھنا لازم ہوجاتا ہے۔

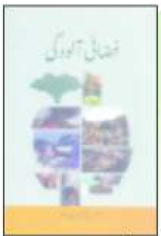

فضائی آلودگی

مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

صفحات: 179، قیمت: 108 روپے، سنہ اشاعت: 2015

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی

مبصر: مناظر ارشد، P-112، گلی نمبر 2، 20 فوٹا روڈ، بٹلہ ہاؤس، نئی دہلی

گلوبلائیزیشن (عالم کاری) کے اس دور میں گلوبل وارمنگ (عالمی حدت) ایک سنگین عالمی مسئلہ بن چکا ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے یہ لمحۂ فکریہ ہے کہ کس طرح سے اس روئے زمین پر زندگی گذارنے والے تمام جانداروں کو قابل بقا بنایا جاسکے۔ اس سلسلے میں 1985 میں (Montreal protocol) میں 1997 (Kyoto protocol)، 1992 (Earth summit) اور 2015 کے اواخر میں پیرس کلائمٹ کانفرنس (cop 21) وغیرہ تیزی سے بدلتے عالمی ماحولیاتی نظام اور اس کے نتیجے میں وقوع پذیر ہونے والے مضر اثرات کے ازالے کے لیے برسرپیکار ہے۔ ایسے ماحول میں ماحولیات کا مطالعہ ہمارے لیے کافی اہم ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک ہم مطالعہ نہیں کریں گے تب تک فطرت کی اس گود میں چھپے ہوئے رازہائے سربستہ کو سمجھنے سے یکسر قاصر رہیں گے۔ چنانچہ اس موضوع پر یوں تو انگریزی زبان وادب میں کتابوں کی فراوانی ہے لیکن اُردو زبان میں کمیاب ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ناصر صاحب نے اس موضوع کی طرف توجہ دلانے کی ایک عمدہ کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب، فضائی آلودگی، 179 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں کل 16 عنوانات قائم کیے گئے ہیں جو اس سے متعلق موضوعات سے بحث کرتے ہیں۔ عنوان کے آغاز میں تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ کریں۔

Noise pollution صوتی آلودگی۔ صوت کے معنی آواز ہے۔ یہ عام طور پر شور وغل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اس کا انگریزی لفظ Noise ہے لفظ Noise لاطینی لفظ Nause سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی Unwanted sound یعنی غیرضروری شور وغل ہے اس لیے شوروغل کو آلودگی کا ایک عامل تصور کیا گیا ہے۔ اگر وہ ایک حد سے زیادہ ہوتے ہیں تو ایسی آواز جس سے ماحول ناخوشگوار ہو، بے چینی ہو یا اس سے کام میں خلل ہو اسے شوروغل یا آواز کی آلودگی یا صوتی آلودگی کہتے ہیں۔

اس طرح لغوی اور اصطلاحی تعارف سے ہمیں اس موضوع کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہیں۔ اسی طرح اس میں شامل کیے گئے انگریزی الفاظ کے اردو متبادل بھی بے حد معلوماتی ہیں جیسے انگریزی کا لفظ (Biodiversity) کا اُردو متبادل حیاتی تنوع، (Global warming) کا عالمی حدت وغیرہ ایسے 179 الفاظ کتاب کے اندر بھی استعمال میں لائے گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی کتاب کے آخر میں اسے یکجا کرکے ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ فی زمانہ اس کتاب کی اہمیت اسی لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مقابلہ جاتی امتحانات سول سرویز (Civil services) وغیرہ میں ماحولیات کے موضوع سے تقریباً 25 سے 30 سوالات پچھلے کئی سالوں میں پوچھے گئے ہیں۔ اس سے اُردو میڈیم کے طلبا استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے موصوف نے ایسے اسلوب کو اختیار کیا ہے جو عام فہم اور آسان تو نہیں ہے لیکن انگریزی کے متبادل الفاظ کا ماہرانہ استعمال کرکے قاری تک اپنی بات کو پہنچانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ موصوف نے اپنی اس کتاب میں تعارف کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ یہ چیز کیا ہے؟ یہ کہاں سے آتی ہے؟ اس کا منبع کیا ہے؟ اور ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اور ہم اس سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ اپنی حفاظت کیسے کرسکتے ہیں؟ اس طرح کے تمام سوالات کا تشفی بخش جواب دینے میں وہ کامیاب ہوئے ہیں۔ جیسے گرین ہاؤس (Green House) سبز خانہ کے بارے میں پہلے گرین ہاؤس کا لغوی اور اصطلاحی تعارف پھر اس کی اہمیت کس طرح سے یہ مضر شعاعوں کو اپنے اندر جذب کرلیتی ہے۔ Ozone اوزون والے خطّے یا تہہ میں کس قدر آلودگی سے اس میں سوراخ ہوچکا ہے جس سے زمین پر پڑنے والی بنفشی شعاعیں انسانی صحت پر مضر اثرات مرتب کررہی ہیں۔ اس کتاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ ہر موضوع کو سمجھنے کے لیے گراف اور تصویریں بھی ساتھ میں دی گئی ہیں۔ ساتھ ساتھ آلودگی سے ہونے والی بیماریوں اور پریشانیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور جن جن چیزوں پر ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کا بھی خلاصہ کیا گیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ کتاب اردو زبان میں بہت جامع ہے جسے افادی مقصد کے تحت لکھا گیا ہے۔ اور یہ مقصد ہے انسانی زندگی کو قابل بقا بنانا اور عام فہم اردو زبان میں ماحولیات کے مسائل کو سمجھنا اور اس سے ہونے والی بیماریوں، پریشانیوں کا حل تلاش کرنا۔ بہرحال کونسل کے لائف سائنس پینل کے تحت اس طرح کی سائنس کی کتابیں اردو زبان میں چھپ رہی ہیں کونسل اس کے لیے مبارکباد کی مستحق ہے۔

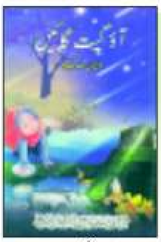

آؤ گیت گائیں

مصنف: شبنم کمالی

صفحات: 73، قیمت: 17 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے منصوبوں میں ادب اطفال پر بھی توجہ دی گئی ہے جس کا خاص مقصد یہ ہوتا ہے کہ بچوں کے اندر پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو۔ ان کا

ذہن بیدار ہو اور وہ بااخلاق اور ایک اچھے کردار والے بنیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب 'آؤ گیت گائیں' شبنم کمالی کی بچوں کے ادب پر منظومات کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں 73 نظمیں ہیں جو ہر اعتبار سے بہترین ہیں۔ شبنم کمالی نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ وہی نظمیں اس مجموعے میں شامل کی ہیں جس کو پڑھ کر بچوں کے اندر علم حاصل کرنے اور پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو۔ خاص طور پر حب الوطنی کے حوالے سے جو نظمیں ہیں بے حد خوب صورت اور بہترین ہیں۔ نظم 'اپنے وطن کی شان نرالی میں' Typing کی غلطی ہے لیکن نظم بہت اچھی ہے۔ اس نظم کے ذریعے بچوں کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ اپنے وطن سے محبت کرنی چاہیے۔ اسی طرح ایک نظم 'میرا وطن ہے' جس میں وطن پر فخر کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ دوسری طرف نظم 'علم کی دولت' میں علم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بتایا ہے کہ جس کے پاس علم کی دولت ہے اس کی عزت ہی عزت ہے۔ نظم 'روپ نگر کی سیر' میں بچوں کی خیالی دنیا سے نبٹنے کی تلقین کی گئی ہے اور سالہا سال ماں باپ کی بات کو ماننے پر زور دیا گیا ہے۔ اسی طرح ایک ماں کی نصیحت، شاعر کی نصیحت وغیرہ میں محنت کرنے اور پڑھنے لکھنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

گیت گاتے رہو

مصنف: شبنم کمالی

صفحات: 65، قیمت: 14 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب شبنم کمالی کی بچوں کے ادب پر نظموں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں 65 نظمیں ہیں جس میں مناجات وغیرہ شامل ہیں۔ اس مجموعے میں بھی انھوں نے بچوں کے ذہن کا خاص خیال رکھا ہے اور ان کو مدنظر رکھ کر نظمیں لکھی ہیں۔ زبان بالکل سادہ سلیس جو آسانی سے کسی کو بھی سمجھ میں آجائے۔ اس مجموعے میں ایسی ایسی نظمیں شامل ہیں جس کو پڑھ کر بچوں کے اندر حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا ملے ہے۔ ساتھ ساتھ کچھ نظمیں ایسی ہیں جسے پڑھ کر بچوں کے اندر پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ ایک نظم ہے 'مقصدِ زندگی' اس میں خدا کے سامنے سر جھکانے اور ان کے علاوہ کسی کے سامنے سر نہ جھکانے کی بات کہی گئی اور اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ خدا نے ہر کسی کو اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اسی طرح ایک نظم 'ذکر خوبی کا کرو' میں ہمیشہ اچھائی اور خوبی کا ذکر کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ اسی طرح ایک نظم 'وقت پر کام کرو' ہے جس میں ہر کام وقت پر کرنے اور وقت کا پابند ہونے کا پیام دیا گیا ہے۔ اس طرح نظم اچھی کتاب، اچھی صحبت وغیرہ ہیں جو بچوں کے اندر اچھی صحبت میں رہنے کی بات کہی گئی۔ مختصر یہ ہے کہ یہ تمام نظمیں بچوں کے ذہن کو بیدار کرنے اور ان میں پڑھنے لکھنے کے ساتھ ساتھ بااخلاق بنانے میں اہم ثابت ہوں گی۔

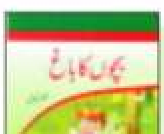

بچوں کا باغ

مصنف: ظفر کمالی

صفحات: 64، قیمت: 24 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: شاہد اقبال، R-128-A، پہلی منزل، جوگابائی ایکسٹینشن، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'بچوں کا باغ' ظفر کمالی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں 57 نظمیں شامل ہیں۔ انھوں نے بھی بچوں کو ذہن میں رکھ کر نظمیں لکھی ہیں۔ ان کی زبان صاف سلیس ہے جو بآسانی ہر کسی کو تمام نظمیں سمجھ میں آجائیں گی۔ تمام نظمیں اپنے موضوع کے اعتبار سے الگ ہیں اور ہر نظم بہترین ہے۔ ایک نظم 'قلم' ہے اس میں قلم کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کے فائدے بتائے گئے ہیں کہ اس سے بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں جو کام تلوار نہیں کر سکتی وہ کام قلم سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح ایک نظم 'یتیم لڑکا' ہے اس میں یتیم بچوں کے تئیں ہمدردی اور اس سے محبت کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ نظم 'شریر لڑکا' میں ایک شریر لڑکے کی تمام حرکات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح ایک نظم 'ہوں گے جب ہم جواں' میں اچھے انسان بننے اور وطن کے تئیں قربان ہونے کا درس دیا گیا ہے۔ ظفر کمالی نے زیادہ تر کوشش یہ کی ہے کہ ان تمام نظموں کے ذریعے ایک ایسا پیام ملے جو بچوں کے اندر علم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ بااخلاق انسان بنیں اور ایسے انسان بنیں کہ دوسرے لوگ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ایک نظم 'ننھا پودا' ہے اس طرح نظم 'کرکٹ' میں کرکٹ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو بیان کیا گیا ہے۔ نظم 'کتابیں' میں کتاب کو علم و حکمت کا خزانہ بتایا گیا ہے۔ مختصر یہ ہے کہ ظفر کمالی کا یہ مجموعہ بچوں کو بیدار کرنے اور ان میں پڑھنے لکھنے میں مثبت ثابت ہوگی۔

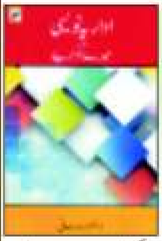

اداریہ نویسی اور میرے اداریے

مصنف: ڈاکٹر ابرار رحمانی

صفحات: 256، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2016

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: نسیم احمد، 19/402، ستیم وسندھرا، غازی آباد 201012

کسی بھی موضوع کو جاننے کے لیے کتاب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے تعلیم کے حصول کے لیے کتاب ایک لازمی جزو ہے لیکن اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت بھی حاصل ہو جائے تو اس موضوع پر عبور حاصل ہو سکتا ہے۔ 'اداریہ نویسی اور میرے اداریے' میں ڈاکٹر ابرار رحمانی نے ایسی تکنیک اختیار کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود صحافت سے جڑے ہیں اور اکیسویں صدی کے آغاز سے ہی آجکل کی ادارت سنبھالے ہوئے ہیں اور ادب کی دنیا میں آجکل کی اپنی حیثیت ہے۔ وہ برابر اپنی ساکھ بنائے ہوئے ہے۔

ڈاکٹر رحمانی نے اپنی کتاب کا آغاز اردو میں صحافت کے تاریخی سفر سے کیا ہے اور اردو اخباروں اور رسالوں کے ارتقا کا ذکر کر کے اپنے موضوع کے لیے خوبصورت تمہید باندھی ہے۔

آجکل ایک سرکاری رسالہ ضرور ہے لیکن اس کے مضامین میں وہ سرکاری پھیکا پن یا اکتاہٹ نہیں ہے۔ آجکل کے مضامین میں زیادہ تر مضامین ادبی نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن زمان و مکان کی عکاسی بھی ان میں نظر آتی ہے۔ ابرار صاحب نے اپنے اداریوں میں بھی ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ دیگر موضوعات کا بھی ذکر کیا ہے جو وقت کے لحاظ سے اہم ہیں۔ البتہ ادبی رسالہ ہونے کے ناطے غیر ادبی موضوعات ذرا کم ہیں۔

ڈاکٹر ابرار رحمانی نے اردو ادب میں مروج بے ادبیوں اور بدعتوں کا ذکر کرتے ہوئے ان سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے۔ انھوں نے اردو میں غیر معیاری تصانیف پر قدغن لگانے کی ضرورت پر زور دیا ہے تو معیاری تصانیف کی حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اردو کے نام پر منعقد کیے جانے والے سیمیناروں اور کانفرنسوں کی قلعی کھول کر اردو کی اس بے مصرف خدمت پر روک لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔ رحمانی صاحب کے مطابق جس طرح سے آج کل سیمینار اور کانفرنس منعقد کی جا رہی ہیں ان سے اردو کو کبھی فیض نہیں پہنچ سکتا۔ ابرار صاحب کا تعلق JNU سے رہا ہے جہاں سنیما اور کانفرنس

ہمیشہ پروان چڑھتی ہیں۔اس لحاظ سے ان کی بات میں دم نظر آتا ہے۔

ادبی موضوعات کے علاوہ آجکل کے اداریوں میں دیگر اہم موضوعات بھی شامل ہیں۔ان موضوعات میں ادبی انعامات واکرامات کا ذکر بھی ہے اوران لوگوں کی اردو کی صورت حال کا بھی۔نوبل انعام کا ذکر بھی ہے۔ابرار صاحب جہاں ان ادبی اعزازات و انعامات کے معترف ہیں وہیں وہ اس کے لیے اپنائے گئے طریقہ کار اور فیصلہ سازی سے مطمئن نہیں ہیں۔

آجکل کے مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر ابرار رحمانی نے جہاں متنوع موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے وہیں قاری کو وہ ٹپس بھی دیے ہیں جو ایک اداریہ کے لیے ضروری ہیں۔اداریہ کیسا ہونا چاہیے، اخبار کا اداریہ کیسا ہو، رسالے کا کیسا لیکن ان اداریوں میں ایک قدر مشترک ہے وہ ہے قاری کو اکسانا یعنی اداریہ ایسا ہو کہ قاری برجستہ اس پر اپنی رائے کے اظہار کے لیے مجبور ہو جائے۔یہی ابرار صاحب کا گرو منتر ہے۔

کتاب اچھے سائز میں خوب صورت سرورق کے ساتھ معقول قیمت پر صحافیوں کے لیے کارآمد ہے۔چاہے وہ پہلے سے اس فیلڈ میں ہوں یا نئے وارد ہوئے ہوں۔

آگرہ میں اردوصحافت

مصنف: ڈاکٹر اختیار جعفری

صفحات: 352، قیمت 250 روپے

ناشر: مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی تاج گنج آگرہ، سرکار بک ڈپو آگرہ

مبصر: محمد شارب ضیاء رحمانی، R-10-A، تیسری منزل نزد ہری مسجد، نفیس روڈ، جوگا بائی ایکسٹینشن، نئی دہلی 110025

اردو اخبارات کی تاریخ ارتقا پذیر رہی ہے۔مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی تاریخ جہاں شہر علم آگرہ میں پیوست ہے،، وہیں یہ علم وادب کی بھی زرخیز سرزمین ہے۔شاہ جہاں کی لازوال محبت کی علامت بھی اسی شہر میں ہے، میر کی روایت سے لے کر غالب کی وسعت فکر ونظر بھی یہاں جلوہ گر ہے۔اس شہر علم نے صحافت کی بھی بڑی خدمت کی ہے۔ ڈاکٹر اختیار جعفری کی تصنیف 'آگرہ میں اردوصحافت' اسی شہر علم وادب کی صحافتی، ادبی اور علمی خدمات کا احاطہ ہے۔جعفری صاحب نے آگرہ کی علمی تاریخ، عہدِ مغلیہ میں علمی کارناموں اور پھر انیسویں صدی میں علمی کاوشوں کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے آگرہ میں اردوصحافت کا ارتقائی جائزہ لیا ہے۔یہ شکوہ بھی درست ہے کہ اردوصحافت، اس کے فنی ارتقا اور تاریخ پر جتنے کام ہونے چاہیے تھے، نہیں ہو سکے۔اختیار جعفری نے کوشش کی ہے کہ ایک خطے سے متعلق ہی سہی، بھر پور کام ہو جائے۔

صاحب کتاب نے ہندوستان میں صحافت کی ابتدا، اس کے بعد آگرہ میں اردو صحافت کی صورت حال پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ غالب کا وطن اکبرآباد زبان وادب کے ساتھ ساتھ اردوصحافت کا بھی مرکز رہا ہے۔جس میں 182 سالہ دورِ صحافت کا تجزیہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔پہلے باب میں 'ہندوستان میں صحافت کا آغاز' کے عنوان سے مضمون شروع کرتے ہوئے انھوں نے صحافت کی تعریف وتدوین مختلف حوالوں سے پیش کی ہے۔ابتدائی دور میں صحافت کے مقاصد پر بھی مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الفاظ میں اس کے اقدار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ماقبل تاریخ صحافت، صحافت مغلیہ عہد میں، ہندوستان میں پرنٹنگ پریس اور صحافت، مطبوعہ صحافت، فارسی صحافت کا آغاز (اٹھارہویں صدی میں) شمالی ہندوستان میں فارسی صحافت، اردوصحافت کا آغاز، ہندی صحافت کا آغاز، ہندی صحافت کی تقسیمات، کے عناوین کے تحت تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔نیز تاریخی ارتقا کے لحاظ سے ہندی صحافت کے چار ادوار متعین کیے گئے ہیں۔

دوسرا باب اردوصحافت کے تاریخی پس منظر پر مشتمل ہے۔اس میں صاحب کتاب نے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے اردو اخبارات ورسائل کو پانچ زمروں میں تقسیم کیا ہے۔پہلا دور 1822 سے 1857 تک، دوسرا 1857 سے 1900 تک، تیسرا دور 1901 سے 1947 تک، چوتھا دور 1947 سے 1990 تک اور پانچواں 1990 سے عصر حاضر تک۔پھر ان ادوار کی تشریح کرتے ہوئے ان کے ارتقائی منازل پر روشنی ڈالی ہے۔ تیسرا باب 'آگرہ کا پس منظر' ہے۔جس میں شہر کی تاریخی، جغرافیائی اور ثقافتی حیثیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔چوتھا باب 'آگرہ میں انگریزی صحافت' پر مشتمل ہے۔پانچواں باب 'آگرہ میں فارسی صحافت' میں جام جہاں نما کو ہندوستان میں فارسی صحافت کا باقاعدہ جانشیں بتاتے ہوئے اس پر تبصرہ کیا گیا ہے۔اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ آگرہ میں صحافت کی تاریخ 1833 سے شروع ہوتی ہے۔چھٹا باب ''آگرہ میں اردوصحافت'' پر مشتمل ہے۔جس میں اورنٹیل کو آگرہ سے شائع ہونے والا پہلا اردو اخبار بتایا گیا ہے۔اس کا اجرا 1845 میں ہوا۔مالک لالہ میگھ راج اس کے ایڈیٹر تھے۔زبدۃ الاخبار کو آگرہ میں اردوصحافت کا نقطہ آغاز قرار دیتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اس فارسی اخبار کے بعد ایک اہم ترین اردو اخبار صدر الاخبار شروع ہوا۔

کتاب میں بعض اہم ایڈیٹران اور مدیران پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ساتویں باب میں 'آگرہ میں اردوصحافت آزادی کے بعد' کے عنوان کے تحت احساس، شبستاں، تاج دور، قومی وقار اور صحیح آواز وغیرہ کا تذکرہ ہے۔آٹھواں باب آگرہ کے متفرق اخبارات ورسائل کے تذکرے پر مشتمل ہے۔نویں باب میں آگرہ کے مطابع، دسویں باب میں صوبہ شمالی ومغربی کے دیسی مطابع کی سرگزشت ہے۔گیارہویں باب میں سرکاری رپورٹس کا خلاصہ اور اہم اخبارات کی تعداد اشاعت، قیمت وغیرہ کا گوشوارہ پیش کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ آگرہ کے شعری گلدستے بھی پیش کیے گئے ہیں اور پھر فارسی، ہندی اور انگریسی اخبارات کا گوشوارہ بھی موجود ہے۔مجموعی طور پر یہ کتاب ایک شہر کی صرف اردوصحافتی تاریخ کا ہی احاطہ نہیں کرتی، ہندی اور انگریزی صحافت کے ساتھ ساتھ آگرہ کی علمی، ادبی اور ثقافتی تاریخ کا مجموعہ بھی ہے۔ڈاکٹر اختیار جعفری کی اس دستاویزی خدمت سے دوسرے شہروں کی صحافتی تاریخ پر کام کرنے والوں کو نئی روشنی ملے گی۔

پریم چند کے نمائندہ دلت افسانے

انتخاب وترتیب: ڈاکٹر اعظم انصاری

صفحات: 216، قیمت: 150 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: ڈاکٹر منتظر قائمی اسسٹنٹ پروفیسر، ایف اے اے یو پی گورنمنٹ پی جی کالج، محمود آباد، اودھ

یوں تو عملی سطح پر چھوا چھوت، دلتوں سے نفرت اور ان کے ساتھ اونچی ذات کا ناروا سلوک ہمیشہ چرچا میں رہا مگر ادبی سطح پر ترقی پسند تحریک کے زیر اثر پہلی دفعہ پریم چند کی رہنمائی میں ان مسائل کو ادب کے احاطے میں لایا گیا۔ادب میں دلتوں یا خواتین سے متعلق مسائل کے ذیل میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ دلتوں یا خواتین کے مسائل کی عکاسی جتنی بھرپور انداز میں اس طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد کر سکتے ہیں دیگر ادیب نہیں کر سکتے۔اس بات میں جزوی صداقت ہے کیوں کہ اس قسم کے مسائل احساس اور تجربے سے زیادہ سروکار رکھتے ہیں لہٰذا دلت مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے دلت ہونا لازمی نہیں

ہے۔ اس قسم کے الزامات دلت ادب کے پیش رو پریم چند کے حصے میں بھی آئے۔ پریم چند کا نہ تو کبھی چھوا چھوت سے سابقہ پڑا اور نہ ہی برہمن وادی نظام کا ویسا سلوک ان کے ساتھ کیا گیا۔ اس کے باوجود پریم چند کی تخلیقات چھوا چھوت اور دلتوں کے درد و کرب اور غم و الم میں ڈوبی ہوئی ہیں۔

ترتیب نگار نے پریم چند کے جن افسانوں اور کہانیوں کو شامل کیا ہے ان میں دلتوں کے مسائل اور استحصال اور ان کے ساتھ ہونے والے ظلم و زیادتی کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں۔ چاہے 'نیچ ذات کی لڑکی' ہو یا 'ٹھاکر کا کنواں' یا 'کفن' یا پھر 'نجات' ان سبھی کہانیوں میں ان مسائل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اور حقیقی صورت حال ہمارے سامنے آجاتی ہے جو ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 'مندر'، 'کش مکش'، 'قوم کا خادم'، 'دودھ کی قیمت' اور 'جرمانہ' جیسی شاہکار تصنیف کو اس کتاب میں جگہ دی ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں پریم چند کے سولہ افسانوں کو شامل کیا ہے۔ مصنف کا یہ بھی ماننا ہے کہ پریم چند اردو ہندی کے پہلے ادیب ہیں جنھوں نے دلتوں کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی اور انھیں ہیرو کے طور پر پہلی بار پیش کیا۔ مصنف کا یہ بھی کہنا ہے کہ 'پریم چند مہاتما گاندھی کے نظریات کے حامی تو ہیں مگر امبیڈکر کے نظریات کے مخالف۔ یہی وجہ ہے کہ جب دلتوں کو مساوی حقوق دینے کی بات آتی ہے تو پریم چند اس کے مخالف ہو جاتے ہیں اور انھیں اقتصادی امداد دیے جانے کی بات کرتے ہیں۔ پونا پیکٹ میں پریم چند کا کھل کر سامنے آنا اس بات کا ثبوت ہے۔' تنقید کا مقصد ادب کے محاسن اور نقائص دونوں پر برابر نگاہ رکھنا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اعظم انصاری اس منصب پر بہت ہی غیر جانبدار ہو کر 'پریم چند کے افسانوں میں دلت مسائل' کے توسط سے اپنے مقدمے میں دلت ادب، مسائل، نظریہ و رجحان پر بڑی ہی تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں اور قاری کی دلت ادب کے تئیں فہم و فراست میں بالیدگی اور پختگی لانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہیں۔

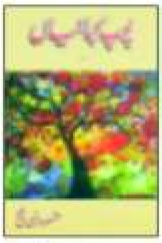

پوپ کہانیاں[3]

مصنف: مقصود الٰہی شیخ، تزئین و ترتیب: اویس سنبھلی
صفحات: 111، قیمت: 250/روپے
پرنٹر اینڈ پبلشر: نعمانی پرنٹنگ پریس، لکھنؤ
مبصر: گلشن، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'پوپ کہانیاں' مقصود الٰہی شیخ کے متفرق مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل 'دل ایک بند کلی' اور 'شیشہ ٹوٹ جائے گا' جیسے شاہکار ناولٹ لکھ چکے ہیں جو شائع ہو کر قارئین سے قبول عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ 'پوپ کہانیاں' مقصود الٰہی صاحب کے ذہن کی اپج ہیں۔ یہ بریڈ فورڈ میں مقیم رہے اور 'مخزن' کے ایڈیٹر بھی۔

مقصود الٰہی پاکستان کے رہنے والے اور وہاں کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہیں۔ یہ عرصۂ دراز سے 'دیار غیر' میں مقیم رہے اور اردو زبان و ادب کے بحرِ ناپیدا کنار کے ایک ماہر شناور اور اس کے فروغ کے لیے ہمہ وقت ہمہ تن کوشاں رہے۔ ان کا مزاج جدت پسند ہے۔ ان کی دلچسپی نئے نئے تجربات اور نئے پن میں ہے۔ جس کی زندہ مثال ان کے مضامین، افسانے اور دیگر تحریریں ہیں۔

پوپ کہانیاں: بقول سید سلمان احمد 'چند لفظوں اور سطروں میں سلیقہ سے ہدف پالینے کا نام پوپ کہانی ہے'۔ پوپ کہانیاں لکھنے کا اہم مقصد اس تیز رفتار دنیا سے انسان کا کچھ پل چرانا ہے۔ جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ داستانوں کی جگہ ناول نے، ناول کی افسانوں نے اور پھر افسانچے، منی افسانچے وغیرہ نے لے لی ہے۔ لیکن اب 'پوپ کہانی' کا دور آ گیا ہے۔ جس کے موجد ہونے کا سہرہ مقصود الٰہی شیخ صاحب کے سر بندھنے والا ہے۔ حالانکہ ان کہانیوں کا سلسلہ چل تو پڑا ہے لیکن بہت دھیمی رفتار سے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ موجودہ قاری ابھی تک افسانے اور مختصر افسانے کے گھیرے سے خود کو نہیں نکال پایا ہے۔

مقصود الٰہی صاحب کی شخصیت، افسانہ نگاری اور صحافت پر محترمہ روحی صاحبہ نے اپنے ایم۔فل کے تحقیقی مقالے میں ان کی تحریروں پر مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ جس سے یہ بات پتہ لگتی ہے کہ پوپ کہانیوں کے لیے ابھی کوئی باقاعدہ اصول وضوابط مرتب نہیں ہوئے ہیں۔ بقول مقصود الٰہی شیخ:۔

''یہ شاعری نہیں کہ عروض و بحور اور اوزان و قوافی و ردیف کا پیمانہ مقرر کرنے کا سوچا جاتا۔ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے اس لیے میں بے تکلف یا بلا تکلف پیمانے کا خیال رکھے بغیر آمد پر پوپ کہانی لکھ لیتا ہوں۔ کہ مجھے تو عوام سے گفتگو کرنی ہے۔''

کتاب ہٰذا میں کل 33 کہانیاں ہیں، جو اپنے موضوعات کے حوالے سے نہ آزاد نظم کے زمرے میں آتی ہیں اور نہ نثری نظم میں شامل ہیں۔ ان میں کہیں تسلسل ہے تو کہیں غیر مربوط الفاظ اور جملے ہیں۔ کہیں مکالمے کی شکل ہے تو کہیں سیدھا سادہ انداز ہے۔ مذکورہ کتاب میں مضامین کا آغاز 'آم کھٹے ہیں' سے ہوتا ہے۔ اس کہانی میں مصنف نے نئی پیڑھی کی دوستی سے عشق تک سفر طے کرنے کے مرحلے کو بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ ایک اور مضمون 'اور لائن کٹ گئی' ہے جس میں مصنف نے ایسے قاریوں پر طنز کیا ہے جن کے پاس کتاب پڑھنے کا تو وقت نہیں ہوتا بلکہ مفت کی کتابیں جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے۔ ایک اور دلچسپ کہانی 'خفیہ ہاتھ' ہے جس میں مصنف نے اپنے اطراف کے ماحول پر پُرزور طنز کیا ہے۔ جس میں انھوں نے ماحول کی گندگی، آلودگی، بجلی کی پریشانی، بے روزگاری، مہنگائی، بدعنوانی، بے حیائی، بے ایمانی، لڑکیوں کے ساتھ ہو رہے استحصال وغیرہ پر پورے سماج پر سوال کھڑا کر دیا ہے کہ ان سب کا ذمے دار کون ہے؟۔ اس کے علاوہ 'حقیقت در حقیقت' کہانی میں انھوں نے عورت کی تعلیم و تربیت کو اہمیت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں 'عورت محض ہوم میکر اور بچے بنانے کی مشین نہیں عورت۔ عورت ہے، اسے سارے اختیارات حاصل ہیں۔ شادی کرے نہ کرے، بیوی بنے نہ بنے، ماں بنے نہ بنے، جس حال میں، جس طرح چاہے سر اٹھا کر جیے۔ قربانی کا بکرا نہ بنے، وہ عورت ہے۔ ایک مرد یا مرد سے بھی زیادہ با اختیار و حقوق بردار۔' اس کہانی میں انھوں نے سماج کی ان عورتوں کا ذکر کیا ہے جو پڑھی لکھی ہونے کے باوجود استحصال کا شکار ہیں۔ اس مجموعے میں 'دخل اندازیاں یا جنریشن گیپ'، 'نا بابا نا'، 'محبت نہیں مرتی'، 'اشک آہو'، 'بیٹے کا مشورہ۔ باپ کو'، حاصل کلام، ناشکیبائی، نظارہ، وغیرہ جیسی کہانیاں شامل ہیں۔

مختصراً یہ کہ مقصود الٰہی شیخ صاحب نے سماج کے ہر طبقے کا بغور مطالعہ کیا ہے، اور اس پر بھرپور طنز کیا ہے جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ ان کی کہانیوں میں قارئین کو متاثر کرنے کی تمام خوبیاں موجود ہیں، جو ان کی کامیابی کا ذریعہ بھی ہیں۔ اُمید ہے یہ 'پوپ کہانیاں' اردو ادب کی توسیع و ترقی میں اضافہ کریں گی۔

دھنک

شاعر: ستار فیضی
صفحات: 120، قیمت: 150 روپے
ناشر: رائل سیما اردو رائٹرس فیڈریشن، کڈپہ، آندھرا پردیش
مبصر: ڈاکٹر غضنفر اقبال، سائبان
زبیر کالونی، ہاگر گا کراس، رنگ روڈ، گلبرگہ 585104

ستار فیضی، اردو کے ذی استعداد فن کار ہیں۔ ان کا تعلق رائل سیما آندھرا پردیش کے ادب خیز خطہ کڈپہ سے ہے۔ ستار فیضی نے اپنا شعری اظہار ادب اطفال سے کیا ہے۔ آج ادب اطفال حاشیے پر آچکا ہے۔ بچوں کا ادب لکھنے والے کی گنتی کے لیے بھی ہاتھ کی انگلیاں زیادہ ہوجائیں۔ فنکار کا فقدان ہے۔ کیا شمال اور کیا جنوب ہر طرف ادب اطفال کے تخلیق کاروں کا کال ہے۔ اِدھر جنوبی ہند میں ستار فیضی کا دم غنیمت ہے کہ وہ ادب اطفال کو اپنی سخنوری سے پروان چڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے تا دم تحریر بچوں کے لیے 6 کتابیں تحریر کی ہیں۔ اس کتاب میں شہر کڈپہ کے موقر فنکاروں کی آرا ستار فیضی کے لیے ایک مشعل کا کام کرتی ہے۔ 'دھنک' میں موضوعاتی نظمیں، وطنی نظمیں، حرکاتی نظمیں، مختصر نظمیں اور پہیلیاں کو قطعات کی ہیئت میں تحریر کیا گیا ہے۔ موضوعاتی نظموں میں میری مادری زبان، اردو کے سپاہی، اردو زبان ہماری، کتب خانہ، ماں، ارمغان، وغیرہ کے زیر عنوان نظمیں دھنک کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔

نظم میری مادری زبان سے یہ شعر دیکھیے:

عمر اس کی محیط صدیوں پر   آج تک بھی جوان ہے اردو

نظم 'ترنگا ہمارا' میں شاعری کا انداز:

وطن کی محبت سے گرمانے والا   ترقی کی جانب لیے جانے والا

ستار فیضی نے بچوں کی شاعری میں تجربہ کرتے ہوئے حرکاتی نظموں اور قطعات کی ہیئت میں پہیلیوں کو رواج دیا۔ یہ انداز انھوں نے اختراع کیا ہے:

غ:
غور کرو تم، غور کرو تم   غصے سے کچھ دور رہو تم
غیبت کی لعنت سے بچنا   غلطی سے بھی ایسے نہ کرنا

خ:
خدا سے ہم کو ڈرنا ہے   خلق کی خدمت کرنا ہے
خوشی سے ہم کو پڑھنا ہے   خوشی خوشی گھر جانا ہے

پہیلیاں دیکھیے کہ ستار فیضی نے کس دل نشین اسلوب میں لکھا ہے:

پہیلی:
گیتوں میں سب سے پیارا   سارے جہاں سے اچھا
ہے یہ کلام کس کا   شاعر کا نام ہے کیا
جواب: علامہ اقبال

پہیلی:
بتلاؤ اس دیش کا نام   دہلی جس کا صدر مقام
ہندو مسلم کی ہے جان   ہندی بھاشا جس کی شان
جواب: بھارت

دھنک ستار فیضی کا بچوں کے لیے نعمت غیر مترقبہ سوغات ہے۔ جس سے اردو پڑھنے والے طلبہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ ادب اطفال کی تخلیق انتہائی دشوار عمل ہے لیکن ستار فیضی کا کلام پڑھ کر طمانیت حاصل ہوتی ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے ڈوب کر لکھا ہے۔ شاعر نے کلام میں بامعنی، بامحاورہ زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے۔ ستار فیضی کا اردو برادری کو شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے ایک ایسی صنف کی طرف توجہ کی ہے جس کو صرفِ نظر کیا جاتا رہا ہے۔ وہ زمانے نہیں رہے جب نانی اور دادی اماں کی کہانیاں، نظمیں اور لوریاں بااثر ہوتی تھیں آج یہ باتیں اپنا اثر کھو چکی ہیں۔ شہزادوں، راجاؤں اور پریوں کا تصور ہی ختم ہوگیا۔ ایسے دور میں ستار فیضی نے ادب اطفال اور بچوں کی تخیلاتی نشو و نما کو فروغ دیا ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

ستار فیضی کا کلام 'دھنک' کی صورت میں پورے ادب اطفال پر پھیل چکا ہے۔ ان کا کلام اسکولی نصاب میں شامل کرنا میرے خیال میں ازحد ضروری ہے کیونکہ دھنک اطفال کی شاعری کا سرمایہ ہے جس کو ستار فیضی نے گراں مایہ بنایا ہے۔

تابش

مصنف/ ناشر: عمران عظیم
صفحات: 136، قیمت: 150 روپے
مبصر: اسد رضا، F-97، سیکٹر 7، جسولا، نئی دہلی 110025

زیر بحث کتاب معروف شاعر عمران عظیم کی غزلوں اور رباعیات کا حامل شعری مجموعہ ہے۔ ایڈوکیٹ عمران صاحب تقریباً ڈیڑھ درجن کتب کے مصنف ہیں جن میں آٹھ شعری مجموعے ہیں۔ شاعر نے کتاب کو اپنے بھائی محمد اسلم قریشی کے نام نامی سے منسوب کیا ہے۔ اس شعری مجموعے کے آغاز میں عمران صاحب نے عنوانِ کتاب کی مناسبت سے یہ شعر زینت کتاب بنایا ہے:

مجھ پہ ہوتی دیدہ و دل کی نوازش اور کیا   میرے اشکوں سے نکھرتی اس کی تابش اور کیا

'حرف آغاز' کے زیر عنوان مصنف نے اس کتاب اور اپنے ادب سے متعلق نظریات پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر فرقان احمد سردھنوی نے عمران عظیم کی غزلیہ شاعری پر اظہار خیال فرمایا ہے۔ جناب ابوصارم صارم نے عمران عظیم صاحب کی رباعیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

جہاں تک شاعر عمران عظیم کی غزلوں کا تعلق ہے تو ان کے ہر شعر میں احساس کی نرمی اور تخیلات کی گرمی ہے۔ وہ ایک جذباتی شاعر ہیں اور اپنے جذبات و مشاہدات کی عکاسی فنکارانہ انداز سے اپنی غزلوں میں کرتے ہیں۔ ان کے غزلیہ اشعار میں غم دوراں بھی ہے اور غم جاناں بھی۔ مثال کے طور پر ان کی مختلف غزلوں کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیے:

آنکھوں کو نئی شے سے سروکار بہت ہے   نادیدہ مناظر سے مجھے پیار بہت ہے
پرندے تو اچانک ہی شجر کو چھوڑ جاتے ہیں   غموں سے سوکھتی ہیں ٹہنیاں آہستہ آہستہ

عمران عظیم کے اشعار میں حالات حاضرہ کی ذہنی، مادی اور روحانی کشمکش بھی مختلف رنگوں میں موجود ہے تاہم حالاتِ حاضرہ کی عکاسی کرتے ہوئے عظیم صاحب نے اپنے جذبات واحساسات کی آمیزش بھی کی ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

شکم کی آگ نے جھلسا دیا تھا جسم و جمال   ہر ایک شخص پہ تھی بے حسی، انا چپ تھی
فریب کھا کے بھی تائید کرتے رہتے ہیں   ہم اپنے دوست کو ہرگز حق نہیں کرتے
شہر دلّی میں ہوا ملتی نہیں   اور پانی بھی تو کھارا ہے بہت
جو صبح کرتے ہیں دفتر کی فائلوں میں گم   تو بس کی لمبی قطاروں میں شام کرتے ہیں

عمران صاحب نے اگرچہ لگ بھگ تمام اصناف سخن میں شعر گوئی کی ہے لیکن انھیں غزل سے خصوصی لگاؤ ہے۔ ان کے اشعار میں روایت کا احترام تو ہے تاہم وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں بلکہ جدت بھی ان کے اشعار کی پہچان ہے۔ اسی لیے وہ یہ شعر کہہ دیتے ہیں:

تمام عمر سفر میں گزر گئی اپنی   ہم اپنے شہر میں ہوکر بھی گھر نہیں لوٹے
کہیں پڑوس ملا نیک تو مکان خراب   کہیں پڑوس میں اچھا مکیں نہیں ملتا

زیرِ نظر شعری مجموعے میں مختلف موضوعات اور خیالات کی حامل عمران صاحب کی رباعیاں بھی ہیں۔ اگرچہ رباعی ایک مشکل صنفِ سخن ہے لیکن شاعر نے اس صنف میں بھی کامیابی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ بقول ابوصارم صارم ''عمران عظیم کی رباعیاں بھی دلآویز ہیں اور ان میں موضوعاتی تنوع، زبان و بیان کا حسن اور فنی پختگی نظر آتی ہے۔'' رشتوں کے درد کی جھلک عمران صاحب کی اس رباعی میں دیکھیے:

سینے میں اُتر آئی بغاوت کیسی　　رشتے میں لہو کے ہے شرارت کیسی
ماحول عجب گھر کا ہوا ہے اب تو　　میں کس سے کروں یار شکایت کیسی

شاعر نے خدا و رسولؐ اور قرآن کی اہمیت و عظمت بیان کرنے والی حمدیہ اور نعتیہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ عظمتِ قرآن سے متعلق عمران عظیم کی یہ رباعی ملاحظہ کریں:

قرآن تو قرآن ہے سمجھو اس کو　　اللہ کا فرمان ہے سمجھو اس کو
دیکھو ہے یہ آئینہ دین و ایماں　　اسلام کا فیضان ہے سمجھو اس کو

عمران عظیم نے عشقیہ مضامین کو بھی اپنی رباعیوں میں شگفتہ لہجے میں نظم کیا ہے۔ یہ باعی دیکھیے:

رخ پہ ترے زلفوں کا پریشاں ہونا　　اس طرزِ ادا پر مرا حیراں ہونا
خوشبو تھی کوئی رنگ کہ تتلی کوئی　　لازم تھا اس انداز پہ قرباں ہونا

اس شعری مجموعے کا سرورق دلکش و عنوان کے مطابق ہے۔ طباعت و کمپوزنگ کے لحاظ سے بھی یہ ایک صاف ستھری کتاب ہے۔ لہٰذا یہ توقع بے بنیاد نہیں ہے کہ شائقین شاعری اور سنجیدہ ادب کے اسکالر 'تابش' کی روشنی سے فیضیاب ہوں گے اور اردو دنیا میں اس کتاب کی خاصی پذیرائی ہوگی۔

اردو ناول میں طوائف

مصنف: ڈاکٹر شاہد اختر انصاری
صفحات: 176، قیمت: 104 روپے
ناشر: براؤن پبلی کیشن پرائیویٹ لمیٹڈ، دہلی
مبصر: زبیر خان سعیدی، F-39/13، تیسری منزل، شاہین باغ، نئی دہلی

زیرِ تبصرہ کتاب 'اردو ناول میں طوائف' ایک منفرد کوشش ہے۔ ویسے تو اپنے افسانوں، ناولوں اور داستانوں میں طوائف کا تذکرہ کرنے کی جسارت دیگر پیش رو، مایہ ناز، استاد ادبا بھی کر چکے ہیں لیکن تذکرۂ طوائف میں سعادت حسن منٹو کو امام سمجھا جاتا ہے۔ طوائفوں کے بارے میں منٹو نے جو کچھ لکھا ہے دراصل وہ اس نفسیات کا حصہ ہے جس نفسیات کی تشکیل میں سماج کا اہم رول ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار صاحب کے زیرِ تبصرہ تصنیف کے دونوں ناول بھی اسی نفسیات کو بخوبی بیان کرتے ہیں۔

زیرِ تبصرہ تالیف میں شاہد اختر انصاری نے بہت خوبصورتی کے ساتھ طوائف کو موضوع بناتے ہوئے سیر حاصل بحث کی ہے۔ چونکہ شاید مولف کی یہ پہلی کاوش ہے، جسے انھوں نے دورانِ تعلیم ایم فل ایک مقالہ کی شکل میں تحریر کیا ہے اس لیے کچھ نہ کچھ کمیاں ضرور ہیں۔ لیکن بالجملہ ایک دلچسپ اور عمدہ تالیف ہے۔

میرے خیال سے اس تصنیف کے دو الگ الگ حصے ہیں۔ پہلے میں جس کی ابتدا موصوف نے 'اظہارِ تشکر' سے کی ہے، اس کے بعد حقانی القاسمی کے قلم سے ایک تعارفی نوٹ بہ عنوان 'طوائف۔ تعبیرات و تناظرات' کو جگہ دی گئی ہے۔ یہ تعارفی نوٹ طوائف کی مکمل وضاحت کے ساتھ ساتھ ایک قابل قدر اضافہ بھی ہے۔ تعارفی نوٹ کے فوراً بعد امتیاز وحید کی تحریر بہ عنوان 'سرآغاز' ہے اور سرآغاز کے بعد مولف نے چار صفحاتی پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ کل ملا کر تقریباً تیس صفحات ایسے ہیں جو کتاب کے آغاز میں اس کو ایک الگ حصے کی شکل دے رہے ہیں۔

کتاب کا باقاعدہ آغاز اس کے بعد ہوتا ہے جسے میں نے دوسرا حصہ شمار کیا ہے، اس دوسرے حصے کو مولف نے چھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

سب سے پہلے طوائف، لفظ اور تعبیر کو جگہ دی ہے جس میں دراصل اس سماج سے بحث کی گئی ہے جس کی طرف میں نے ابتدا میں اشارہ کیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟ کیا اہمیت ہے؟ رشتے کتنے قسم کے ہوتے ہیں، عورت کے کتنے روپ ہوتے ہیں؟ عورت کب اور کیسے طوائف بنتی ہے، اور وہ کون سے حالات ہوتے ہیں جس کے سبب اس کو اپنا جسم بیچنا پڑتا ہے؟

اس کے بعد مؤلف نے لفظ 'طوائف' کی تاریخ، وجہ تسمیہ، مختلف زبانوں میں اس کے مترادفات اور مختلف تہذیبوں میں ان کے اثرات پر ایک جامع بحث کی ہے۔

تاریخی حوالوں میں جغرافیائی اعتبار سے یونان، ایران، بابل، روم چین اور ہندوستان کو موضوع بحث بناتے ہوئے مولف نے اس پیشے کے اسباب و محرکات کو بھی بیان کیا ہے جس میں قابل ذکر اقتصادی سماجی اور نفسیاتی اسباب ہیں۔

تالیف کا دوسرا موضوع ہے 'اردو کے نمائندہ ناولوں میں طوائف' جس کے تحت مولف نے ڈپٹی نذیر احمد کا افسانہ 'مبتلا'، قاضی سرفراز حسین دہلوی کا 'شاہد رعنا'، رسوا کا شاہکار ناول 'امراؤ جان ادا' اور منشی پریم چند کا 'بازارِ حسن' جیسے ناولوں کو موضوع بحث بنایا ہے۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ تیسرا اور چوتھا ہے جس میں 'لیلیٰ کے خطوط' ادبی اور فکری معنویت اور 'مجنوں کی ڈائری' ادبی اور معاشرتی پس منظر سے بحث کی گئی ہے۔ فی الواقع یہ حصہ ہی اس تالیف کا مغز ہے جس میں ان دونوں ناولوں کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کے نچوڑ کو پیش کیا گیا ہے جس کی سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ قاضی صاحب نے لیلیٰ کے عاشقوں کی صف بندی کرتے ہوئے ایک طویل فہرست بیان کی ہے۔

'مجنوں کی ڈائری' دراصل 'لیلیٰ کے خطوط' کا تتمہ ہے جیسا کہ خود مؤلف نے ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری کا اقتباس ابتدا میں نقل کرکے مہر ثبت کرنے کا کام کردیا ہے۔ 'لیلیٰ کے خطوط کا مقصد طبقہ نسواں کے ایک گروہ کی عکاسی کرتا ہے، تو اس کے روزنامچے کا مقصد نوجوان طالب علموں کے طرزِ زندگی۔ اندازِ فکر اور عمل میں اصلاح کرنا ہے۔''

مجنوں کی ڈائری دراصل ایک تعلیم یافتہ اور باغی ذہن میں اٹھنے والی مرتعش لہروں سے بنائی گئی ایک تصویر ہے جو جدید علوم سے بہرہ ور ہے، دولت مند ہے اور صاحب حیثیت ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مؤلف نے دونوں ناولوں کے مطالعے کے حق کو بخوبی نبھایا ہے جس کا ثبوت اس کتاب کا پانچواں حصہ 'مطالعے کا ماحصل' ہے۔ اس حصے میں موصوف نے اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کیا ہے اور کتاب کے آخری حصے میں قاضی عبدالغفار صاحب کا سوانحی خاکہ ایک الگ انداز میں پیش کیا ہے۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ شاہد اختر انصاری کی یہ ایک منفرد کوشش ہے۔ اس تبصرے سے اس انفرادیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

کتاب میں پروف کی یا ایڈیٹنگ کی دانستہ یا نا تجربہ کاری کی بنا پر کچھ غلطیاں بھی تھیں جن کو میں نے اس امید پر نظر انداز کر دیا ہے کہ مولف موصوف اپنے اگلے ایڈیشن میں ضرور اس جانب نظر ثانی کریں گے۔ قارئین کو یہ کوشش ضرور پسند آئے گی۔

ادب ساز (سہ ماہی) شجاع خاور، خصوصی مطالعہ

مدیر: نصرت ظہیر
صفحات: 354، قیمت: 300 روپے
مبصر: عذرا نقوی، فرحت کدہ، سرسید نگر، علی گڑھ

سہ ماہی 'ادب ساز'، اردو ادب کا ایک بہت معتبر عالمی جریدہ ہے، اس کے تازہ شمارے میں دیگر تنقیدی اور تخلیقی نگارشات کے علاوہ شجاع خاور پر ایک خصوصی مطالعہ

شامل ہے۔ بیس جنوری 2015 کو اس انوکھے، بے باک، اور بجنل شاعر کا ایک طویل بیماری کے بعد انتقال ہوگیا۔ مدیر بجا طور پر رقم طراز ہیں 'یہ خصوصی گوشہ شجاع کی شخصیت کے البیلے پن اور ان کے فن کی عظمت کے سامنے اگرچہ کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا پھر بھی ایک ایسے ادیب کی قدر و قیمت کا کچھ اندازہ ضرور کرا سکے گا جسے 64 سال کی جسمانی عمر میں تخلیقی عمل کے صرف پچیس سال میسر آئے اور قلیل مدت میں ہی وہ غالب اور داغ کے بعد دبستانِ دہلی کا اہم شاعر بن گیا'۔ شجاع خاور پر اس گوشے کو چار عنوانات کے تحت مرتب کیا گیا ہے جن سے ان کے فن اور شخصیت کا مکمل احاطہ ہوتا ہے: شخص، فن، تحریر، سخن۔

پہلا حصہ 'شخص' مختصر ہے اس میں فاروق ارگلی اور نصرت ظہیر کے مضامین میں ان کی شاعری پر تبصرے کے ساتھ ساتھ سوانحی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ یہ دونوں مضامین شجاع کی زندگی ہی میں لکھے گئے تھے۔

نصرت ظہیر نے اپنے مضمون 'اسی سے دیکھ لیجے کیا ارادہ تھا قلندر کا، میں اپنے مخصوص شگفتہ انداز میں ان سے اپنی ملاقاتوں، ان کی پولیس کی ملازمت کی روداد، اور بہت مختصر عرصے کے لیے سیاست میں شامل ہونے کا ذکر اور شاعری پر تبصرہ کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ مجموعی طور پر شجاع کی زندگی، شخصیت اور فن کا بھرپور تعارف ہوجاتا ہے۔ اسی شمارے میں نصرت ظہیر کا ایک کالم بھی ہے 'اور دلّی خاموش ہوگئی' جو انھوں نے شجاع کی موت کے دو روز بعد اخبار میں لکھا تھا۔

شجاع خاور کے 'فن' کے تحت سترہ مضامین ہیں جن میں گوپی چند نارنگ، کملیشور، ظ انصاری، پروفیسر محمد حسن، آلِ احمد سرور، شانی، کیدار ناتھ سنگھ، خلیق انجم، مظفر حنفی، شمیم حنفی، اسیم کاویانی، قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی، محمد اعظم، شمس الحق عثمانی، کوثر مظہری، مجیب السلام اور انور صدیقی نے شجاع خاور کی شاعری پر تبصرہ اور تنقید کی ہے۔ ہندی کے مشہور ادیب کملیشور کہتے ہیں 'شجاع خاور کی غزلیں میرے من میں اٹھتے سوالوں کو یا تو پیش کرتی ہیں یا ان کے جواب دیتی ہیں۔

'تحریر' کے تحت شجاع خاور کی نثری نگارشات میں ان کے مجموعۂ کلام 'مصرع ثانی' کا دیباچہ شامل ہے جس میں انھوں نے اپنی شاعری کے جواز، پس منظر اور محرکات پر گفتگو کی ہے۔

'سخن' کے تحت تیس صفحات پر مشتمل ان کا کلام پیش کیا گیا ہے جسے ان کے مجموعات کلام: واوین، مصرع ثانی رشک فارسی، اور اللہ ہُو سے منتخب کیا گیا ہے جو شجاع کے کلام کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔

شجاع خاور کی ایک طویل نظم 'دوسرا شجر' جو چھ سو چوالیس مصرعوں پر مشتمل ہے وہ بھی اس شمارے میں شامل ہے۔

ایک زمانے میں انھوں نے شمس الرحمان فاروقی کے جدیدیت کے آرگن 'شب خون' (الہ آباد) کی رد میں پیروڈی کے طرز میں ایک رسالہ 'طرّہ' نکالا تھا جس کے شاید دو ہی شمارے شائع ہوئے تھے، اس میں زیادہ تر خود شجاع کی ہی تحریریں ہوتی تھیں۔ طرّہ کا 'ذات نمبر (1981) بھی ادب ساز کے اس شمارے میں شامل ہے، لیکن اس کو گوشۂ شجاع خاور میں نہیں بلکہ 'باب اختلاف' میں جگہ دی گئی ہے۔

شجاع خاور کے گوشے کے علاوہ بھی اس شمارے کے دیگر مشمولات بھی بہت اہم ہیں۔ اس شمارے کے تنقیدی مضامین پر نظر ڈالیں تو ہمیں مندرجہ ذیل نام نظر آتے ہیں۔ ہمایوں اشرف (مابعد جدیدیت، تفہیم و تعبیر)، رشید اختر خاں (اردو نعت گوئی اور ہند اسلامی تہذیب)، اُم ہانی اشرف (اقبال کا تخلیقی سفر)، مسعود جعفری (غالب کی شاعری میں رنگ نشاط)، محمد شاہد پٹھان (امداد اثر کے تنقیدی افکار)، معین الدین شاہین (رام بابو سکسینہ کا اسلوب نگارش)، صغیر افراہیم (قرۃ العین حیدر کے افسانوں کی انفرادیت)، عبدالحیٔ انجم (شوق جالندھری ایک ذاتی تاثر)، سعید احمد (اردو ناول کا بدلتا منظر نامہ) اور مناظر عاشق ہرگانوی (نصرت ظہیر کے طنز میں بے خودی)

کتب نما' ادب ساز' کے اس شمارے کا بہت اہم اور دلچسپ حصہ ہے جس میں نصرت ظہیر نے کتابوں پر بے لاگ تعارفی تبصرے لکھے ہیں جو تبصروں سے کچھ آگے کی چیز ہیں جن کو ان کے سچ بولنے کی جرأت، زبردست سنس آف ہیومر، شگفتہ نثر اور ادب کی صحیح پرکھ نے بہت ریڈایبل بنا دیتا ہے۔

اس شمارے کا بابِ نظم مختصر ہے جبکہ باب غزل قدرے طویل ہے۔

باب افسانہ میں قاضی عبدالستار کا افسانہ 'رانی ماں' بہت خوب ہے، اگر اس کے ساتھ ان کا نام بھی شائع نہ ہوتا تب بھی یہ پکار پکار کر کہتا کہ میرے خالق قاضی عبدالستار ہیں۔ باب افسانہ میں ارون پرکاش کی ہندی کہانی (مترجم: سید تنویر حسین) 'بھیا ایکسپریس' پنجاب دہشت گردی اور وہاں جا کر کام کرنے والے بہاری مزدوروں پر مبنی ہے اور اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔

'ادب ساز' کے اس شمارے میں حیات اللہ انصاری پر اوصاف احمد کا خاکہ شمالی ہند میں ایک عہد ساز اخبار 'قومی آواز' اور اس کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری کی یاد تازہ کرتا ہے۔

ادب ساز کا یہ شمارہ انجمن ترقی اردو ہند اور ڈاکٹر اطہر فاروقی کی نذر کیا گیا ہے اس امید اور توقع کے ساتھ کہ ادب ساز نے انجمن کو نئے زمانے میں نئے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے جو نکات 2009 اور 2011 کے شماروں میں سامنے رکھے تھے، اب اس قدیم اردو ادارے کے سب سے کم عمر جنرل سکریٹری (اطہر فاروقی) کی قیادت میں، ان پر جلد سے جلد عمل کیا جائے گا۔

عالمی یوم اردو یادگار مجلہ

(مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ، حیات وخدمات)
مجلس ادارت: (سہیل انجم، جاوید اختر، ڈاکٹر سید احمد خان)
صفحات: 152، قیمت: درج نہیں
ملنے کا پتہ: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا/ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، دہلی 53
مبصر: عبدالقادر شمس، سینئر سب ایڈیٹر عالمی سہارا، نئی دہلی

زیر نظر یادگاری مجلّہ امت اسلامیہ کی مظلوم شخصیت مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ کی حیات وخدمات پر مبنی ہے، ان کی مظلومیت کی ایک طویل داستان ہے، ظلم غیروں نے بھی کیے اور اپنوں نے بھی، پہلے وہ انگریزوں کے مظالم کے شکار رہے، پھر تقسیم ہند کے دوران بلوائیوں کے ظلم کا شکار ہوکر وطن کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے لیکن سب سے بڑا ظلم ان پر یہ ہوا کہ ان کی اسلامی اور آفاقی شخصیت پر امت نے مسلکی چھری پھیر دی۔ وحدت امت کے علمبردار شیخ ثناء اللہ امرتسری کو مسلک اہل حدیث کا ایسا نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا کہ بعد کے دنوں میں دوسرے مکتب فکر کے لوگوں نے ان کے فکر و فن اور علمی و تحقیقی مباحث کو بھی مسلکی عینک سے ہی دیکھا اور کنارے کردیا۔ یہ بھی ان پر ظلم ہی ہے کہ ان کے انتقال کی نصف صدی کے دوران ان پر نہ کوئی قابل ذکر سیمینار ہوا اور نہ کسی اخبار و جریدے نے خصوصی نمبر ہی شائع کیا، میں مبارکباد دیتا ہوں اردو زبان کے چند دیوانوں کو جنھوں نے اس ہشت پہل شخصیت کی حیات وخدمات پر یہ مجلّہ شائع کیا ہے۔

اس مجلّے نے ہی مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی علمی و تحقیقی خدمات کی جھلک دیکھنے کا موقع عنایت کیا، میرے مطالعے کے مطابق مولانا امرتسریؒ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد دوسری ایسی شخصیت کا نام ہے جن کے علم و فکر کی وسعتوں میں بے پناہ گہرائی و گیرائی تھی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے صحافی بھی تھے اور بلند فکر دانشور بھی۔ انھوں نے کبھی آریہ سماجیوں سے تکرار کی تو کبھی قادیانیوں سے لڑ پڑے، وہ دراصل ایسے حق پسند مجدد تھے جو فکری الحاد کو برداشت کرنے کے لیے کسی طور بھی تیار نہ تھے۔

زیر نظر مجلے کی ادارتی تحریر میں سہیل انجم نے لکھا ہے کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کے تعلق سے نہ کوئی کتاب تھی اور نہ مضامین ہی تھے جو ان کی علمی فتوحات اور عملی جہود ات کی جانب رہنمائی کرتے، اس کا صاف مطلب ہے کہ اس عظیم شخصیت کے ساتھ ظلم ہوا کیونکہ کوتاہ قد لوگوں پر اخبارات و جرائد نے ضخیم نمبرات تو نکالے لیکن میدان علم و عمل کے اس مجاہد کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کی اس پیش کش کی جس قدر بھی ستائش کی جائے کم ہے۔ اس مجلے میں مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور مولانا صفی الرحمن مبارکپوریؒ جیسے نابغہ روزگار کی معرکۃ الآرا تحریریں شامل ہیں جن کو پڑھ کر مولانا ثناء اللہ امرتسری کی علمی عمق اور فکری افق کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجلے میں کچھ مضامین موصوف کی تفسیری خدمات پر ہیں، جن کے مطالعے سے مولانا کی قرآنی بصیرت سے آگہی ہوتی ہے۔ مولانا اسلام پر ہونے والی یلغار کا ہمیشہ دنداں شکن جواب دیتے رہے، چنانچہ انھوں نے بہت سے مناظرے کیے، اس موضوع پر بھی محمد اسحاق بھٹی، مولانا عبدالمعید مدنی کے مضامین شامل ہیں۔ اسی طرح ان کی صحافتی خدمات پر سہیل انجم نے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا ثناء اللہ امرتسری مسلمانوں کی تنظیمی و جماعتی زندگی کے خواہاں تھے، چنانچہ تحریک ریشمی رومال، تحریک ندوۃ العلماء اور تحریک جمعیۃ علماء ہند میں وہ عملی طور پر شریک رہے اور انھیں کی جد و جہد سے آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی۔ بلاشبہ مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ بیک وقت محقق و مفسر بھی تھے اور مناظر اسلام بھی، اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک دور بیں صحافی بھی تھے اور تنظیمی و تحریکی فعالیت بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مولانا سیاست کے رموز سے واقف تھے اور ہندوستان کے حالات کی روشنی میں وہ زبردست سیاسی فہم رکھتے تھے، افسوس کہ اس مجلے میں ان کے سیاسی نظریے اور میلان پر زیادہ نہیں لکھا گیا ہے۔

مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ گرچہ اہل حدیث مکتب فکر سے زیادہ قریب تھے لیکن یہ ہرگز درست نہیں کہ وہ کلی طور پر اہل حدیث مکتب فکر کے ترجمان تھے، لیکن ان کے انتقال کے بعد ان کے چاہنے والوں نے انھیں اہل حدیث ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مسلک کے لوگوں نے بھی ان کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی اور وہ مسلکی گروہ بندیوں کا شکار ہو کر رہ گئے۔ جمعیۃ علماء ہند کے قیام کی بات آئی تو وہ اس میں بھی پیش پیش رہے اور آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے بھی وہ داعی رہے۔ یہ بھی سچائی ہے کہ وہ بعض معاملوں میں اہل حدیث علماء سے بھی اختلاف کرتے تھے۔

اس مجلے میں مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسریؒ کی ہمہ جہت شخصیت کا مکمل احاطہ تو نہیں کیا سکا ہے، اس کے باوجود میرا تاثر ہے کہ یہ مجلّہ ان کے فکر و فن اور علم و عمل کی غیر معمولی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

'فکر انقلاب'

اشاعت خصوصی بیاد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ

مدیر: اسعد مختار

صفحات: 448 قیمت: 400 سنہ اشاعت: 16 تا 31 دسمبر 2015

ناشر: آل انڈیا تنظیم علمائے حق

مبصر: محمد رضوان خان، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

'فکر انقلاب' جس کے مدیر اعلیٰ اسعد مختار اور مدیر احسن مہتاب خان ہیں یہ پندرہ روزہ شمارہ ہے۔ اس میں عالمی و ملکی حالات پر بے لاگ اور دوٹوک تبصرے و تجزیے شامل ہوتے ہیں۔ اس میں ہر طرح کے حالات اور مسائل پر پُر اعتماد گفتگو کی جاتی ہے، اور یہی اس کا اعجاز بھی ہے۔

'فکر انقلاب' آل انڈیا تنظیم علمائے حق' کا پندرہ روزہ ترجمان ہے جس کے اداریے فکر و تحقیق کے پیغام سے لبریز ہوتے ہیں۔ جس کی اب تک چار جلد اور اٹھاسی شمارے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اکابرین امت کی روشن حیات و خدمات پر درجنوں خصوصی شمارے شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اور اشاعت خصوصی بیاد فقیہ الامت حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ انھیں کی ایک اہم کوشش اور ایک دستاویزی خصوصی اشاعت ہے، جس کے دو باب ہیں باب، فقیہ الامت، جس میں کل بیالیس مضامین شامل ہیں، جس سے مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی زندگی کا احاطہ ہوتا ہے، دوسرا باب 'تنظیم' ہے۔ اس میں کل چھ مضامین ہیں ان مضامین میں آل انڈیا تنظیم علمائے حق کا تعارف اس کی ملی خدمات، خصوصی اشاعت اور مشاہیر کی تشریف آوری وغیرہ اہم مضامین ہیں۔

فقیہ الامت حضرت مولانا محمود حسن 'گنگوہیؒ' کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، وہ ایک تبحر عالم دین، فقہ کے ماہر اور زہد و ورع کا پیکر تھے۔ مگر ان کے اندر تقشف اور تصلب نہیں تھا۔ وہ خوش مزاج طبیعت کے مالک ان کی مرنجا مرنج شخصیت جس نے فقہ و حدیث میں غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں جسے تاریخ بھلا نہیں سکتی، یہی وجہ تھی کہ مولانا ہندوستان ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ساؤتھ افریقہ ان کا خاص طور پر میدان عمل تھا۔

فکر انقلاب کی خصوصی اشاعت کے ذریعے دیوبند کے اکابرین کی خدمات سے روشناس کرانے کے سلسلے کی یہ سنہری کڑی ہے جس میں مفتی محمود حسن کی مجموعی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے چوں کہ مفتی صاحب پر کوئی خاص وقیع شمارہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، لہٰذا فکر انقلاب کا یہ خاص شمارہ اس طور پر غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔

فکر انقلاب کی اس خصوصی اشاعت میں تقریباً تمام مضامین لائق مطالعہ، معلوماتی، فکر انگیز ہیں۔ جس میں مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کی زندگی کے گوناگوں گوشے سامنے آتے ہیں۔ ان مضامین میں حسب ترتیب، مولانا انظر شاہ کشمیریؒ کا 'الٰہی عاقبت محمود گرداں....' ایک عظیم فقیہ۔ ایک عظیم مرشد، مولانا ندیم الواجدی کا، فقیہ الامت مفتی محمود حسن کی فقہی بصیرت، مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کا 'حضرت فقیہ الامتؒ اور ان کی تصنیفی خدمات، عبداللہ عثمانی کا، فقیہ الامت مفتی محمود حسن گنگوہی کی تصنیفات، عمران عاکف خان کا، فقیہ الامت کے رحمت و نور سے لبریز مفید ملفوظات، احسن مہتاب خان وغیرہ کے مضامین بہت عمدہ ہیں۔

تنظیم علمائے حق کے تمام اراکین تحسین و تبریک کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس سائنسی اور مادیت پرستی کے دور میں روحانی و فکری شعور کو پیدا کرنے کے لیے اپنے بزرگان دین کے کارناموں سے نئی نسل کو روشناس کرانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی اپنے اسلاف کی یادوں کو تازہ کر کے ایک اہم فریضہ انجام دیا ہے لہٰذا توقع ہے کہ اس خصوصی اشاعت کی پذیرائی صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ برصغیر کے ہر طبقے میں کی جائے گی:

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر نہ دیدم و بہار آخر شد

■

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

خبرنامہ

کونسل اردو کے فروغ کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کرے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

رانچی میں چار روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ

رانچی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ملک کی 28 ریاستوں کے 221 ضلعوں میں 455 کمپیوٹر ایپلی کیشنز بزنس اکاؤنٹنگ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کے مراکز چلا رہی ہے۔ یہ مراکز خصوصاً اقلیتوں کو روزگار سے جوڑنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ جدید ٹکنالوجی کے اس دور میں ان مراکز کے اساتذہ کو قومی اردو کونسل وقتاً فوقتاً تربیت مہیا کراتی رہتی ہے تاکہ ان مراکز کے اساتذہ بھی نئی ٹکنالوجی کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ سکیں۔ یہ باتیں قومی کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے پانچویں تربیتی پروگرام کے افتتاحی اجلاس کے موقعے پر کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اگر پچیس طلبا بھی اردو سیکھنے کے لیے تیار ہو جائیں تو قومی کونسل فروغ اردو کے لیے ہر طرح کی سہولیات فراہم کرے گی۔ کونسل تو صرف سینٹر کھول سکتی ہے لیکن اس کو کامیابی کے ساتھ چلانے کی ذمے داری آپ لوگوں کے کاندھوں پر ہے۔ ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے خطاب میں مدعو اساتذہ سے کہا کہ بیشک آپ نے دوسری زبانوں میں علم حاصل کیا ہے لیکن آپ پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ اردو بھی سیکھ لیں یہ آپ کے لیے ایک سنہرا موقع ہے۔ اس وقت حکومت ہند نے اردو کے فروغ کے ساتھ ساتھ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کئی ضروری اقدامات کیے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ تربیتی پروگرام 14 تا 17 مارچ 2016 تک چانکیہ بی این آر ہوٹل میں منعقد کیا گیا ہے جس میں بہار، جھارکھنڈ اور اڈیشہ میں فی الوقت چل رہے 145 سینٹرز کے اساتذہ کو مدعو کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے پونے، سری نگر، گوہاٹی اور لکھنؤ میں ایسے تربیتی پروگرام منعقد کیے جاچکے ہیں۔ اس موقعے پر این آئی ای ایل آئی ٹی چنڈی گڑھ کے جوائنٹ ڈائریکٹر جناب راجیش کمار کپیلا نے تمام اساتذہ کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔ افتتاحی پروگرام کے بعد تربیتی پروگرام کا آغاز ہوا جس میں این آئی ای ایل ای ٹی کی طرف سے جناب سچن چاندھلا، جناب ریتو کمل اور رام شبد نے اپنی مہارت اور تجربے کو بروے کار لا کر اساتذہ کو تربیت فراہم کی۔

آخر میں قومی اردو کونسل کے ریسرچ آفیسر اور تربیتی پروگرام کے کنوینر جناب انتخاب احمد نے تمام اساتذہ کا شکریہ ادا کیا اور اس تربیتی پروگرام کو کامیاب بنانے میں قومی کونسل کے ارکان محمد قاسم، کپل اور جتیندر کمار نے بھرپور تعاون کیا۔

رانچی میں چار روزہ تربیتی پروگرام برائے اساتذہ

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 مارچ 2016

ادبی شخصیات کے انتقال پر قومی اردو کونسل میں تعزیتی نشستیں

انور سدید

نئی دھلی: اردو کے ممتاز ناقد اور صحافی انور سدید کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ممبئی سے ٹیلی فون پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی رحلت سے اردو دنیا ایک قاموسی شخصیت سے محروم ہوگئی۔ انور سدید نے اردو تحریکات، رجحانات اور اصناف کے حوالے سے جو دستاویزی نوعیت کا کام کیا ہے اس سے اردو کے علمی اور ادبی سرمائے میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے انور سدید کی متنوع شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو میں ایسی وسیع المطالعہ شخصیتیں بہت کم ہیں جن کا دنیا بھر کی کتابوں اور رسائل سے گہرا رشتہ رہا ہو۔ انور سدید کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پوری ادبی دنیا کے احوال سے مکمل طور پر باخبر رہتے تھے، لکھنا پڑھنا ہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ باوجودیکہ وہ پاکستان کے محکمہ آبپاشی سے بحیثیت ایکزیکیوٹیو انجینئر وابستہ رہے تھے مگر انھوں نے اردو ادبیات سے اپنا رشتہ آخری وقت تک قائم رکھا۔ 'اردو ادب کی مختصر تاریخ'، 'اردو ادب میں سفرنامہ'، 'اردو ادب کی تحریکیں' ان کی اہم حوالہ جاتی کتابیں ہیں۔ ان کتابوں کے حوالے سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ انور سدید مختلف رسائل و جرائد میں بھی کالم لکھا کرتے تھے جو عوام و خواص میں بے حد مقبول تھے۔

قومی اردو کونسل کے پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال نے انور سدید کی رحلت کو اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیتے ہوئے کہا کہ آسمان ادب کے ستارے ٹوٹتے جارہے ہیں۔ ابھی ہم انتظار حسین، ندا فاضلی، زبیر رضوی کے غم سے نکل بھی نہیں پائے تھے کہ انور سدید جیسے سرکردہ نقاد اور کالم نگار کے انتقال کی اندوہناک خبر ملی۔ انھوں نے کہا کہ انور سدید کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ان کے تنقیدی کارنامے کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 مارچ 2016

پروفیسر آفاق احمد

نئی دھلی: اردو کے معروف ادیب، ناقد اور محقق پروفیسر آفاق احمد کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر آفاق احمد وضع دار، مخلص اور ملنسار شخص تھے۔ بھوپال ہی نہیں بلکہ پوری اردو دنیا میں وہ اپنے علمی قد و قامت کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ تحقیق و تنقید، خاص طور پر اقبال شناسی کے باب میں ان کا کام قابل قدر ہے۔ ان کی کتابیں اقبال آئینہ خانے میں اور مجلس اقبال سیریز بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کی کتابوں میں پریم چند شناسی، مدھیہ پردیش میں اردو زبان و ادب، مجلس ممنون، نگارشات (حکیم قمرالحسن کی تحریروں کا مجموعہ)، اور ملا رموزی کی غیر مطبوعہ تحریروں کا انتخاب اہم ہیں۔

پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ ان کی شخصیت بڑی متنوع تھی۔ انھوں نے افسانے بھی لکھے، غزلیں اور نظمیں بھی کہیں۔ ان کے افسانوں کے ترجمے انگریزی، ہندی، سندھی اور پنجابی میں بھی ہوئے ہیں۔ تدریس کے علاوہ ان کے اندر بے پناہ تنظیمی صلاحیت تھی۔ مدھیہ پردیش اردو اکادمی، آل انڈیا علامہ اقبال ادبی مرکز بھوپال اور گورنمنٹ سندھی ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض بخوبی انجام دیے۔ انھیں ملکی اور غیر ملکی اعزازات سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان کی شخصیت بڑی متحرک اور فعال تھی۔ وہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں دلچسپی سے حصہ لیتے تھے۔ ان کی ذات ایک انجمن تھی۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ پروفیسر آفاق احمد کی رحلت سے اردو دنیا ایک مرنجاں مرنج اور باغ و بہار شخصیت سے محروم ہوگئی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 مارچ 2016

رئیس الدین رئیس

نئی دھلی: اردو کے معروف شاعر رئیس الدین رئیس کے انتقال پر قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ معاصر غزلیہ شاعری میں رئیس الدین رئیس کی اپنی ایک الگ شناخت تھی۔ وہ اپنے مختلف شعری اسلوب کی وجہ سے ادبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ آسماں حیران ہے، زمیں خاموش ہے اور سمندر سوچتا ہے جیسے شعری مجموعوں سے انھوں نے غزلیہ شاعری کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ رئیس الدین رئیس معاصر شعری افق کا ایک روشن ستارہ تھے۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ رئیس الدین رئیس متواضع اور خلیق شخص تھے۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ خاص طور پر شعری مجموعوں کے حوالے سے ان کی تحریریں اعتبار کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ رئیس الدین رئیس بہت دنوں سے علیل تھے۔ اس کے باوجود تخلیق سے رشتہ قائم تھا۔ حال ہی میں ان کا تازہ شعری مجموعہ بھی شائع ہوا تھا جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ رئیس الدین رئیس کا تعلق علی گڑھ کی اس ادبی نسل سے تھا جس نے معاصر غزلیہ شاعری کو احساس و اظہار کے اعتبار سے تازگی اور توانائی عطا کی تھی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اپریل 2016

کونسل کے تعاون سے

آزادی کے بعد روہیل کھنڈ میں اردو ناول نگاری

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون اور الخدمت سوسائٹی، بجنور کے زیر اہتمام ایک روزہ سیمینار بعنوان 'آزادی کے بعد روہیل کھنڈ میں اردو ناول نگاری' بتاریخ 13 مارچ 2016 بمقام اعجاز علی ہال، بجنور میں منعقد ہوا جس کا آغاز مہمانانِ خصوصی ڈاکٹر خالد علوی (ڈاکٹر ذاکر حسین کالج، دہلی) اور اقبال احمد صدیقی صاحبان نے مشترکہ طور پر محفل شمع روشن کرکے کیا۔ جبکہ سوسائٹی کی صدر سیمابی اور سکریٹری حنا صدیقی نے تمام

مہمانوں کا گل پوشی کرکے استقبال کیا۔ نظامت کر رہے انجمن ترقی اردو بجنور کے ضلع سکریٹری امیر نہٹوری نے سبھی مہمانوں کا تعارف کرایا۔ بعد ازاں سیمینار کے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر خالد علوی صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین کالج) نے اپنے خطاب میں کہا کہ اردو ناول نگاری میں ضلع بجنور کا اہم مقام ہے سرزمینِ بجنور سے نسبت رکھنے والے ڈپٹی نذیر احمد اردو کے وہ پہلے ناول نگار ہیں جنھوں نے اردو ادب کو ناول نگاری کے فن سے بخوبی روشناس کرایا، ڈاکٹر سوریہ منی رگھوونشی (چیف ایڈیٹر چنگاری شام نامہ، بجنور) نے کہا کہ یہ ادبی سیمینار ہماری معلومات میں اضافہ ہی نہیں کرتے بلکہ ہندوستان کی تہذیب وتمدن کو فروغ بھی دیتے ہیں۔ محفل کے صدر محترم شکیل بجنوری نے کہا کہ آزادی کے بعد ناول نگاری نے ہمارے معاشرے کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ سیمینار میں آر بی ڈی گرلز کالج بجنور سے، ڈاکٹر ودوشی بھاردواج اور ڈاکٹر ثمینہ بی، ڈاکٹر سبطین سیدہ بجنور، ڈاکٹر شیخ نگینوی اور ڈاکٹر نہال ناظم مراد آباد وغیرہ نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار میں ڈاکٹر خالد علوی، سوریہ منہ رگھوونشی، ڈاکٹر ودوشی بھاردواج، امیر نہٹوری، ڈاکٹر ثمینہ بی، ڈاکٹر شیخ نگینوی، ڈاکٹر سبطین سیدہ، ڈاکٹر نہال ناظم، وغیرہ کو نشانِ اعزاز سے نوازا گیا۔ صدارت شکیل بجنوری نے اور نظامت امیر نہٹوری نے کی۔ اخیر میں الخدمت سوسائٹی کی سکریٹری حنا صدیقی نے سبھی شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: حنا صدیقی (سکریٹری)، الخدمت سوسائٹی، آواس وکاس کالونی، بجنور، 27 مارچ 2016

موبائل وین

بلگاوی: وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے استحکام اور نشر واشاعت سے عوام الناس کو آگاہ کرنے کا اہم ترین کام کر رہی ہے۔ بلگام میں اس کا قیام پورے تین دنوں تک رہا اور شہر کے مختلف اہم اردو مراکز پر طلبا، اساتذہ، شعرا اور اردو کے بہی خواہوں نے اس کا بھرپور استفادہ اٹھایا۔ قومی کونسل برائے فرغ اردو کی جانب سے روانہ کردہ گشتی کتاب گاڑی نے تین دن کے قیام کے دوران بلگام میں کم وبیش 34 ہزار مالیت کی کتابیں

فروخت کرنے کے بعد اسلامیہ جونیر کالج سے کولہاپور کے لیے روانہ ہوگئی۔ آخری دن اسلامیہ جونیر کالج کے میدان میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی نظامت معروف شاعر محمد یاسین راہی نے کی جب کہ کالج کے پرنسپل ارشاد پالے گر نے صدارت فرمائی۔ جنیدیہ ایجوکیشن سوسائٹی کے اقبال ستار اکادمی کے صدر سید نیاز، اشفاق مڈکی، مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے قتال صاحب منیار، بشیر احمد ساؤنور، سید ساجد اور دیگر ارکان موجود تھے۔ پرنسپل پالیگار نے اس موقعے پر وزارت انسانی بہبود کے قومی کونسل برائے فرغ اردو کا شکریہ ادا کیا کہ اتنی اچھی اور معلومات والی کتابیں اردو والوں تک پہنچائیں۔ ساجد سید نے کتاب گاڑی کے صدیق اور دیگران کی گل پیشی اور شال پیش کرتے ہوئے بلگام شہر کی مقبول مٹھائی KUNDA تحفہ میں انھیں دی۔ بلگام اردو اکادمی نے ان پورے تین دنوں تک اردو کی نادر کتابوں، رسائل، میگزین اور دیگر زبانوں کے تراجم پر مشتمل کتابوں کو عوام تک پہنچانے میں پورا تعاون کیا۔ اس کے لیے وژن فاؤنڈیشن کے بانی ڈائرکٹر، شاعر اشفاق احمد مڈکی نے جس طرح کی تگ ودو اور محنت کی وہ بہت اہم اور قابل قدر رہی ہے۔ وین کے انچارج صدیقی اور ان کے معاونین کے مطابق پہلے دن 8000 دوسرے دن 5000 اور تیرے دن 12000 کی کتابیں فروخت ہوئیں۔ بچوں کی دنیا، جامع انسائیکلو پیڈیا، فکر وتحقیق اور اردو دنیا نامی رسائل اور کتابوں کی اچھی تعداد میں خریداری ہوئی۔

روزنامہ 'سالار ڈیلی' ہبلی، 16 مارچ 2016

قومی کونسل کی موبائل لائبریری

ھبلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی موبائل لائبریری کا شہر ہبلی میں شاندار استقبال کیا گیا۔ اردو کی نایاب وکامیاب کتابوں کا خزانہ لیے یہ وین مورخہ 9 مارچ 2016 کو شہر ہبلی پہنچی۔ صبح 10 بجے مدنی میاں کمپیوٹر ایجوکیشن اینڈ اسٹڈی سنٹر ہبلی میں افتتاحی محفل کا انعقاد ہوا اور ربن کاٹ کر نمائش وفروخت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس موقعے پر سنٹر انچارج الحاج محمد غوث پلاں، سنٹر سوپر وائزر خواجہ معین الدین گوونکوپ، مدنی فاؤنڈیشن کے صدر مولانا نثار احمد چھگن، مدنی میاں عربک کالج کے رکن سعید سنگوٹی، سنٹر کے اساتذہ، طلبہ وطالبات نے موبائل لائبریری کا پرتپاک استقبال کیا۔ سنٹر کے طلبہ وطالبات ودیگر محبان اردو نے اردو کی کئی کتابیں خریدیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' بنگلورو، 11 مارچ 2016

تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے اردو میں مواقع

نئی دهلی: تعمیر ملت فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند، کے جزوی

مالی تعاون سے ایک سیمینار بعنوان 'تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کے لیے اردو میں مواقع' جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ پروگرام کی

خبرنامہ

صدارت پروفیسر معین الدین جینابڑے نے کی جبکہ نظامت مرزا ذکی احمد بیگ نے کی۔ پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر سید فاروق چیئرمین تسمیہ انٹرنیشنل ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر تھے۔ عبیدالرحمٰن سابق ڈائرکٹر وزارت اطلاعات نشریات حکومت ہند جبکہ مہمان اعزازی ڈاکٹر فریاد آزر اور مہمان ذی وقار اسد مرزا صدر ملاپ انڈیا تھے، مہمان خصوصی ڈاکٹر سید فاروق کا استقبال ڈاکٹر ضمیر احمد انصاری نے گلدستہ پیش کر کے کیا، جبکہ بقیہ مہمانوں کا فیاض احمد، نورعالم، تابش اور رضا نے بالترتیب گلدستہ پیش کر کے استقبال کیا۔ خیر مقدمی اور تعارفی کلمات کے بعد مہمان خصوصی ڈاکٹر سید فاروق نے کہا کہ اردو میں روزگار کے بہت سے مواقع ہیں البتہ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو زبان و ادب میں خصوصی مہارت کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی کی کچھ معلومات کامیابی کے مزید باب وا کرتی ہے اور محبان اردو کو چاہیے کہ وہ مایوس نہ ہوں بلکہ مثبت سوچ اور انداز اختیار کریں۔ وہیں محفل کے مہمانوں اور مفتی افروز عالم قاسمی نے بھی موضوع کی مناسبت سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ فاؤنڈیشن کے صدر مرزا ذکی نے اپنی گفتگو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند اور کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر سید ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر سید فاروق کے خلوص و تعاون کی کافی تعریف کی اور کہا کہ کونسل جیسے ادارے اور پروفیسر ارتضیٰ کریم اور ڈاکٹر سید فاروق جیسی مخلص شخصیات کی وجہ سے اس طرح کے پروگرام کا انعقاد ممکن ہو پاتا ہے۔ پروگرام میں ڈاکٹر فریاد آزر، اسد مرزا، تحسین منور، ڈاکٹر نبیل عارفی، ڈاکٹر سجاد اختر، افتخار الزماں، ڈاکٹر اجمل، ڈاکٹر شبیر احمد صدیقی، شمیم اختر، خان رضوان، حبیب سیفی، مولانا اسیدالرحمٰن ندوی اور آفتاب احمد منیری نے مقالے پیش کیے۔ صدر جلسہ پروفیسر معین الدین جینابڑے نے اپنے صدارتی خطبے میں موضوع کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے سنجیدہ اور بامقصد موضوع پر صرف سیمینار کی نہیں بلکہ ورکشاپ کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 مارچ 2016

ہندوستانی زبانوں پر عربی کے اثرات

نئی دھلی: ہندوستان میں عربی زبان مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ تاجروں کی زبان کی حیثیت سے آئی ہے۔ دوسری صدی عہد بنوامیہ میں عرب ہندوستانیوں سے ملے اور تیسرے دور میں عربی زبان کو مزید پھلنے پھولنے کے مواقع ملے۔ ان خیالات کا اظہار معروف عربی اسکالر ڈاکٹر سید منور نینار نے کیا۔ وہ شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے مالی تعاون سے منعقدہ پروفیسر خورشید فاروق یادگاری خطبہ کے تحت 'ہندوستانی زبانوں پر عربی کے اثرات' کے موضوع پر 9واں خطبہ پیش کر رہے تھے۔ قبل ازیں خورشید فاروق یادگاری لکچر کا تعارف شعبۂ عربی کے سابق صدر پروفیسر محمد نعمان خان نے کرایا۔ پروگرام کی نظامت شعبۂ عربی کے استاد ڈاکٹر سید حسنین اختر نے کی جبکہ شعبہ عربی ڈی یو کے صدر پروفیسر ولی اختر نے ڈاکٹر سید منور نینار کا تعارف کرایا۔ کلمات تشکر شعبہ کے استاد ڈاکٹر نعیم الحسن اثری نے ادا کیے۔ پروفیسر محسن عثمانی سابق ڈین آف عرب اسٹڈیز افلو نے یادگاری خطبہ کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ عربی زبان ایک ہمہ گیر زبان ہے اس کے اثرات ہندوستان کی تمام زبانوں پر ہیں بطور خاص اردو زبان پر اس کے اثرات نمایاں ہیں خواہ وہ شاعری ہو یا نثر نگاری۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 مارچ 2016

دہلی میں اردو کی صورت حال

نئی دھلی: دہلی میں اردو کی صورتِ حال کتنی بہتر ہے اس کا اندازہ سڑکوں پر لگے سائن بورڈوں سے بخوبی

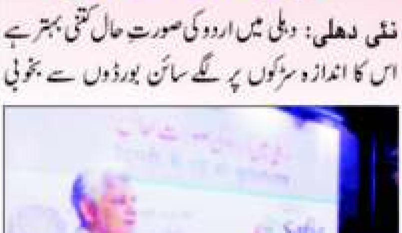

ہو جاتا ہے جن پر اردو میں لکھی عبارت رسم الخط کے عیب کی بنا پر منہ چڑھاتی ہے۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر ارتضیٰ کریم نے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر لودھی روڈ میں صوفیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقدہ پروگرام میں کیا۔ اردو اساتذہ کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ اسکولوں میں اس شرط پر ایک سال کے اردو ٹیچروں کی عارضی تقرری کردینی چاہیے کہ اگر اس مدت میں اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات کی مطلوبہ تعداد مکمل ہو جاتی ہے تو پھر ان ٹیچروں کو مستقل کر دیا جائے گا۔ اس منصوبہ بندی پر عمل کے نتیجے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دہلی میں اردو زبان اس مقام پر پہنچ جائے گی جہاں سے تنزلی کا تصور بھی خام ہے۔ اردو اکادمی کے

وائس چیئرمین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے کہا کہ اردو زبان مسلمانوں کی نہیں بلکہ ملک کی یکجہتی کی زبان ہے جس کا تعلق ایک خاص طبقے سے جوڑ کر اس کا استحصال کرنا افسوس ناک ہے۔ انھوں نے کہا کہ مدارس اسلامیہ کے بغیر ہماری تہذیب، ہماری ثقافت اور ہماری شناخت بے معنی ہے۔ جے این یو کے پروفیسر انور پاشا نے اردو کی صورت حال پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ زندہ قومیں اپنی صورت حال کا جائزہ لے کر بہتر مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا کرتی ہیں۔ دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئر قمر احمد نے کہا کہ صرف 6 فیصد لوگ ایسے ہیں جو اردو لکھتے اور پڑھتے ہیں اس کا ذمہ دار کون ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر آر ٹی آئی اردو زبان میں دی جائے تو اس کا جواب نہیں مل سکے گا کیوں کہ متعلق محکمے میں اردو جاننے والے موجود نہیں ہیں اس کے لیے ہم لوگ مل کر حکومت سے مطالبہ کریں کہ سرکاری محکموں میں اردو کی خالی پڑی اسامیوں کو پر کرے۔ معروف شاعر فرحت شہزاد نے کہا کہ ہمیں 1947 نے آزادی نہیں دی بلکہ انگریزوں کے بنائے پلان کے مطابق ہمیں تقسیم کر دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اردو کو تہذیبی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے ہم سے جوڑا جاتا ہے لہٰذا ہمیں بے جا صفائی سے پرہیز کرنا چاہیے۔ شکیل ملک نے بھی اظہار خیال کیا اور صوفیہ این جی او کے صدر سہیل سیفی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے آئندہ بھی اس طرح کے پروگرام منعقد کرنے کا عزم کیا۔ اس موقعے پر مہمانان خصوصی کو این جی او کی جانب سے طغرے دیے گئے اور مہمانان کے ہاتھوں سماجی و صحافتی میدان میں نمایاں خدمات انجام دینے والے اشخاص کو ایوارڈ سے نوازا گیا جن میں منظر علی خاں، حاجی عباس، محمد مبارک قاسمی، امیر امروہوی، محمد قاسم شمسی، روزنامہ صحافت سے ارمان حیدر، شعیب رضا، شوقین عالم، نوشاد عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مارچ 2016

عصمت چغتائی کے سو سال

نئی دھلی: 'عصمت چغتائی کے سو سال' کے عنوان سے شعبۂ اردو، دیال سنگھ ایوننگ کالج میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے دو روزہ قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے دن کے افتتاحی اجلاس میں سکریتا کمار پول نے کلیدی خطبہ دیا، صدارت پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کی۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر

غضنفر علی اور پروفیسر مولا بخش نے کی۔ اس اجلاس میں سات مقالے پڑھے گئے۔ پروفیسر غضنفر علی نے کہا کہ عصمت چغتائی کی تخلیقات سمجھنے کے لیے ہمیں ان کے دور کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ پروفیسر مولا بخش نے کہا کہ جس طرح غزل کے مختلف معانی ہوسکتے ہیں اسی طرح نثر کے بھی کئی معانی ہوتے ہیں۔ عصمت کا خاکہ 'دوزخی' کی زبان کچھ ایسی ہی ہے جس کے مختلف معانی لیے جاسکتے ہیں۔ مظفر اسلام، نیبولال، ڈاکٹر عارف اشتیاق، حسینہ خانم، ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، محمد شمس الدین، ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے مقالے پیش کیے۔ نظامت شاہد اقبال نے کی جبکہ کالج لائبریرین گیانیندر نے شکریہ ادا کیا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر انور پاشا نے کی۔ دوسرے اجلاس میں چھ مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ عصمت چغتائی کی شخصیت کا اندازہ ان کی صرف ایک دو تخلیقات سے نہیں لگایا جاسکتا بلکہ انھیں سمجھنے کے لیے ان کی دیگر تحریوں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ عصمت نے کبھی بھی مردوں کے سامنے خود کو کمزور نہیں سمجھا بلکہ اہم مرد فکشن نگار کے مقابلے اپنی پہچان بنائی۔ ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر نوید انجم، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر عبدالسلام صدیقی اور پروفیسر مولا بخش نے مقالے پیش کیے۔ نظامت ڈاکٹر عارف اشتیاق نے کی جبکہ شکریے کی رسم ڈاکٹر ونیت پرکاش نے ادا کی۔ اخیر میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر پی کے شرما اور سمینار کے کنوینر ڈاکٹر محمد ساجد حسین نے شرکا اور مندوبین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2016

ٹیپو سلطان کے دور میں اردو زبان کی صورت حال

نئی دھلی: ہیری ٹیج ریسٹور کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و اردو اکادمی دہلی کے تعاون سے غالب اکادمی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں ایک روزہ سیمینار و کل ہند مشاعرہ بعنوان 'ٹیپو سلطان کے دور میں اردو زبان کی صورت حال' پر منعقد ہوا۔ پروگرام کا پہلا سیشن دو پہر شروع ہوا جس میں بحیثیت صدور ڈاکٹر اشفاق احمد عارفی، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر مشتاق قادری اور عبدالجلیل نظامی اسٹیج پر جلوہ افروز رہے۔ سیمینار کی نظامت امتیاز احمد نے کی۔ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر عادل حیات، نوشاد منظر، راحت افزا، تحسین الزماں، امتیاز احمد (جامعہ ملیہ) نیبولال، غلام نبی اور محمد یوسف نے ٹیپو سلطان کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ پروگرام کے بعد کل ہند مشاعرہ ہوا جس کی صدارت بزرگ و استاد شاعر ابرار کرت پوری نے کی جبکہ نظامت معین شاداب نے کی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 مارچ 2016

کوثر چاند پوری کی اردو افسانہ کو دین

بجنور: بجنور کی معروف تعلیمی، ثقافتی، تمدنی تنظیم منڈلیہ

وکاس سنستھان، چاند پور (بجنور) کے زیر انتظام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے بعنوان حکیم سید علی کوثر چاند پوری 'کوثر چاند پوری کی اردو افسانہ کو دین' ایک روزہ قومی سیمینار 'زیدی ہال'، نزد رحمانیہ گرلس انٹر کالج، چاند پور (بجنور) میں منعقد ہوا۔ سیمینار میں ضلع کی ادبی، علمی، دینی و سماجی شخصیت کے علاوہ ڈگری کالج میں زیر تعلیم طلبا، یونیورسٹیز کے اسکالرس نے شرکت کی۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے ذریعہ چلائے جارہے اسکائی لائن انسٹی ٹیوٹ آف کمپیوٹر و کیلی گرافی و گرافک ڈیزائن سینٹر کے طلبا نے گل پوشی کر مہمان حضرات کا خیر مقدم کیا۔

سیمینار کی صدارت ڈاکٹر شمع پروین (پرنسپل، بابا ہردیو سنگھ گرلس پی جی کالج) نے و نظامت ضلع بجنور کی معروف سماجی، سیاسی، ادبی شخصیت سیمینار کے کنوینز الیاس انجم و مشہور شاعر امیر نہٹوری نے بخوبی نبھائی۔ سیمینار کے کنوینز الیاس انجم نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا اردو زبان کی آبیاری میں ضلع بجنور کا نمایاں حصہ رہا ہے جہاں اردو زبان و ادب کو سترہوی صدی کے صاحب دیوان شاعر حضرت قائمؔ چاند پوری، علامہ تاجور نجیب آبادی، اردو زبان کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نزیر احمد، ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری، سجاد حیدر یلدرم، نظر سجاد یلدرم، قرۃالعین حیدر، اختر الایمان، پروفیسر گیان چند جین، اظہار اثر، پروفیسر خورشید الاسلام، نشتر خانقاہی، عشرت کرت پوری، رفت سروش، پرفیسر ظفر احمد نظامی، عابدہ سمیع الدین، افسر جمشید، راہی حمیدی، کوثر چاند پوری جیسے باکمال ادیب و شاعر اردو زبان کو دیے۔ وہیں آج محترم اسد رضا، ڈاکٹر خالد علوی، شکیل جمالی، معین شاداب، ڈاکٹر پرویز اختر، فاخر ادیب، شکیل بجنوری وغیرہم اردو زبان و ادبی فضا کو جلا بخش رہے ہیں۔

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے معروف سماجی خدمت گار محمد فرمان نے کہا کوثر چاند پوری نے نثر کے میدان میں ادب کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔

مہمانِ ذی وقار انجینئر محمد سمیع علیگ (فاؤنڈر، ہیومن ویلفیئر مشن، تحریکِ فلاحِ انسانیت، انٹرنیشنل) نے کہا کہ کوثر چاند پوری (پ) 8 اگست 1900 (و: 14 جون 1990) کی شخصیت اور خدمات پر تفصیلی گفتگو کی۔ مہمانِ ذی قار افضل قریشی (سیکریٹری، اتر پردیش کانگریس کمیٹی لکھنؤ) نے کہا کہ کوثر چاند پوری نے گرچہ تعلیم طب کی حاصل کی۔ اس موقعے پر کئی مقالے پڑھے گئے۔

ڈاکٹر نازنین خان (بھوپال) کی کتاب 'وقارِ علم و حکمت کوثر چاند پوری' کا اجرا بھی ہوا۔ شاداب انجم، سابق چیئر پرسن، نگر پالیکا پریشد، چاند پور، بجنور نے سبھی مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

الیاس انجم (کنوینز) منڈلیہ وکاس سنستھان، چاند پور، ایڈیٹر شانِ بجنور،

28 مارچ 2016

مفتی صدرالدین آزردہ کی قومی اور ادبی خدمات

نئی دھلی: صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے 'مفتی صدرالدین آزردہ کی قومی اور ادبی خدمات' کے موضوع پر غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین میں ایک روزہ سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد علوی، ایسوی ایٹ پروفیسر، ذاکر حسین دہلی کالج نے کہا کہ دنیا میں ہر جگہ اپنے بزرگوں، شاعروں اور ادیبوں کو یاد کرنے کی روایت ہے لیکن ہمارے یہاں یہ روایت بہت کمزور ہے اور یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم سب کی گردن پر ان بزرگوں کا یہ قرض ہے۔ صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے صدر، محمد سلیم دہلوی نے ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد بیان کیے اور سمینار کے حوالے سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ ٹرسٹ نے دہلی کی ان نامور شخصیات پر مختلف موقعوں

'ہندوستان میں اردو زبان کو درپیش مسائل اور ان کا حل' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کا منظر

پر سیمینار یا مشاعرے منعقد کرانے کا عزم کر رکھا ہے۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ دہلی کی ادبی شخصیات پر صائم ایجوکیشنل ٹرسٹ کے سیمیناروں کا سلسلہ قابل مبارکباد ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے سابق رکن شیخ علیم الدین اسعدی نے اپنی تقریر میں کہا کہ صوفیا اور علما بے شک ہر میدان میں دہلی کی شناخت تھے۔ مفتی صدرالدین آزردہ بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے دینی اور دنیاوی تعلیم کے میدان میں انتہائی اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس سیمینار میں 12 مقالے پیش کیے گئے۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ مفتی صدرالدین آزردہ کے ادبی کارنامے موجود نہیں ہیں اس لیے ان کے ادبی مرتبے کا تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن ان کی قومی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ آزردہ ایک ایسی شخصیت تھی جنھیں انگریزوں کے دور میں بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا اور وہ 1857 کے غدر کے بعد بھی زندہ رہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 مارچ 2016

ہندوستان میں اردو زبان کو درپیش مسائل اور ان کا حل

نگینہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون اور وِمنی ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقد ایک روزہ قومی سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے فروغ اردو کی تحریک کا سلسلہ اپنے گھروں سے شروع کرنے پر زور دیا۔ ہندوستان میں اردو زبان کو درپیش مسائل اور ان کا حل کے عنوان سے منعقد سیمینار کا افتتاح مولوی محمد وارث کی تلاوت اور تہذیب ابرار کی نعت پاک سے ہوا۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن دہلی کے صدر ڈاکٹر سید احمد خان کی صدارت اور ڈاکٹر شیخ نگینوی کی نظامت میں ہوئے سیمینار کی شمع سہارنپور سے تشریف لائیں ڈاکٹر قدسیہ انجم نے روشن کی۔ اس موقعے پر اپنے کلیدی خطبہ میں راشٹریہ سہارا کے سابق مدیر اسد رضا نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے کی تحریک اردو کے چاہنے والوں کو اپنے گھروں سے شروع کرنی ہوگی۔

اس موقعے پر سیمینار میں کئی مقالات پیش کیے گئے۔ جوہر یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر و مہمان خصوصی ڈاکٹر لقمان خان نے کہا کہ اردو نے ہندوستان کو نعرہ انقلاب، ترانہ سارے جہاں سے اچھا اور اشعار سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیے ہیں جو حب الوطنی اور وطن پر قربان ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ ممبر اسمبلی منوج پارس نے کہا کہ اردو پیار، محبت، سلیقہ اور تہذیب کی زبان ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر عابد حسین حیدری کی کتاب رسائی تحائف اور میرے تجزیاتی اوراق کا اجرا بھی ہوا۔

پریس ریلیز: شیخ نگینوی، وِمنی ایجوکیشنل سوسائٹی، نگینہ، بجنور، 28 مارچ 2016

روہیل کھنڈ کے غیر مسلم ادیب وشاعر

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے کے سی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام یک روزہ سیمینار بعنوان 'روہیل کھنڈ کے غیر مسلم ادیب وشاعر' کا انعقاد ایم ایچ پی جی کالج میں کیا گیا جس کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی نے کی اور نظامت پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر منصور احمد صدیقی کے سپرد رہی۔ جبکہ بطور مہمانان ثروت عثمانی، کاویہ سوربھ رستوگی و ایم ایچ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ہرونش دکشت نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز فرحان راشد نے ڈاکٹر کرشن کمار نازکی نعت سے کیا۔ سیمینار میں اظہار خیال کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے۔ اس کو کسی مذہب یا برادری سے جوڑنا غلط ہے۔ اس کی آبیاری میں جتنا حصہ مسلمانوں کا ہے اتنا ہی ہندوؤں کا بھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو دلوں کو جوڑتی ہے۔ اگر آج ملک میں بھائی چارہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو عام کرنا ہے تو اردو زبان کو فروغ دینا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر نخل ہما، ڈاکٹر معروف، ڈاکٹر مشاہد فراز، قمر قدیر ارم، ڈاکٹر اسماعزیز وغیرہ نے موضوع سے متعلق اپنے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مارچ 2016

فرقہ وارانہ ہم آہنگی جمہوریت کی روح ہے: منیش شکلا

لکھنؤ: عوام کے مسائل اور سماجی برائیوں کو منظر عام پر لانے کے لیے میڈیا ایک بہتر ہتھیار ہے۔ ہمارے ملک کی قومی یکجہتی باقاعدگی کے ساتھ زندہ ہے۔ آج صحافیوں کے مسائل کے تئیں سماج کو فکرمند ہونے کی ضرورت ہے۔ ان کے مسائل کو بھی ہمیں سمجھنا ہوگا کہ وہ کن حالات میں کام کر رہے ہیں۔ ہندوستان کا مسلمان اور ہندو دوسرے ممالک سے بالکل الگ ہے۔ دونوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مثبت فکر سے منفی فکر کا خاتمہ ممکن ہے۔ ان خیالات کا اظہار اترپردیش ہندی سنستھان کے ڈائریکٹر منیش شکلا نے اپنے صدارتی خطاب میں کیا۔ رائے اومانا تھ بلی آڈیٹوریم میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون اور الفاروق فاؤنڈیشن کے تحت منعقد مذاکرہ سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ قومی یکجہتی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور بھائی چارہ جمہوریت کی روح ہیں اور اس روح کو باقی رکھنے میں آج کے ماحول میں سب سے اہم کردار میڈیا کا ہوگیا ہے۔ صحافی پی کے تیواری نے کہا کہ فرقہ پرستی کا زہر گھولنے والے مٹھی بھر ہیں۔ ہمیں کسی غلط فہمی کو اپنے اندر جگہ نہیں دینی چاہیے۔ کالی چرن انٹر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مہندر ناتھ رائے نے اس بات پر زور دیا کہ ملک کی تعمیر اسکولوں سے ہی ممکن ہے لہٰذا جب تک اساتذہ کی صورت حال بہتر نہیں ہوگی تب تک بہتر سماج کا تصور ناممکن ہے۔ سابق ایم ایل اے افضال احمد نے مختصر خطاب میں کہا کہ قومی یکجہتی کے پیغام کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ صحافی سنتوش بالمیکی نے میڈیا کے راستے کی دشواریوں کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ منفی فکر کے لوگوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

صحافی قطب اللہ نے اختتامی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ قومی یکجہتی کو بچانے کے لیے صحافت پہلے مشن ہوا کرتی تھی لیکن آج اس کی شکل بدل چکی ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کے سابق نائب صدر کملا کر ترپاٹھی، مولانا وحید اللہ سعیدی نے بھی خطاب کیا۔ اس سے قبل صحافی محمد غفران نسیم کی نظامت اور مولانا عبداللہ بخاری کی کنوینر شپ میں ہوئے مذاکرہ کا آغاز قاری محمد حسنین صدیقی نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ آخر میں تنظیم کے نائب صدر نثار احمد نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مارچ 2016

’اردو کی نئی شعری اصناف–سمت و رفتار‘ کے موضوع پر منعقد یک روزہ سیمینار کا منظر

’قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات‘ پر منعقدہ لکچر کا منظر

اردو کی ترقی میں مدارس اسلامیہ کا کردار

نجیب آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے مدرسہ جامعہ نورالاسلام للبنات سمیتی کے زیراہتمام ’اردو کی ترقی میں مدارس اسلامیہ کا کردار‘ کے موضوع پر منعقدہ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مقررین نے کہا کہ اردو کی ترقی میں مدارس اسلامیہ کا نمایاں کردار ہے۔ مدارس اسلامیہ کے بغیر اردو کی ترقی ممکن نہیں؟ اردو کے فروغ وترقی کے لیے مدارس کا قیام ضروری اور وقت کی ضرورت ہے۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے مہمان خصوصی ممبر اسمبلی سماج وادی پارٹی کے کل ہند سکریٹری عطاء الرحمٰن نے کہا کہ اردو کی ترقی تب ہی ممکن ہے کہ جب ہندوستان کے تمام مذاہب کے لوگ اردو کو اپنی زبان سمجھیں۔ سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شیخ نگینوی، جلیس نجیب آبادی نے کہا کہ اردو کی ترقی میں مدارس اسلامیہ کا بہت بڑا کردار رہا ہے۔ اگر مدارس اسلامیہ نہ ہوتے تو آج اردو کا وجود ہی ختم ہو جاتا۔ سیمینار کو مسلم فنڈ کے ڈائرکٹر آئی ایس ذکی، ہرپال سنگھ ایڈووکیٹ، کامیندر سنگھ، قدیر احمد، مولانا لیاقت نے بھی خطاب کیا۔ کامیندر کی صدارت اور مہتاب خاں چاند کی نظامت میں منعقدہ سیمینار کا آغاز ہوا۔ نغمہ اور شہریار نے نعت پیش کی۔ ادیبہ، جویا، ثمینہ، نشا اور خیرالنسا نے قومی ترانہ پیش کیا۔

روزنامہ ’راشٹریہ سہارا‘ دہلی، 14 مارچ 2916

اردو کی نئی شعری اصناف–سمت و رفتار

رامپور: کیئر ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام یک روزہ قومی اردو سیمینار بعنوان ’اردو کی نئی شعری اصناف–سمت و رفتار‘ سمبائسس پبلک اسکول نزد عیدگاہ منعقد ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقدہ اس سیمینار کی صدارت آل انڈیا ریڈیو رامپور کے اسٹیشن ڈائریکٹر ثروت عثمانی نے کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رباب انجم نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر رحمتی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو ذاکر حسین کالج دہلی یونیورسٹی نے کہا اردو تنقید میں ابھی تک صنف اور ہیئت میں تفریق قائم نہیں کی جاسکی ہے جس کی وجہ سے اکثر شاعری کی خارجی ہیئتوں کو صنف قرار دے دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر شعیب رضا خاں وارثی نے اپنے مقالہ میں کہا کہ غزل اپنی پیدائش جسے امیر خسرو سے منسلک کیا جاتا ہے وقت کے ساتھ ہی جوان ہوتی جارہی ہے۔ لیکن آج بھی اس کے اصول وقواعد میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ غزل کی مقبولیت کے سبب ہی نہ صرف لوگ اردو کے تئیں راغب ہو رہے ہیں بلکہ مشاعروں سے اگر غزل کو ختم کردیا جائے تو مشاعرہ گاہیں سنسان ہو جائیں گی۔ مقتدر محقق وادیب ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی امروہوی نے کہا کہ غزل میں قدیم روایات میں تجربات کی کافی گنجائش ہے لیکن ابھی تک کسی بھی صنف میں کیے گئے تجربات کو مقبولیت حاصل نہیں ہورہی ہے۔ اس موقعے پر کئی اہم مقالے پڑھے گئے۔ سابق اقلیتی افسر و ڈائرکٹر سمبائسس پبلک اسکول اسرار احمد نے کہا کہ اردو کی موجودہ شعری اصناف اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ اب اس میں کسی نئی جدت کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ صولت پبلک لائبریری کے صدر و معروف شاعر سین شین عالم نے اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ شعری اصناف کی ابھی سمت ہی مقرر نہیں ہے تو رفتار کی بات کرنا بے معنی ہے۔

روزنامہ ’سیاسی تدبر‘ دہلی، 14 مارچ 2016

قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات

الہ آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے تعاون سے حمیدہ گرلز ڈگری کالج، الہ آباد میں ’اکبر الہ آبادی میموریل لکچر‘ کے تحت بہ موضوع ’قرۃ العین حیدر کی ادبی خدمات‘ لکچر کا انعقاد کالج کے بیگم خورشید خواجہ ہال میں کیا گیا۔ اس لکچر کے خصوصی مقرر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، صدر شعبۂ اردو، چودھری چرن سنگھ میرٹھ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قرۃ العین حیدر دونوں جنگ عظیم کے درمیان پیدا ہونے والی ان عظیم شخصیات میں سے تھیں جنھوں نے ادب کے حوالے اپنی مستحکم شناخت قائم کی۔ ان کے والد اور والدہ بھی ہندوستان کے مشہور ومعروف افسانہ نگار اور ادبی شخصیت اور انگریزی تعلیم یافتہ تھے۔ قرۃ العین حیدر کو تمام علوم وفنون لطیفہ پر دسترس حاصل تھی ان کا مطالعہ وسیع وعمیق تھا۔ ہندوستان کی تاریخ، تہذیب و تمدن اور متعدد مذاہب پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ انھوں نے ناول نگاری کی روایت سے انحراف کیا۔ آگ کا دریا، آخر شب کے ہم سفر، کار جہاں دراز ہے اور چاندنی بیگم، جیسے شہرۂ آفاق ناول ان کی ناول نگاری کے روشن باب ہیں۔ پروفیسر تحسین عثمانی، پی وی سی انٹیگرل یونیورسٹی لکھنؤ بہ حیثیت صدر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ قرۃ العین حیدر خشونت سنگھ کے بعد Illustrated weekly کی ایڈیٹر بنیں۔ انھوں نے لکھنؤ سے لے کر کیمبرج یونیورسٹی تک تعلیم حاصل کی۔ وہ انگریزی زبان کی بھی ماہر تھیں اور اپنے شوق لگن اور خاندانی ماحول کی وجہ سے اپنے زمانے کی نامور ہستیوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 10 مارچ 2016

پروانچل میں اردو کی موجودہ صورت حال

مصطفی نگر، بلرام پور: اردو کا دائرہ روز بروز وسیع ہو رہا ہے۔ شہر سے لے کر دیہات تک میں اردو کے شائقین پیدا ہو رہے ہیں۔ آج اردو اپنے لیے خود قارئین پیدا کررہی ہیں۔ ان باتوں کا اظہار شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر ابن کنول نے کیا۔ وہ بلرام پور کے دیہی علاقہ مصطفی نگر، جنک پور بیریئر میں واقع مدرسۃ الہدیٰ سوسائٹی کے ذریعے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے منعقدہ سمینار میں صدارتی خطاب پیش کررہے تھے۔ پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ ملک کی دیگر ریاستوں میں اردو کی جو صورت حال ہے، تقریباً وہی صورت حال پروانچل کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو تہذیبی بنیاد پر بھی بہت دنوں تک زندہ رہ سکتی ہے، البتہ اس کے فروغ پر حکومتوں کو بھی سنجیدہ ہونا چاہیے۔ مدرسۃ الہدیٰ سوسائٹی کے زیراہتمام ہونے والے پروگرام کے

'انتظار حسین ایک عہد ساز شخصیت' پر توسیعی خطبے کا منظر

پہلے مرحلے میں تعلیمی بیداری کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے سینئر ایڈووکیٹ زیڈ کے فیضان نے مسلمانوں کی تعلیمی صورت حال کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ملک میں کہیں بھی مسلمانوں کی تعلیمی شرح اطمینان بخش نہیں ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ ہر خطے میں مسلمان تعلیم پر توجہ دینے لگے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی کردار والے اداروں کا تحفظ ہمارے لیے ضروری ہے۔ اس نشست میں مدرسۃ الہدیٰ کے سکریٹری انوار خان نے مدرسے کے تعلیمی سفر کی روداد پیش کی۔ سیمینار میں ملک کے مختلف تعلیمی اداروں سے تشریف لائے اسکالروں نے مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 7 مارچ 2016

انتظار حسین ایک عہد ساز شخصیت

کانپور: شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے منعقد چوتھے منشی دیا نرائن نگم توسیعی خطبے کے موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے بعنوان 'انتظار حسین ایک عہد ساز شخصیت' پر خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''انتظار حسین نے اردو کے ادبی معاشرہ میں تقریباً پینسٹھ برس خاصی چہل پہل کے ساتھ گزارے اور اردو کے ساتھ ساتھ برصغیر کی دوسری زبانوں بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے باہر بھی ان کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جانے لگا تھا۔ ان کی کتابوں کے ترجمہ ہندی اور انگریزی کے علاوہ دیسی اور بدیسی زبانوں میں ہونے لگے تھے۔ انتظار حسین نے جیتے جی ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پروفیسر شمیم حنفی نے مزید کہا کہ انتظار صاحب فطرت نگاری، روایتی حقیقت پسندی، علامتیت، تجریدیت، اشتراکی حقیقت نگاری، جادوئی حقیقت نگاری کی رنگا رنگی اور بدلتے ہوئے موسموں کو عبور کرتے ہوئے تخلیقی تفکر، اظہار اور اسلوب کے نئے منطقے تک پہنچے اور اس مرحلے میں وہ شاید تنہا تھے۔ جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے ہندی کے معروف ادیب اور مورخ پریمو دونے کہا انتظار حسین نے اپنی ساری قوت ہندوستانی تہذیب کو مختلف جہات سے سمجھنے اور اس کی اشاعت میں لگا دی۔ ہندوستانی تہذیب کی رنگا رنگی ان کی ہر تحریر میں بخوبی دیکھی جا سکتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنی کہانیوں میں ان نشد، پران اور جاتک کتھا تک چلے گئے۔ یہ بھی انھوں نے دکھا دیا کہ کسی المیہ کا ذکر کیے بغیر بھی اس موضوع پر ناول یا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر شکیل احمد نے خطبہ کی غرض و غایت بیان کی۔ جلسہ کی نظامت کنوینر اور صدر شعبہ اردو خان احمد فاروق نے کی۔ ڈاکٹر ارشد نے منشی دیا نرائن نگم کا تعارف پیش کیا۔

خان احمد فاروق، صدر شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور، 10 مارچ 2016

خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی میں توسیعی خطبہ

لکھنؤ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کے شعبہ عربی کے زیر اہتمام پروفیسر مسعود عالم فلاحی کی صدارت میں توسیعی لیکچر کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی نے طلبا کو 'عربی زبان اور علوم اسلامیہ کے فروغ میں محدث کبیر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات' کے عنوان سے خطاب کیا۔ ڈاکٹر مسعود احمد اعظمی مئو ناتھ بھنجن سے تشریف لائے تھے اور وہ 'المآثر' سہ ماہی کے ایڈیٹر بھی ہیں۔ ڈاکٹر مسعود احمد نے بتایا کہ محدث کبیر ابوالمآثر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی جملہ اسلامی علوم و فنون میں یکتائے زمانہ اور یگانۂ روزگار تھے۔ ادب و لغت، فقہ و تفسیر، حدیث و تاریخ اور تذکرہ و تراجم، منطق و فلسفہ اور علم کلام ہر ایک میں ان کا فضل و کمال اور عبقریت مسلم تھی۔ علم و فن کے مختلف شعبوں میں ان کی بصیرت و مہارت، تفوق و برتری اور عظمت و بلندی کا اعتراف نہ صرف ہندوستان بلکہ مصر و شام اور پورے بلادِ عرب کے ممتاز علما و فضلا نے کیا ہے۔ عربی اور اردو دونوں زبانوں میں پچاسوں تصانیف انھوں نے بطور یادگار چھوڑی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 مارچ 2016

عصمت چغتائی فکر و فن

حیدر آباد: صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی عثمان باغ بہادر پورہ حیدر آباد کے زیر اہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے اشتراک سے اردو ہال حمایت نگر میں عصمت چغتائی فکر و فن کے زیر عنوان سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار کا آغاز حافظ و قاری عبدالعلیم کی قرأت سے ہوا۔ سیمینار میں کلیدی خطبہ دیتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر بیگ احساس سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ وحیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی نے عصمت چغتائی کی زندگی پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے عصمت چغتائی کی تمام ناولوں، افسانوں اور مضامین کا فنی جائزہ لیا۔ مولانا انوار الدین صدیقی نائب صدر صمدانی ایجوکیشنل سوسائٹی نے صمدانی سوسائٹی کی 25 سالہ کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ محترمہ قمر جمالی نے کہا کہ نئی نسل کو اردو ادب سے واقف کرانے کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر زاہد الحق حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی نے سوسائٹی کی ستائش کی اور کہا کہ عصمت چغتائی نے خواتین کے مختلف مسائل پر روشنی ڈالی۔ جس ماحول میں آج عورت زندگی گزار رہی یہ عصمت چغتائی نے 70 سال قبل ہی اس پر افسانہ اور ناول لکھ کر آگاہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر حبیب نثار ایسوی ایٹ پروفیسر حیدر آباد سنٹرل یونیورسٹی ڈاکٹر ممتاز مہدی اور ڈاکٹر سید فضل اللہ مکرم نے بھی خطاب کیا۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت مولانا انوار الدین صدیقی نے کی۔ سیمینار کے پہلے سیشن میں پروفیسر بیگ احساس ڈاکٹر حبیب نثار محترمہ قمر جمالی نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مارچ 2016

اخبارات و رسائل برائے اطفال

بھالود: ''حالیہ سروے کے مطابق ہر خاص و عام کو تمام تر سہولیات کے ساتھ مادری زبان اردو میں تعلیم دینے والی ریاستِ مہاراشٹر پورے ملک میں دوم مقام پر ہے۔ یہ ہمارے لیے فخر کی بات ہے۔ اردو زبان اپنی شیرینی و لطافت کے ساتھ بامِ عروج پر اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب ہم خود اس کی بقا کی ذمے داری اپنے سر لیں۔ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دلوائیں۔ اردو اخبارات، رسائل اور کتب خرید کر پڑھیں۔'' ان خیالات کا اظہار بھالود تعلقہ یاول ضلع جلگاؤں میں ابنِ کلثوم فاؤنڈیشن ساکلی و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے اشتراک سے 12 فروری 2016 کو منعقدہ یک روزہ سیمینار بعنوان 'اخبارات و رسائل برائے اطفال' میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کے کارگزار صدر عبدالرؤف خان نے

عسکرو یا یام شالا کے وسیع وعریض ہال میں کثیر تعداد میں موجود سامعین سے خطاب کے دوران کیا۔ اس پروگرام کا افتتاح بزرگ ادیب و افسانہ نگار احمد کلیم فیض پوری کے ہاتھوں ہوا۔ سیمینار میں عارف یزدانی، ایم رفیق، حیدر بیابانی اچل پور، ڈاکٹر اشفاق احمد ناگپور اور وکیل نجیب ناگپور نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقعے پر سید یاسین تونڈاپوری کے بچوں کی نظموں کا مجموعہ 'ننھے منے پیارے نغمے' کا اجرا عبدالرؤف خان کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس سیمینار کی نظامت عارف یزدانی نے کی۔ ابن کلثوم فاؤنڈیشن ساکلی کے صدر ڈاکٹر صابر خان اور عسکرو یا یام شالا کے صدر جابر خان نے تمام مہمانان کا استقبال کیا۔

ڈاک سے: محمد جابر خاں، سکریٹری ابن کلثوم فاؤنڈیشن، جلگاؤں، 13 فروری 2016

اردو میں خواتین ناول نگار

بھالود: ادارہ ارم مہیلا بھوادیشہ سنستھا اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے اشتراک سے 13 فروری 2016 کو منعقدہ یک روزہ سیمینار بعنوان 'اردو میں خواتین ناول نگار' کا افتتاح اقلیتی کمیشن مہاراشٹر کے چیئرمین

الحاج محمد حسین خان امیر کے ہاتھوں کیا گیا۔ اس سیمینار کی صدارت ڈاکٹر الحاج عبدالکریم سالار صاحب نے کی۔ اس موقعے پر اپنے افتتاحی کلمات میں الحاج محمد حسین خان امیر نے کہا کہ اس سائنس و ٹیکنالوجی کے دور میں انسانیت کو بھول کر لوگ زندگی گزار رہے ہیں، ایسے حالات میں قلم کار حضرات کی ذمے داری بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانیت نوازی کے فروغ کو ہی اولیت دیں۔ جہاں دوسرے کئی میدانوں میں خواتین نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے وہیں خواتین نے ادب میں بھی اپنا منفرد مقام پیدا کیا ہے شاعری، افسانہ نگار اور ناول نگاری کو اپنے مشاہدہ، تجربہ اور تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعے ادب کو مالا مال کیا ہے۔ خواتین کے ان کارناموں کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ ان خیالات کا اظہار اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر الحاج عبدالکریم سالار صاحب نے کیا۔

دریں اثنا فعال سماجی و سیاسی شخصیت جابر خان نے

اغراض و مقاصد بیان کیے۔ محسن خان ایم رفیق یاول، ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر ایس ایم شکیل برہانپور اور وکیل نجیب ناگپور نے اپنے مختلف موضوعات پر لکھے گئے مقالوں کے ذریعے کثیر تعداد میں موجود خواتین و حضرات کو معلومات فراہم کیں۔ ارشد احمد مصطفےٰ آبادی نے نظامت کے فرائض انجام دیے اس موقعے پر عمائدین شہر کی بڑی تعداد موجود تھی۔

ڈاک سے: عارف یزدانی، صدر ارم مہیلا فاؤنڈیشن سنستھا، جلگاؤں، 15 فروری 2016

فکر اقبال میں امنِ عالم کی تلاش

بجنور: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے 23 فروری 2016 گنج روڈ واقع چاندنی میرج ہال میں 'فکر اقبال میں امن عالم کی تلاش' کے عنوان سے یک روزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ خلیل میموریل ویلفیئر سوسائٹی، بجنور (یوپی) کے زیر اہتمام منعقدہ سمینار کے افتتاحی اجلاس کے صدر پروفیسر عبدالحق سابق صدر، شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کیا، جس میں انھوں نے سیر حاصل بحث کی۔ افتتاحی کلمات گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، مالیر کوٹلہ کے پرنسپل اور پنجاب اردو اکادمی کے سابق سکریٹری پروفیسر محمد اقبال نے پیش کیے۔ علاوہ ازیں ممتاز اردو صحافی جناب اسد رضا (دہلی) اور معروف ادیب و شاعر جناب شکیل بجنوری نے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے علامہ اقبال کی شاعری میں فکر امن کے تعلق سے اپنے گراں قدر خیالات کا اظہار کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق، پروفیسر محمد اقبال اور ممتاز صحافی اسد رضا نے مشترکہ طور پر کی۔ ڈاکٹر شکیل اختر کی نظامت میں منعقدہ اجلاس میں ڈاکٹر شاداب تبسم، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی، ڈاکٹر سبطین سیدہ نقوی بجنور، ڈاکٹر ثمینہ بی، آر بی ڈی گرلز ڈگری کالج بجنور، الیاس انجم، چاند پور، امیر نہٹوری اور ڈاکٹر رباب انجم رامپور نے سمینار میں اپنے مقالے پڑھے۔ اس کے بعد پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر محمد اقبال نے پروگرام میں پیش کیے گئے مقالوں پر تبصرہ کیا۔ اخیر میں خلیل ویلفیئر سوسائٹی بجنور کی صدر ریحانہ فاطمہ اور سکریٹری ڈاکٹر فرزانہ خلیل نے تمام مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: حسن نقوی بجنور، یوپی، 9 مارچ 2016

'عبدالماجد دریابادی حیات اور خدمات' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ سمینار کا منظر

مولانا عبدالماجد دریابادی حیات اور خدمات

لکھنؤ: لکھنؤ میں تنظیم پریتی سیوا سمیتی لکھنؤ و قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے ایک روزہ قومی سمینار بعنوان 'مولانا عبدالماجد دریابادی حیات اور خدمات' 29 فروری 2016 کو رائے اومابلی آڈیٹوریم، لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ سمینار میں ادبی، علمی، دینی و سماجی، سیاسی شخصیات کے علاوہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم... کے ریسرچ اسکالرس نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض مولانا آزاد اردو نیشنل یونیورسٹی کیمپس لکھنؤ کی پروفیسر ڈاکٹر وسیم بیگم نے فرمائی۔ سمینار کی نظامت معروف صحافی، شاعر ندیم رائعی و ضلع بجنور کی معروف سماجی و سیاسی، ادبی شخصیت الیاس انجم نے مشترکہ طور پر نبھائی۔ سمینار کی کنویز پریتی گپتا نے اپنے استقبالیہ کلمات میں تمام مہمانوں کا تعارف کرایا و گل پوشی کر خیر مقدم کیا۔ سمینار میں مہمان خصوصی ڈاکٹر ارشاد خانم معروف سیاسی و سماجی شخصیت محترمہ پروین آزاد صاحبہ بدایوں نے شرکت فرمائی۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر انیس انصاری سابق وائس چانسلر خواجہ معین الدین چشتی اردو، عربی، فارسی یونیورسٹی) نے سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا اردو کے مشہور صاحب طرز ادیب اور مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم سے نکلی ہوئی 'آپ بیتی' اور خود نوشت سوانح عمری جس میں گذشتہ لکھنؤ اور اودھ کی ثقافت وتہذیب مشاہیر دین و ادب اور ممتاز معاصرین و احباب کے جیتے جاگتے تذکرے اور چلتی پھرتی تصویریں بھی موجود ہیں۔ 'آپ بیتی' میں مولانا کے جادو نگار قلم نے اپنی گذشتہ زندگی کے ساتھ عہد رفتہ کو اس طرح آواز دی ہے کہ وہ حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹر ریشماں پروین، ریسرچ اسکالر نعیم الرحمٰن صدیقی، معروف اردو اسکالر عبدالقدوس ہاشمی کے علاوہ ریسرچ اسکالر مسیح الدین مسیح، ڈاکٹر رضا الرحمٰن عاکف سنبھلی نے مختلف عنوانات پر پرمغز مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر وسیم بیگم نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ مولانا نے اردو صحافت کو 'احتجاجی صحافت' کے خول سے نکال کر اسے تعمیری صحافت کا دیدہ زیب پیراہن عطا کیا۔

پریس ریلیز: کنویز الیاس انجم، لکھنؤ، 1 مارچ 2016

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

ڈاکٹر جسیم محمد کی تصنیف 'فرش سے عرش تک' کا اجرا

علی گڑھ: وزیر اعظم مسٹر نریندر مودی کی حیات و خدمات پر مبنی ڈاکٹر جسیم محمد کی اردو میں تصنیف کردہ کتاب 'فرش سے عرش تک' کی پہلی جلد کا اجرا وزیر اعظم جناب حیات اور ان کے حالات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ کتاب 15 ابواب پر مشتمل ہے جس میں پیش لفظ، ابتدائی زندگی، سیاسی سفر، گجرات فسادات، اقلیتیں اور نریندر مودی، داخلی مخالفت، پابندیاں، مودی اور الزامات، مودی کی صورت حال، وزارتِ عظمیٰ کا عہدہ، مسلمان اور حب الوطنی، بابا صاحب امبیڈکر، وزیر اعظم نریندر مودی، صوبائی انتخابات، مستقبل اور تقریریں شامل

نریندر مودی نے نئی دہلی میں واقع اپنی رہائش گاہ پر کیا۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ مثبت تخلیقی عمل کی اپنی اہمیت ہوتی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انھوں نے ڈاکٹر جسیم محمد کی کاوش کو دل کھول کر سراہا۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر جسیم محمد نے بتایا کہ وہ وزیر اعظم مسٹر نریندر مودی کی زندگی اور ان کی خدمات سے حد درجہ متاثر ہو رہے ہیں کیوں کہ وہ بے پناہ محنت اور قربانیوں کے نتیجہ میں ہی ملک کے اعلیٰ ترین باوقار عہدے تک پہنچے ہیں۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ انھوں نے وزیر اعظم مسٹر نریندر مودی سے متاثر ہو کر ہی اردو زبان میں 'فرش سے عرش تک' کتاب تصنیف کی ہے جس کی پہلی جلد علیشا پبلی کیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ گذشتہ دنوں وزیر اعظم نریندر مودی نے نئی دہلی میں واقع اپنی رہائش گاہ پر 'عرش سے فرش تک' کی پہلی جلد کا اجرا کیا۔ ڈاکٹر جسیم نے بتایا کہ انھوں نے 'فرش سے عرش تک' کی پہلی جلد میں نریندر مودی کی مکمل کی گئی ہیں۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ پانچ جلدوں میں شائع ہونے والی مذکورہ کتاب کی یہ پہلی جلد ہے اور اس کی دوسری جلد تیاری کے مراحل میں ہے جو جلد ہی شائع کی جائے گی۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے بتایا کہ کتاب کا اصل مقصد اردو طبقہ کو وزیر اعظم نریندر مودی کے بارے میں صحیح معلومات مہیا کرا کر غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے تاکہ اردو طبقہ نریندر مودی کے خیالات اور ان کی قربانیوں سے بخوبی واقف ہو سکے۔ ڈاکٹر جسیم محمد نے توقع ظاہر کی کہ کتاب 'فرش سے عرش تک' نوجوان نسل کے لیے ترغیب کا باعث بنے گی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 مارچ 2016

کمیونٹی ریڈیو کانفرنس

نئی دہلی: اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر ارون جیٹلی نے ملک کے دیہی اور دور دراز علاقوں میں عام لوگوں کو بااختیار بنانے میں کمیونٹی ریڈیو کا اہم کردار بتاتے ہوئے کہا کہ یہ دم توڑتی بولیوں، زبانوں اور رسم و روایات کے وجود کو قائم رکھنے میں بے حد کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ مسٹر جیٹلی نے یہاں سہ روزہ چھٹے کمیونٹی ریڈیو کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں اپنے خطاب میں کہا کہ ملک بھر میں اس وقت 191 کمیونٹی ریڈیو اسٹیشن کام کر رہے ہیں اور دیگر 400 کو منظوری دی جا چکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ دو دہائی پہلے یہ غلط فہمی تھی کہ ریڈیو اور ٹی وی پر حکومت کا اختیار ہونا چاہیے لیکن اب دنیا بھر میں یہ تاثر بدل رہا ہے اور یہ تبدیلی آنی بھی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ 1980 کی دہائی میں ٹی وی کے آنے سے ریڈیو پیچھے رہ گیا تھا لیکن ایف ایم ریڈیو کے آنے سے اس کی چمک دمک واپس لوٹی ہے۔ کمیونٹی ریڈیو 2002 میں آیا اور وہ سماج کو بااختیار بنانے کا ایک اہم ذریعہ بن کر ابھرا ہے۔ تعلیم اور صحت کے میدان میں یہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مسٹر جیٹلی نے کہا کہ ہندوستان جیسے گوناگوں والے ملک میں کمیونٹی ریڈیو کا کردار زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ ہمارے یہاں ہر ضلع میں زبان اور بولیاں، ثقافت اور رسم و روایات بدل جاتی ہیں۔ مختلف زبانیں اور رسم و روایات آج دم توڑ رہی ہیں جن کا وجود قائم رکھنے کے لیے کمیونٹی ریڈیو بہت ہی اہم

ایک سے زیادہ ہنر کے فروغ کے پروگرام میں مائک پر خطاب کرتے ہوئے اقلیتی امور کی وزیر نجمہ ہپت اللہ

حسن آرا ٹرسٹ کی ثقافتی تقریب کا منظر

رول ادا کرسکتا ہے۔ آج دنیا بھر میں اخبارات کی اشاعت کم ہورہی ہے لیکن ہندوستان میں علاقائی زبانوں کے اخبارات میں وسعت آرہی ہے۔ کمیونٹی ریڈیو کے معاملے میں بھی یہی تجربہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔ اطلاعات ونشریات کے وزیرمملکت راجیہ وردھن سنگھ راٹھور نے کہا کہ ایف ایم ریڈیو صرف شہروں تک محدود ہے اور ایسے میں دیہات اور دور دراز علاقوں میں لوگوں کو بیدار کرنے میں کمیونٹی ریڈیو اہم رول ادا کرسکتا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 مارچ 2016

حسن آرا ٹرسٹ کی ثقافتی تقریب

نئی دھلی: ممتاز ادبی تنظیم حسن آرا ٹرسٹ کی جانب سے گذشتہ شام ایک ثقافتی تقریب کا اہتمام دہلی کے ایمپریل میں کیا گیا جس میں ملک و بیرون ملک کی نامور شخصیات نے حصہ لیا۔ اس موقع پر ملکہ ترنم انیتا سنگھوی غزل سرائی کی۔ تقریب میں مہمان خصوصی کے طور پر نائب صدر جمہوریہ ہند محمد حامد انصاری شریک تھے جبکہ دیگر مہمانان میں متعدد وزیر ممبران پارلیمنٹ وممتاز دانشور شعرائے زینت محفل تھے۔ اردو شاعری پر ناظم محفل فلم و تھیٹر کی معروف شخصیت عامر رضا حسین نے مختصر جائزہ پیش کیا۔ مختلف ثقافتی اداروں سے وابستہ ڈاکٹر کرن سنگھ و ممبر آف پارلیمنٹ این کے سنگھ کی فرمائش پر انیتا سنگھوی نے غالب کا کلام بھی پیش کیا۔ اس دوران حیدر کمال نقوی نے مہمانوں کا استقبال و پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے رسم شکریہ انجام دی۔ مخصوص شرکائے محفل میں جنتا دل کے سربراہ شرد یادو پروفیسر شاہد مہدی، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر ابھشیک سنگھوی، کامنا پرساد، سابق گورنر نکل کمار، سکھبیر سنگھ سندھو (جوائنٹ سکریٹری، ایچ آر ڈی)، سابق چیف جسٹس آف انڈیا آر سی لہوتی، سابق چیف جسٹس آف انڈیا آر ایم لوڑھا، ایم پی این کے سنگھ، جسٹس راجیو سچدر، جسٹس رنجنا دیسائی، مہارانی رائے صاحبہ بیگم جاویری، رائے صاحب عالم حیدرآباد، مہاراجہ انگ صاحب، صحافی رخشندہ جلیل، انجم زیدی، دہلی پولس کمشنر اجے چودھری، احمد پٹیل، سابق وزیراعلیٰ دہلی شیلا دکشت، فیشن ڈیزائنر روپا گپتا، سردار ایم پی سنگھ، نواب مراد علی خاں، انکم ٹیکس کمشنر جواد عابدی، علی عابدی، سلیم امروہی، ہم افضل، کمل سنگھ کے ساتھ ساتھ دہلی واطراف کی معزز شخصیات نے انیتا سنگھوی کو داد وتحسین سے سرفراز کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 21 مارچ 2016

ایک سے زیادہ ہنر کے فروغ کے پروگرام کا آغاز

نئی دھلی: مولانا آزاد نیشنل اکادمی فار اسکلس (مانس) کے اختراعی انٹر پرینر شپ اور ایک سے زیادہ ہنر کے فروغ کے پروگرام کا آغاز عمل میں آگیا۔ وزارت اقلیتی امور کے تحت نیشنل مائنارٹیز ڈیولپمنٹ اینڈ فائنانس کارپوریشن کے ذریعے 2014 میں قائم اس اکادمی کا مقصد اسکل انڈیا کے ویژن کی تکمیل کا حصول ہے۔ اقلیتوں کے روایتی تعلیمی اداروں جیسے مدارس، مکاتب اور دیگر اداروں کو مولانا آزاد اکادمی آف اسکلس کے ذریعے وزارت اقلیتی امور کے اسکل ڈیولپمنٹ پروگرام سے فائدہ پہنچانا ہے۔ حسن اور صحت، ملبوسات اور فیشن ڈیزائننگ، میڈیا اور تفریحات وغیرہ جیسے ہنروں کے مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والی بہت سی سرکردہ اور مقبول شخصیات کی موجودگی میں مرکزی اقلیتی وزیر نجمہ ہپت اللہ نے پروگرام لانچ کیا۔ انھوں نے اس موقع پر اوکھلا اور دریا گنج میں 2 سینٹروں کا بھی افتاح کیا۔ پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے بتایا کہ مولانا آزاد نیشنل اکادمی فار اسکلس وزارت اقلیتی امور کے تحت نیشنل مائنارٹیز ڈیولپمنٹ اینڈ فائنانس کارپوریشن کے ذریعے شروع کیا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی فرقوں میں اعتماد کی کمی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ، مانس نے اقلیتی فرقوں کے حاشیے پر زندگی گزارنے والے طبقوں، خصوصاً خواتین اور لڑکیوں کو، ان کے گھروں کے قریب ہی ہنروں کے فروغ کی تربیت دینے میں کامیابی حاصل کی ہے تاکہ انھیں نفع بخش روزگار/خود روزگار حاصل ہوسکے۔ مانس نے بہار، مہاراشٹر، جموں و کشمیر اور آسام میں واقع مختلف مدارس اور روایتی تعلیم کے دیگر اقلیتی اداروں کی نشاندہی کرکے وہاں ہنروں کے فروغ کے پروگرام شروع کیے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ ایک انوکھی پہل ہے جس کے تحت مختلف اسکلس کے سیٹوں میں ایسے سرکردہ مشاہر کو، ان کے اپنے اپنے میدانوں میں، ہنرمندیوں کے فروغ کے پروجیکٹوں کے لیے ایک ترغیبی قوت کی طرح استعمال کیا جائے جس سے اقلیتی فرقوں کے حاشیے پر رہنے والے طبقوں کو فائدہ پہنچ سکے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مارچ 2016

فکشن اور دیگر متون کے تراجم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام 'لامعنویت کی معنویت: فکشن اور دیگر متون کے تراجم' پر منعقدہ قومی سیمینار کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے مہمانِ خصوصی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایمریٹس پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ کوئی بھی لفظ با معنی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے حالات کے مطابق معنی نکالے جاتے ہیں۔ پروفیسر حنفی نے کہا کہ کسی بھی لفظ کو اس کے ثقافتی، اقتصادی اور ادبی تناظر میں ہی سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسان ہمیشہ سے دشوار اکائی رہا ہے جس کو آسانی سے نہیں سمجھا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ادب پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی زبان کا حسن ادب میں ہی پوشیدہ ہے اور اس کے مطالعہ کے دوران مطالعہ کرنے والے کی نظر اس کے اخلاقی اسٹینڈ پر ہونی چاہیے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر انجنی کمار سنہا نے کہا کہ مذہب میں یقین رکھنے والا القلم کار بھی اپنی تحریروں میں فطری تخلیقات کا ذکر کرتا ہے۔ ڈی ایس آر سیپ سیکنڈ کے کوآرڈی نیٹر پروفیسر اے آر فتیحی نے کہا کہ متعدد مواقع پر بے معنی الفاظ کے معنی تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیاست داں، سائنس داں، دانشور ہمیشہ بے معنی الفاظ کا استعمال کرتے رہے ہیں اور یہ صورتِ حال شاعری میں بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے نوم چومسکی کی 1957 میں تحریر کردہ کتاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کے بیشتر جملے گفتگو کا موضوع رہے ہیں۔ یو جی سی ایچ آر ڈی سینٹر کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی نے قرآن کریم کے حوالے سے حروف مقطعات پر بھرپور روشنی ڈالی۔

سی آئی آئی ایل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر اواین کول نے پروفیسر رقیہ سے منسوب اس پروگرام میں پروفیسر رقیہ حسن کے متعلق تعارفی کلمات پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے انگریزی کے معروف دانشور پروفیسر مسعود الحسن نے سیمینار کے تعلق سے تفصیلی گفتگو کی۔ شعبۂ لسانیات کی سربراہ پروفیسر شبانہ حمید اور پروفیسر خطیب سید مصطفیٰ نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت ڈاکٹر ناظرین بی لشکر نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 مارچ 2016

اکیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے افکار کے حوالے سے

نئی دہلی: مولانا آزاد اکادمی نئی دہلی کے زیر اہتمام دوروزہ قومی سیمینار بعنوان 'اکیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد

اپنے افکار کے حوالے سے' کا انعقاد آئی سی سی آر، آزاد بھون، آئی ٹی او، نئی دہلی میں 26 مارچ 2016 کو افتتاح کرتے ہوئے برصغیر ہند و پاک کے معروف اسلامی اسکالر پروفیسر سلمان ندوی صاحب سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز ڈربن یونیورسٹی ساؤتھ افریقہ نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور میرے والد مولانا سید سلیمان ندوی کے درمیان خوش گوار اور بے تکلفانہ تعلقات تھے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے قدرداں تھے۔ مولانا سید سلمان ندوی نے اسی افتتاحی اجلاس میں ماہنامہ براہین کا مولانا ابوالکلام آزاد خصوصی نمبر کا اجراء کیا۔ جسکے ایڈیٹر مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی ہیں۔ مولانا ندوی نے اجراء کرتے ہوئے کہا کہ اس خصوصی نمبر میں مولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف گوشے آگئے ہیں۔ پروفیسر احمد عبدالرحمٰن قاضی نے مولانا آزاد اور مصری علماء کے ذاتی تعلقات و علمی روابط کا ذکر کیا اور کہا کہ رشید رضا مصری اور مفتی عبدہ سے انکے گہرے تعلقات تھے۔ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے کہا کہ مولانا آزاد متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ پروفیسر قدوس جاوید صاحب نے بھی مولانا آزاد کے جذبہ قومی یکجہتی کی تحسین کی اور رانچی کے مشہور سماجی آدمی جان محمد کے حوالے سے گفتگو کی، جو مولانا آزاد کے بڑے قدرداں تھے۔ ڈاکٹر مدن لعل کپور نے مولانا آزاد کی کرم فرمائی، ان کی خوردنوازی اور 1947 کے پرآشوب دور میں ان کی مدد کرنے اور انکے سفارشی خط کا ذکر کیا جو مولانا آزاد نے ان کے لیے لکھا تھا۔ پروفیسر محمد سلیم قدوائی، شبیہ احمد، نہال احمد عثمانی آئی پی ایس اور جناب ایس ایم خان صاحب نے مولانا آزاد کی شخصیت پر بھرپور روشنی ڈالی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم صاحب نے اپنے صدارتی کلمات میں مولانا آزاد اکیڈمی اور اس کے کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کی وسیع خدمات کا بھرپور اعتراف کرنا چاہیے۔ ارتضیٰ کریم صاحب نے کہا کہ مولانا آزاد نے ہندوستان کی جنگ آزادی میں شرکت و شمولیت محض حب الوطنی کی بنیاد پر اختیار نہیں کی بلکہ انہوں نے آزادی کی لڑائی کو ایک دینی فریضہ تصور کیا تھا اور اسی جذبہ سے یہ جنگ لڑی گئی تھی۔ ڈاکٹر سید فاروق صاحب نے بھی افتتاحی اجلاس میں خطاب کیا اور مولانا آزاد کو عظیم مجاہد آزادی قرار دیا۔ پروفیسر سلمان ندوی صاحب کی دعا پر یہ افتتاحی اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

مولانا آزاد اکادمی کی جانب سے دوروزہ قومی سیمینار 'اکیسویں صدی میں مولانا ابوالکلام آزاد اپنے افکار کے حوالے' سے منعقد دوسرے، تیسرے، چوتھے اجلاس کی صدارت جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر عبدالخالق رشید نے کی اور نظامت دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے استاذ ڈاکٹر علیم اشرف خاں نے کی۔ یہ سیمینار آئی سی سی آر آزاد بھون میں، دہلی اردو اکادمی کے تعاون سے منعقد ہوا۔ ڈاکٹر عبید اقبال عاصم، ڈاکٹر سلطان احمد، ڈاکٹر احسان اللہ فہد، ڈاکٹر احمد خان، مولانا عقیدت اللہ قاسمی، ڈاکٹر ابوبکر عباد، پروفیسر سلیم قدوائی، ڈاکٹر منور حسن کمال، ڈاکٹر اخلاق آہن، ڈاکٹر علیم اشرف خان نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر عبدالخالق رشید نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ میں چھ مہینوں میں کئی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شریک ہوا ہوں لیکن اتنا باوقار اور کامیاب سیمینار کم دیکھا ہے۔ پروفیسر عبدالخالق رشید نے مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہا انہیں مبارکباد پیش کی۔ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی نے اخیر میں سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: مولانا آزاد اکیڈمی، نئی دہلی، 26و27 مارچ 2016

نسخۂ حمیدیہ کی بازیافت

نئی دہلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک توسیعی خطبہ 'نسخۂ حمیدیہ کی بازیافت' کے موضوع پر منعقد ہوا۔ اس خطبے میں ورجینیا یونیورسٹی، امریکہ کی معروف اسکالر ڈاکٹر مہر افشاں فاروقی نے دیوانِ غالب کے 1821 کے مخطوطے کے تعلق سے کئی بنیادی باتیں بیان کیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ مخطوطہ عام طور سے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ حمیدیہ کے نام سے پوری اردو دنیا میں جانا جاتا ہے لیکن اس مخطوطے کو آخری بار امتیاز علی خاں عرشی نے 1944 کے آس پاس دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی مطبوعہ شکل تو لوگوں کی نظر میں رہی لیکن اصل مخطوطے کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ واضح رہے کہ اس مخطوطے کی 2012 میں بازیافت ہوئی ہے جسے عکسی صورت میں طویل مقدمے کے ساتھ شائع کرنے کا سہرا مہر افشاں فاروقی کے سر ہے۔ اس موقعے پر مہر افشاں فاروقی نے نسخۂ حمیدیہ کے مخطوطے کے تازہ ترین عکسی ایڈیشن کو سامنے رکھ کر کئی کارآمد نکات کی وضاحت کی۔ مہمان مقرر کا استقبال کرتے ہوئے صدر شعبہ پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ میں اردو شعر و ادب اور تہذیب سے متعلق علمی خدمات انجام دینے والوں میں مہر افشاں فاروقی کی خاص حیثیت ہے۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے پروفیسر احمد محفوظ نے مہمان معزز کا تفصیلی تعارف پیش کیا۔ خطبے کا آغاز شعبے کے طالب علم فیروز عالم نے تلاوت کلام پاک سے کیا اور آخر میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 مارچ 2016

اے ایم یو میں توسیعی خطبہ

علی گڑھ: اقبال کے بعد اردو نظم کی شناخت کو متعین کرنے اور اس کے تخلیقی امکانات سے بھرپور استفادہ کرنے والوں میں ن م راشد، میراجی اور اخترالایمان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اخترالایمان ایک مستحکم شعری روایت کے معمار اور جدید شعرا کے اہم پیش رو کے طور پر منظر عام پر آئے۔ ان خیالات کا اظہار 'وزیٹنگ فیلو لیکچرز'

کے تحت شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں منعقد توسیعی خطبہ میں پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن نے کیا۔ انھوں نے 'اختر الایمان کی عشقیہ شاعری' پر تحقیقی مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اختر الایمان اپنی فکر کے بسیط اور واضح معاشرتی میلان اور فنی ترجیحات کے باوجود ہر ترغیب و تحریص سے بے نیاز وہ اپنی شرائط اور بصیرت کی روشنی میں اپنی روش پر جادہ پیماں رہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اختر الایمان کی نظر میں جو چیز کسی تخلیق کو بامعنی بناتی ہے، ان میں شاعر کے محسوسات کی تپش، شدت اور دبازت شامل ہے۔ ممتاز فکشن نگار و شاعر پروفیسر غضنفر علی نے اپنے خطبے میں کہا کہ ادب انسان کو زندگی سے جوڑتا ہے اور ادیب کے اندر نمایاں قدر کی قوتِ احساس، قوتِ متخیلہ اور قوتِ گویائی کا ہونا نہایت ہی ضروری ہے۔ شعبۂ اردو کے چیئرمین پروفیسر سید محمد ہاشم نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ تخلیق کے تعلق سے پروفیسر غضنفر علی نے نہایت ہی عالمانہ خطبہ پیش کیا ہے۔ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن نے بھی اختر الایمان کی شاعری پر نہایت دلچسپ اور عالمانہ گفتگو کی ہے۔ اس سے قبل پروفیسر صغیر افراہیم نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے مقررین کا تعارف پیش کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' 20 مارچ 2016

شعبہ عربی دہلی یونیورسٹی میں عالمی سمینار

نئی دھلی: شعبۂ عربی کے زیراہتمام، شعبہ فارسی، اردو اور سنسکرت کے اشتراک سے 'ہندوستانی تعلقات: پنچ

تنترا/کلیلہ ودمنہ: تاریخ، ثقافت اور روایت' کے موضوع پر منعقدہ سہ روزہ عالمی سمینار کا افتتاح ہوا۔ سمینار میں خصوصی لیکچر ڈی یو کے عالمی رابطہ عامہ کے ڈین پروفیسر آنند پرکاش نے دیا۔ افتتاحی نشست کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے کی۔ استقبالیہ کلمات پروفیسر ولی اختر نے پیش کیے اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے آرٹ فیکلٹی کی ڈین پروفیسر منی ساہنی نے شرکت کی۔ جبکہ مہمان اعلیٰ کی حیثیت سے مصری سفارت خانہ دہلی کے سفیر حاتم تاج الدین موجود تھے۔ سہ روزہ عالمی سمینار کی تیسری نشست کی صدارت شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر شفیق احمد خان ندوی نے کی۔ اس نشست میں تیونس سے آئے پروفیسر عامر توفیق، پروفیسر صفا بطی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے ڈاکٹر جاوید ندیم، اور شعبۂ عربی الہ آباد یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر محمود مرزا نے اپنے وقیع مقالات پیش کیے۔ چوتھی نشست میں جامعہ منوفیہ مصر کے پروفیسر عبدالقادر الشاذلی، پروفیسر عواطف ملک، بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی، راجوڑی، جموں و کشمیر کے استاذ ڈاکٹر محمد عفان، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی لکھنؤ کیمپس کے شعبۂ عربی کے استاذ ڈاکٹر سعید بن مخاشین نے کلیلہ ودمنہ کی تاریخ، روایت اور ثقافت کے حوالے سے اپنے گراں قدر مقالات پیش کیے۔ اس نشست کی صدارت تیونس کے پروفیسر بن عامر توفیق نے کی۔ پانچویں نشست شعبہ اردو اور فارسی کے لیے خاص تھی اس میں شعبۂ اردو کے پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر علی جاوید، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر مشتاق احمد قادری، ڈاکٹر امتیاز اور ڈاکٹر شاذیہ عمیر نے اپنے مقالات پڑھے، اس نشست کی صدارت الہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی کی پروفیسر صالحہ رشید نے کی۔ شعبہ فارسی کے پروفیسر علیم اشرف اور ڈاکٹر مہتاب جہاں نے بھی مقالات پڑھے۔ آخری سیشن کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ عربی کے پروفیسر ایوب ندوی نے کی۔ اس سیشن میں ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب، ڈاکٹر زرنگار اور ڈاکٹر ایس ایم طارق نے مقالات پیش کیے اور عربی زبان کے ہندوستانی زبانوں پر اثرات کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں عربی زبان وادب کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔

شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی کے زیراہتمام شعبۂ اردو، فارسی اور سنسکرت کے اشتراک سے جاری سہ روزہ عالمی سمینار اختتام پذیر ہوگیا۔ اختتامی نشست سے خطاب کرتے ہوئے نیشنل بک ٹرسٹ کے چیئرمین بی بی شرما نے کہا کہ 'کلیلہ ودمنہ/پنچ تنترا میں' حیوانوں کے توسط سے ایسی تعلیم دی گئی ہے جو ہمیں اچھائیوں سے آراستہ کرے اور برائیوں سے بچائے۔ انسانی معاشرہ میں ایک دوسرے کے تئیں ہمدرد بن کر ہمیں زندگی بسر کرنی چاہیے یہی پنچ تنترا کا حاصل ہے انھوں نے کہا کہ دنیا میں امن و سکون کی فضا قائم کرنے کے لیے اقدار و اصول کے ساتھ ہمیں بھائی چارہ اور آپسی ہم آہنگی قائم کرنی ہوگی۔ اس نشست کی صدارت تیونس سے آئے پروفیسر عبدالقادر شاذلی نے کی۔ نظامت سمینار کے کنوینر ڈاکٹر سید حسنین اختر نے کی۔ اختتامی تقریب میں خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے شعبۂ فارسی کے پروفیسر علیم اشرف نے عالمی سمینار کی کامیابی کا سہرا شعبۂ عربی کو دیتے ہوئے کہا کہ ان تین دنوں میں ہند و بیرونِ ہند سے آئے فاضل مقالہ نگاروں نے تقریباً 56 مقالات پڑھے۔ صدر شعبۂ عربی پروفیسر ولی اختر نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ آل انڈیا ایسوسی ایشن آف عربک ٹیچرس اینڈ اسکالر کے صدر و شعبۂ عربی ڈی یو کے استاذ پروفیسر محمد نعمان خان نے مہمانوں کا تعارف کرایا جبکہ شعبہ کے استاذ ڈاکٹر نعیم الحسن نے کلمات تشکر پیش کیے۔ اس موقعے پر شعبۂ سنسکرت دہلی یونیورسٹی کے صدر پروفیسر رمیش بھاردواج، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، قومی کونسل برائے فروغ سندھی زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر روی ٹک چندانی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10و11 مارچ 2016

منشی نولکشور یادگاری خطبہ

نئی دھلی: منشی نول کشور اور سرسید کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ منشی نول کشور نے طباعت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا اور اپنے زمانے میں ادبی، مذہبی اور معاشرتی کتابوں اور رسائل کی جس طرح اشاعت کی وہ تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ منشی نول کشور نے قرآن اور دیگر مذہبی کتابوں کی اشاعت بے حد اہتمام سے کی۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر اصغر عباس نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیراہتمام منعقدہ منشی نول کشور میموریل

خطبہ کے موقعے پر کیا۔ ان کے خطبے کا موضوع 'منشی نول کشور اور سرسید: قربتیں اور فاصلے' پر تھا۔ جلسے کی صدارت شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ یادگار خطبات میں کئی اہم نکات نکل کر سامنے آتے ہیں جن سے طلبا، ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول

نے تمام مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے شعبۂ اردو کی سال بھر کی سرگرمیوں کے بارے میں بتایا۔ جلسے کی نظامت پروفیسر احمد محفوظ نے کی۔ اظہار تشکر پروفیسر وہاج الدین علوی نے اور منشی نول کشور پر تعارفی نوٹ ڈاکٹر خالد مبشر نے پیش کیا۔ جلسے کا آغاز عبدالکریم رضوان نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 مارچ 2016

دہلی

نئے پرانے چراغ

نئی دہلی: اردو اکادمی، دہلی کا مقبول ترین سالانہ پروگرام 'نئے پرانے چراغ' اکادمی کے قمر رئیس سلور جوبلی

آڈیٹوریم میں منعقد ہوا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت پروفیسر اختر الواسع کمشنر برائے لسانی اقلیات نے کی۔ جبکہ خیر مقدمی کلمات اکادمی کے وائس چیئر مین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے ادا کیے۔ افتتاحی اجلاس کی نظامت ریشماں فاروقی نے کی۔ افتتاحی تقریر میں ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے پروفیسر اختر الواسع کا مکمل خاکہ پیش کیا۔ وائس چیئر مین نے نئے چراغوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ علم حاصل کرنے کے اہم ذرائع میں ایک اہم ذریعہ مجلس بھی ہے جہاں مستند ادیبوں کے جلو میں بیٹھ کر کسب فیض کا حصول کیا جاتا ہے۔ پروگرام کے اگلے حصے میں تحقیقی وتنقیدی اجلاس منعقد کیا گیا جس کی صدارت ڈاکٹر ریاض عمر اور ڈاکٹر عشرت جمیل نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر سہیل انور نے کی۔ خطبہ صدارت کے دوران ڈاکٹر عشرت جمیل نے کہا کہ تہذیب کے بقا کے لیے ہمیں اپنی زبان اور اپنے کلچر سے دوری کا رویہ ترک کرنا ہوگا۔ ڈاکٹر ریاض عمر نے اس اجلاس میں پڑھے گئے تمام 12 مقالوں پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

دوسرے دن کے تحقیقی وتنقیدی اجلاس کی صدارت پروفیسر غضنفر اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر شبیر عالم نے کی۔ داغ دہلوی، ذوق اور خطوط غالب پر لکھے گئے مقالوں کی کل تعداد 11 تھی۔ تخلیقی نشست کی صدارت معروف ناول و افسانہ نگار پیغام آفاقی اور پروفیسر عبدالرحمٰن ہاشمی نے کی جبکہ نظامت ڈاکٹر ندیم احمد نے کی۔

'نئے پرانے چراغ' کے تیسرے دن صبح تحقیقی و تنقیدی اجلاس کی صدارت پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر معین الدین جینا بڑے نے کی جبکہ نظامت مسرور فیضی نے کی۔ داغ دہلوی، ذوق اور خطوط غالب پر لکھے اور پیش کیے گئے مقالوں کی کل تعداد گیارہ تھی۔

تخلیقی نثر کے اجلاس کی صدارت پروفیسر توقیر احمد خاں اور ڈاکٹر تسلیم رحمانی نے کی اور نظامت ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے کی۔

چوتھے دن کے جلسے کی صدارت ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی اور ڈاکٹر رضا حیدر نے کی۔ جبکہ نظامت ڈاکٹر احمد امتیاز نے کی۔ داغ دہلوی، ذوق اور خطوط غالب پر لکھے گئے مقالوں کی کل تعداد بارہ تھی۔ آخر میں وائس چیئر مین ڈاکٹر ماجد دیوبندی نے اس آخری نثری نشست کے اختتام کا اعلان کیا اور اظہار تشکر کے طور پر ان چار دنوں میں تشریف لائے تخلیق کاروں، ناقدوں، محققوں کے علاوہ بڑی تعداد میں شریک ہوئے شعرا کا بھی شکریہ ادا کیا ساتھ ہی تمام اردو اخبارات کا بھی شکریہ ادا کیا جنھوں نے مسلسل چار دنوں تک اس ادبی اجتماع کی خبریں تفصیل سے شائع کیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' 20 تا 22 مارچ 'انقلاب' دہلی 23 مارچ 2016

قاضی مجاہدالاسلام میموریل لکچر

نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز (آئی او ایس)

کے زیر اہتمام جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آٹھواں قاضی مجاہدالاسلام میموریل لیکچر بعنوان 'میر حسن دہلوی: شخصیت اور ادبی خدمات' کا انعقاد کیا گیا جس میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر و پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے میر حسن دہلوی کی ولادت، رحلت، سکونت، حسب و نسب، تعلیم و تربیت، شخصیت، مشاغل، شاعری، فکر و فن اور ان کے عہد حالات بیان کیے اور اس وقت کے پس منظر پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے تاریخ کے حوالے سے کہا کہ 1758 میں احمد شاہ ابدالی کے دہلی پر حملہ کے دوران میر حسن دہلی کو خیر باد کہہ کر بڑی بے سروسامانی کی حالت میں اپنے والد میر ضاحک اور خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ سفر کی صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے لکھنو پہنچے۔ لیکن یہاں دل نہیں لگا اور وہ فیض آباد چلے گئے۔ ان کا عہد 1728 سے 1786 ہے، جسے میر حسن کا عرصہ حیات کہنا چاہیے۔ میر حسن کے کارناموں مثنوی 'سحرالبیان' مثنوی 'شادی آصف الدولہ'، مثنوی 'رموز العارفین' اور مثنوی 'گلزار ارم' کا جائزہ لیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ سحرالبیان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ برطانوی علمانے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، بعد ازاں دنیا کے کئی ملکوں میں مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا گیا۔ دہلی یونیورسٹی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر سید صادق علی نے کہا کہ میر حسن کی مثنوی اٹھارہویں صدی کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔ منظر نگاری میں ان کا کوئی ثانی نہیں، وہ جذباتی شاعر بھی ہیں اور ان کے یہاں عشقیہ کلام بھی ہے، ان کی مثنوی کے 17 اشعار میں تصوف کے رنگ و آہنگ نظر آتے ہیں، ان میں جذبات نگاری اور فطرت نگاری بھی ہے۔ انھوں نے فارسی کے غلبہ والے دور میں اردو زبان کی آبیاری کی۔ آئی او ایس سکریٹری جنرل پروفیسر زیڈ ایم خاں نے کہا کہ مذکورہ موضوع ادب برائے ادب نہیں بلکہ یہ ادب برائے زندگی ہے۔

قبل ازیں آئی او ایس فائنانس سکریٹری پروفیسر اشتیاق دانش نے سامعین کا خیر مقدم کرتے ہوئے آئی او ایس کا مختصر تعارف کرایا اور قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی حیات و خدمات پر روشنی ڈالی۔ نظامت ڈاکٹر نکہت حسین ندوی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مارچ 2016

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں توسیعی خطبات

نئی دهلی: شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام

دو توسیعی خطبات کا انعقاد کیا گیا۔ پہلا خطبہ پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے 'اختر الایمان کی عشقیہ شاعری' کے موضوع پر پیش کیا اور کہا کہ اقبال کے بعد اردو نظم کی شناخت کو متعین کرنے اور اس کے تخلیقی امکانات سے بھرپور استفادہ کرنے والوں میں ن م راشد، میراجی اور اختر الایمان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ تاہم جو قدرافزائی راشد اور میراجی کے حصے میں آئی وہ اختر الایمان کا مقدر نہ بن سکی۔ پروفیسر ہاشمی نے مزید کہا کہ اختر الایمان کی شاعری اپنے وسیع تر مفہوم میں عشق کی پرچھائیوں کے تعاقب سے پیدا ہونے والے حزن و ملال کی وہ سرگذشت ہے جسے شاعر اور وقت کے دست ستم دونوں نے مل کر کیا ہے۔

دوسرا توسیعی خطبہ انجم عثانی نے 'برقی مواصلاتی نظام اور اردو' کے موضوع پر پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ زندہ زبان زندہ قوموں کی علامت ہے جن قوموں کی تہذیب و ثقافت سے انسانیت متاثر ہوتی ہے۔ زبانیں ہی جذبات، احساسات اور خیالات کی ترسیل کا مہذب طریقہ اور وسیلہ ہوتی ہیں۔ اس لیے زبان جتنی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی ثقافت و تہذیب بھی اتنی ہی ترقی یافتہ اور مہذب ہوگی۔ ترسیل کے ذرائع انسانی زندگی کی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ انجم عثانی نے مزید فرمایا کہ ضرورت اس بات ہے کہ اردو والے ٹی وی میڈیم کے تکنیکی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرکے زبان کا تخلیقی استعمال کرنے کی کوشش کریں۔ برقی مواصلاتی نظام اور خاص طور پر ٹیلی ویژن میں اردو زبان کا موثر کردار جاری ہے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر شہپر رسول نے جلسے کی صدارت کی اور مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے کہا کہ دونوں مقررین اردو زبان و ادب کے خدمت گار ہیں۔ پروفیسر ہاشمی کی جامعہ سے گہری وابستگی رہی وہیں انجم عثانی کا رشتہ دور درشن کے اردو سیکشن سے گہرا رہا ہے۔ جلسے کی نظامت پروفیسر شہزاد انجم نے کی اور پروفیسر کوثر مظہری نے اظہار تشکر کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 مارچ 2016

اردو زبان کو ذریعہ معاش بنانے کے لیے مرکز سنجیدہ

مراد آباد: اردو زبان کو ذریعہ معاش بنانے کے لیے مرکزی حکومت مزید ایک قدم اٹھانے جارہی ہے جس کے تحت الیکٹرانک میڈیا کا تلفظ درست کرنے کے لیے

تربیت دی جائے گی نیز فروغ اردو کے لیے آن وہیل اسکیم شروع کی جارہی ہے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار پی ڈبلیوڈی گیسٹ ہاؤس میں نمائندہ صحافت سے دوران گفتگو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان پہلے سے ہی اردو کو روزی روٹی سے منسلک کرنے کے لیے کام کررہی ہے۔ اردو میں کمپیوٹر کی تربیت دینے کے ساتھ ساتھ اب میڈیا کے شعبہ میں بھی ایک قدم اٹھایا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اہلکاروں کو ایک سال، 6 ماہ یا 9 ماہ کی ٹریننگ دینے کی اسکیم ہے، جس سے میڈیا اہلکاروں کی تلفظ درست ہوگا اور اردو کی شیریں زبانی کا احساس ناظرین کو ہوگا نیز اردو کو فروغ بھی ملے گا۔ انھوں نے بتایا کہ فروغ اردو کے لیے آن وہیل نام کی اسکیم شروع کی جارہی ہے جس کے تحت کونسل کی گاڑیاں، گلی محلوں اور گاؤں میں جاکر لوگوں کو اردو کی تعلیم دیں گی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 29 مارچ 2016

اتر پردیش:

مولانا الطاف حسین حالی ایک ہمہ گیر شخصیت

سنبھل: 'مولانا الطاف حسین حالی: ایک ہمہ گیر شخصیت' کے عنوان سے علامہ اقبال ماڈرن پبلک اسکول میاں سرائے میں مولانا الطاف حسین حالی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام اتر پردیش اردو اکادمی کے اشتراک سے قومی سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں ملک کی معروف یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر اور شہر و بیرون شہر کی اہم شخصیات نے شرکت کی۔ سیمینار کے پہلے سیشن میں جے این یو دہلی سے آئے ڈاکٹر جابر زماں نے اپنا مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے مولانا الطاف حسین حالی کی شخصیت کے تعارف کے ساتھ ہی ان کی ادبی خدمات سے بھی روشناس کرایا۔ ڈاکٹر فیضان، عباس رضا، محمد عالم نے بھی مقالے پیش کیے۔ دوسرے سیشن میں عمران عاکف خان، غلام سرور، محمد فرقان، ڈاکٹر زیبا ناز، ڈاکٹر رباب انجم، محمد شاہد اور محمد سفیان نے اپنے مقالے پڑھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی 21 مارچ 2016

اردو کے فروغ میں میرٹھ کا کردار

میرٹھ: ''اس انقلابی سرزمین میرٹھ نے اردو ادب کے فروغ میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ بے مثل ہیں۔ افضل جھنجھانوی نے بارہ ماسہ کی روایت کو استحکام عطا کیا۔ قلق میرٹھی نے معروف زمانہ ساز شاعر مرزا غالب کے کلام کی تقریظ تحریر کی۔ رنج میرٹھی نے شاعرات کا پہلا تذکرہ تحریر کیا۔ اسماعیل میرٹھی اور قلق میرٹھی نے اردو نظم کے احیا میں بے مثال کارنامے انجام دیے۔ جدید شعرا و ادبا میں بشیر بدر، حفیظ میرٹھی، انتظار حسین اور ریوتی سرن شرما اپنی اصناف میں اہمیت کے حامل ہیں۔ لسانیات کے شعبے میں شوکت سبزواری اور امیر اللہ خاں شاہین کے کارناموں سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ یہ جملے پروفیسر فاروق بخشی (صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور، راجستھان) کے تھے جو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی گولڈن جبلی تقریب کے موقعے پر شعبہ اردو کے ذریعے منعقدہ سیمینار بعنوان 'اردو ادب کے فروغ میں میرٹھ کا کردار' میں کلیدی خطبہ پیش کررہے تھے۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت پروفیسر شہپر رسول (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) نے کی۔ بحیثیت مہمان خصوصی یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجہ موجود رہے جبکہ مہمان ذی وقار کے طور پر سابق وزیر حکومت اتر پردیش ڈاکٹر معراج الدین احمد شریک ہوئے۔

نظامت ڈاکٹر آصف علی نے کی۔ اس دوران ڈاکٹر محمد مستمر، ڈاکٹر عابد حسین حیدری، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری اور شارق میرٹھی کی کتابوں اور مجموعوں کا بدست مہمانان اجرا عمل میں آیا۔ مہمان خصوصی شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجہ نے کہا کہ ہر قسم کا ادب آپسی اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے اور اس طرح ادب انسانیت کی اعلیٰ اقدار قائم کرنے میں نہایت معاون ہوتا ہے۔ صدارتی خطاب میں پروفیسر شہپر رسول نے کہا کہ انقلابی شہر میرٹھ نہ صرف بڑے ادبا کی جائے پیدائش ہے بلکہ میرٹھ کے ادیبوں کے ذکر کے بغیر اردو ادب کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ میرٹھ کے تعلق سے یہ شکایت غلط ہے کہ میرٹھ میں ناقدین نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، سلیم احمد اور حسن عسکری تنقیدی دنیا میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں۔ سیمینار کے باقی چار اجلاس میں کئی مقالات پڑھے گئے۔ ان اجلاس کی صدارت پروفیسر زین الساجدین، ڈاکٹر سراج الدین احمد، پروفیسر آرادھنا، مکیش کپور، حاجی عمران صدیقی، ڈاکٹر ہاشم رضا میدی، قاضی زین الراشدین، بھارت بھوشن شرما، اکل شرما، رفعت جمالی، ہرپال سنگھ پنوار اور ڈاکٹر ہما مسعود نے کیں۔ اختتامی اجلاس میں نائب شیخ الجامعہ پروفیسر ایچ ایس سنگھ نے شرکت کی اور سبھی مقالہ نگاران کو سرٹیفکیٹ دیے۔ اس موقعے پر اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کا قیام بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 مارچ 2016

جگر مرادآبادی کی حیات، شخصیت اور فن

مراد آباد: عالمی شہرت یافتہ شاعر و شہنشاہ تغزل جگر مرادآبادی کی شخصیت اور اردو شاعری پر ایک سیمینار بعنوان 'جگر مراد

آبادی کی حیات، شخصیت اور فن' منعقد کیا گیا۔ ایم ایچ ڈگری کالج میں منعقد سیمینار میں مہمانان خصوصی کی حیثیت سے رضا کالج رامپور کے شریف احمد قریشی نے شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز ایم ایل سی ڈاکٹر جے پال سنگھ نے کیا۔ اس موقعے پر مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر مجاہد فراز، ضیا ضمیر، تاجور سلطانہ، س ش عالم، ڈاکٹر الیاس انجم وغیرہ نے جگر مرادآبادی کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مشترکہ طور پر کہا کہ جگر مرادآبادی کی شاعری میں پیار و محبت کا پیغام ہے جسے اس دور میں عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے شریک ہوئے ضلع مجسٹریٹ زبیر بن صغیر نے اپنے خطاب میں کہا کہ جگر مرادآبادی ایک شخص نہیں بلکہ شخصیت کا نام ہے۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے جگر مرادآبادی کے کلام کا مطالعہ کیا ہے اور ان کی شاعری کے وہ بھی قائل ہیں۔ سیمینار کی صدارت عالمی شہرت یافتہ شاعر منصور عثمانی اور نظامت ایم ایچ ڈگری کالج شعبہ اردو کی صدر ڈاکٹر اسما عزیز نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مارچ 2016

جشن یوم اردو صحافت

مراد آباد: جشن یوم اردو صحافت کا انعقاد ہیوٹ مسلم انٹر کالج میں کیا گیا جس کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی حکومت ہند کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ارتضیٰ کریم نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر بزرگ کانگریس لیڈر لکشمن پرساد کھنہ شرکت کی۔ جبکہ مہمانان اعزازی ڈاکٹر وجاہت حسین، معصوم مرادآبادی، پروفیسر قدوس جاوید، سین شین عالم صغیر سعید خاں رہے۔ جلسے کی سرپرستی مفتی عبدالمنان کلیمی، شیعہ امام ڈاکٹر مولانا مظفر حسن سلطان ترابی نے کی اور نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر ایڈوکیٹ و ڈاکٹر رباب انجم نے انجام دیے۔ پروگرام کے کنوینر سینئر صحافی مرتضیٰ اقبال رہے۔ مولانا قاسم رضا کی تلاوت و نور قاری کی نعت شریف کے ساتھ شروع ہوئے پروگرام میں مقررین نے کہا کہ فروغ اردو کے لیے ہمیں صرف سرکار پر منحصر نہیں رہنا بلکہ ہمیں خود اردو کا حق ادا کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا ہوگا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہا کہ اردو کے فروغ کے لیے بھرپور کوشش کی جارہی ہے۔ وزیر اعظم اور وزیر فروغ انسانی وسائل کے ذریعے مواقع و فنڈ فراہم کیے جارہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو رام پور کے ڈائرکٹر ثروت عثمانی نے کہا کہ جب تک مرتضیٰ اقبال جیسے لوگ ہیں اردو باقی رہے گی۔ پروگرام کے کنوینر مرتضیٰ اقبال نے کہا کہ اردو کے تعلق سے جس مہم کی ابتدا کی ہے وہ واقعی ہم ہندوستانیوں کو اردو سے تعلق کے ہمارے بزرگوں کی وابستگی کا احساس دلا کر اردو کے تئیں ہماری ذمے داری کا احساس دلاتی ہے۔ اخیر میں مہمانان کو مومنٹو وشال اوڑھا کر اعزاز سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 28 مارچ 2016

اقبال کا فلسفۂ خودی

پیلی بھیت: علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے فلسفۂ خودی نے ہندوستان کے فکری ادب کو بین الاقوامی سطح پر لازوال بلندیوں سے ہمکنار کرنے کا وہ عظیم فریضہ انجام دیا ہے جو ہندوستان اور باو شعرا کو صبح قیامت تک احساس کمتری سے دوچار نہیں ہونے دے گا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار اردو زبان و ادب کے معروف ناقد مجیب ساحل نے کیا۔ وہ اقرا گرلس انٹر کالج میں اردو اکادمی اترپردیش کے مالی تعاون سے منعقدہ 'اقبال کا فلسفۂ خودی' ادبی سیمینار میں مقالہ پیش کررہے تھے۔ اس سے قبل سیمینار کا ابتدا ضلع مجسٹریٹ معصوم علی سرور کے ذریعے شمع روشن کرکے کی گئی۔ سیمینار کی صدارت بزرگ شاعر و ادیب حسن میر خاں طارق بریلوی اور نظامت عرفان ساگر نے کی۔ مجیب ساحل نے اپنا مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ اقبال کا کلام ایک پیغام ہے جو خواب غفلت میں مبتلا قوم کو بیدار کرنے کا کام کرتا ہے۔ ضلع مجسٹریٹ معصوم علی سرور نے اپنے افتتاحی خطبے میں علامہ اقبال کو علم و ادب کا گہوارہ بتایا۔ محترمہ انور جہاں نے کہا کہ اقبال کے قلم سے وارد ہونے والا ہر حرف قوم کی محرومیوں کا درد بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ معروف معالج اور ادیب ڈاکٹر شرافت اللہ شفا نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اقبال قوم کو جمود و ٹھہراؤ کے قعر ذلت سے نکال کر میدان علم و عمل میں متحرک کرنا چاہتے تھے۔ آخر میں صدر محفل حسن میر خاں طارق بریلوی نے اپنا مقالہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ مغرب کی ظاہری ریاکاری کو دیکھ کر گمراہ ہوجانے والے لوگوں کے لیے اقبال کی ذات ایک نمونہ عمل ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مارچ 2016

لسانیات کی اہمیت وافادیت

لکھنؤ: ماہر لسانیات مرزا خلیل احمد بیگ نے نہایت اہم موضوعات 'لسانیات کی اہمیت و افادیت' اور 'جدید ادبی تنقید' پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے بتایا کہ لسانیات اور ادب دونوں کا مطالعہ الگ الگ ڈھنگ سے ہوتا ہے۔ لسانیات کا مطالعہ معروضی اور توضیحی ہے، تہذیب کے ارتقا میں تکلم یعنی گفتار پر اصرار کیا جاتا ہے تحریر کو اہمیت نہیں دی جاتی، زبان قائم بالذات نہیں ہے۔ زبان کے بولنے والے ختم ہوجاتے ہیں اسی لیے وہ زبان مرجاتی ہے۔ اگر کسی انسان کو سماج سے الگ کردیا جائے تو وہ انسان بولنا نہیں سیکھ سکتا۔ اسی طرح کسی سماج کی کوئی

زبان نہیں ہوگی جب تک اس کے بولنے والے زندہ نہ ہوں۔ جدید تنقید کے منظرنامے میں پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ نے نئی تنقید، ہیئتی تنقید، ساختیات پس ساختیات اور اطلاقی تنقید جیسے پیچیدہ موضوعات پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس توسیعی خطبے کی صدارت کیمپس کی انچارج ڈاکٹر وسیم بیگم نے کی۔ انھوں نے مرزا خلیل احمد بیگ کا خیر مقدم کیا اور ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ وہ ایک ماہر لسانیات ہیں اور جدید تنقید پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ اس کے علاوہ لسانیات، اسلوبیات اور تنقید پر ان کی 14 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ سو سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 17 مارچ 2016

اے ایم یو میں توسیعی خطبہ

علی گڑھ: ناول ایک بیانیہ صنف ہے اور مکالمے اس میں قدغن لگاتے ہیں۔ بیانیہ کا دامن بہت وسیع ہے اور اسے صرف ناول تک ہی محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ٹی وی اور ریڈیو پر نشر ہونے والے مباحث بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد و جدید تنقید کے نامور نقاد پروفیسر عتیق اللہ نے شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں 'وزیٹنگ فیلو لیکچرز' کے تحت منعقد ہونے والے توسیع خطبہ کو خطاب کرتے ہوئے کیا۔ نظیر اکبرآبادی کی شاعری پر تحقیق کرنے والے شعبۂ ہندی کے پروفیسر عبدالعلیم نے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ نظیر اکبرآبادی کو اس سے قبل محض عوامی شاعر ہی سمجھا جاتا تھا لیکن شعبۂ ہندی میں جب ان پر تحقیق کی گئی تو ان کے کلام کی بنا پر انھیں جدید شاعر قرار دیا گیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ نظیر اکبرآبادی کی شاعری جدید حسیت سے بھری ہوئی ہے، ان کی شاعری میں جو سماجی مسائل پیش کیے گئے ہیں ہندی ادب میں موجودہ دور میں ان سے متاثر ہوکر ادب تخلیق کیا جارہا ہے۔ توسیعی خطبے میں صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے معروف نقاد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ پروفیسر عتیق اللہ جدید شاعر ہوا کرتے تھے اور تنقید میں بھی انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اردو ادب میں جدید تنقید اور مغربی نظریات کو متعارف کرانے میں ان کا خاص تعاون رہا ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے تعلق سے گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا نظیر اکبرآبادی کو ہندی زبان کا شاعر قرار نہیں دیا جاسکتا وہ خالص اردو زبان کے شاعر ہیں۔ اس سے قبل شعبۂ اردو کے چیئرمین پروفیسر سید محمد ہاشم نے توسیعی خطبے کا آغاز کرتے ہوئے پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر عبدالعلیم کا استقبال کیا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 15 مارچ 2016

اردو میں غیرافسانوی نثر: اصول ومباحث

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سینٹر آف ایڈوانسڈ اسٹڈی کے زیراہتمام اردو میں غیرافسانوی نثر: اصول و مباحث موضوع پر منعقدہ دو روزہ قومی سمینار کے آخری اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی، لکھنؤ کے شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ اعلیٰ درجے کا مزاح تخلیق کرنا شاعری سے کہیں زیادہ مشکل فن ہے، مزاح کے لیے ایک ایک لفظ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی

نے سوانح نگاری کے فن پر مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خودنوشت سوانح کا فن اور روایت شعری اصناف کی دین ہے۔ ڈاکٹر نیلم فرزانہ نے 'بری عورت کی کتھا' کے حوالے سے گفتگو کی۔ شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے سابق استاد پروفیسر یسین مظہر صدیقی، ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی، سمینار کے کنوینر ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب، ڈاکٹر عمر رضا کے علاوہ ریسرچ اسکالر محمد معروف نے بھی مقالہ پیش کیا۔ اس سے قبل شعبۂ اردو کے سربراہ پروفیسر سید محمد ہاشم نے مہمان کا استقبال کرتے ہوئے ان کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر اقبال حسین صدیقی نے نظامت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 31 مارچ 2016

یوم مادری زبان

آگرہ: 3 مارچ 2016 کو انڈین سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام مدرسہ عفیفہ ایجوکیشنل اکادمی، بودلہ آگرہ میں یوم مادری زبان کے مبارک موقعے پر ایک جلسے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت علامہ اقبال ایجوکیشن سوسائٹی کے صدر جناب محترم منان بھائی قریشی نے کی۔ جناب مولانا محمد غفران صاحب کی تلاوت سے جلسہ کا آغاز ہوا۔ جلسے میں خطاب کرتے ہوئے سید سرور حسین صاحب نے فرمایا کہ تمام لوگوں کا حق ہے کہ وہ اپنے مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں۔ جناب رضوان احمد نے کہا کہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے لوگوں کو خوشی اور کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اس موقعے پر محمد شارق ملک، ماسٹر مشتاق احمد ہاشمی، محترمہ فریدہ و آل انڈیا دینی مدارس بورڈ دہلی کے ترجمان مولانا قاری عبدالسبحان رحمانی نے اپنے مقالات پیش کیے۔ جناب مولانا محمد عزیر عالم کنوینر و ناظم جلسہ نے لوگوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دعا پر جلسہ کا اختتام کیا۔

پریس ریلیز: عفیفہ ایجوکیشنل اکادمی، بودلہ، آگرہ، 7 مارچ 2016

پنجاب:

ایک افسانوی نشست ڈاکٹر رینو بہل کے نام

مالیرکوٹلہ: پنجاب اردو اکادمی کے زیراہتمام ایک پروقار ادبی تقریب بعنوان 'ایک افسانوی نشست ڈاکٹر رینو بہل کے نام' منعقد کی گئی جس کی صدارت معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے کی اور شرومنی اردو ساہتیہ کار ایوارڈ یافتہ ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر رینو بہل نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور حسن نے شرومنی اردو ساہتیہ کار ایوارڈ حاصل کرنے والے ڈاکٹر محمد اقبال، مہیش پٹیالوی اور مہمان خاص ڈاکٹر رینو بہل کو مبارکباد پیش کی۔ اپنے خیرمقدمی کلمات میں سکریٹری موصوف نے ڈاکٹر رینو بہل کو صحیح معنوں میں اردو زبان کو دیوانی قرار دیتے ہوئے کہا کہ موصوفہ نے اپنے بل بوتے پر اردو سیکھی اور پھر ایم اے اردو کا امتحان گولڈ میڈل کے ساتھ پاس کیا اور پھر اردو ہی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ کر ایک تاریخ مرتب کی۔ تعجب ہوتا ہے کہ ڈاکٹر بہل نے کس طرح ایک غیراردو ماحول میں پرورش پاکر بھی اپنی ہمت، لگن اور محنت شاقہ سے وہ سب کچھ حاصل کیا جو اردو ماحول میں رہ کر بھی لوگ نہیں کرپاتے۔ معروف افسانہ نگار محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا خیرمقدم کرتے ہوئے سکریٹری موصوف نے کہا سرزمین پنجاب کے وہ معروف اور معتبر افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کو بیرون ملک میں بھی پڑھا اور سنا جاتا ہے اور ان کا ذکر خیر بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر منظور حسن نے فرمایا کہ موصوف کی سربراہی میں افسانہ کلب اردو افسانے کی آبیاری اور نئے لکھنے والوں کی تربیت جس طرح کررہا ہے، یہ بات اردو افسانے کے اور اس کے روشن مستقبل کی مظہر کہی جاسکتی ہے۔ اس افسانوی نشست میں ارشد منیم، محمد سالک جمیل براڑ، منصور عالم، ڈاکٹر انوار احمد انصاری، ایم انوار انجم، محمد بشیر اور ڈاکٹر رینو بہل نے افسانے پیش کیے۔ اکادمی

کے سکریٹری پروفیسر منظور حسن کے شکریے کے ساتھ ہی افسانے کی یہ پرشکوہ تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 18 مارچ 2016

تلنگانہ

ریجنل ڈائرکٹروں اور اسٹڈی سنٹرز کے کوآرڈینیٹروں کی میٹنگ

حیدرآباد: ''اردو محض اردو ادب کا نام نہیں ہے۔ اردو میں سائنسی علوم، سماجی علوم اور دیگر عصری علوم کی کتابوں کی آسان زبان میں منتقلی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اردو میڈیم خصوصاً مدارس کے طلبہ کو اردو میں تمام عصری علوم کی تعلیم کے مواقع فراہم کرانا اردو یونیورسٹی کی بنیادی ذمے داری ہے اور اس فرض کی ادائیگی کے لیے اردو یونیورسٹی پابند عہد ہے۔'' ان خیالات کا اظہار ڈاکٹر محمد اسلم پرویز، وائس چانسلر مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

نے نظامت فاصلاتی تعلیم کے مختلف ریجنل ڈائرکٹروں، اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹروں اور اسٹڈی سنٹروں کے کوآرڈینیٹروں کی میٹنگ میں کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر بتایا کہ مدارس کے طلبہ کو عصری علوم سے بخوبی مستفید کرنے کی غرض سے یونیورسٹی نے برج کورس (bridge Course) شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کورس کا نصاب تیار ہو چکا ہے اور تعلیمی سال کے آغاز سے قبل درسی مواد بھی تیار کرلیا جائے گا۔

وائس چانسلر نے اس موقعے پر انگریزی کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج انگریزی بین الاقوامی زبان کی حیثیت اختیار کرگئی ہے اور سخت مسابقت کے اس دور میں وہی طلبہ کامیاب ثابت ہوسکتے ہیں جن کی اپنے مضمون کے ساتھ ساتھ انگریزی کی استعداد بھی بہت اچھی ہو۔ اس سلسلے میں یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی نے Communicative English پڑھانے کے لیے ایک ایسا نصابی خاکہ تیار کیا ہے جس کے تحت گریجویشن کے تیسرے سال تک آتے آتے اردو میڈیم کے طلبہ انگریزی میں جواب لکھنے اور بولنے کے قابل ہوجائیں گے۔ انھوں نے کہ ان کی پوری کوشش ہے کہ اردو میڈیم طلبہ اعلیٰ تعلیم سے پوری طرح بہرہ ور ہوسکیں۔

وائس چانسلر نے اس موقعے پر اس عزم کا اظہار بھی کیا کہ جلد ہی یونیورسٹی روایتی اور فاصلاتی طرز کے تحت پیشہ ورانہ کورسیز اور بی اے، ای ایس سی اور بی کام میں آنرز بھی شروع کرے گی۔

ابتدا میں نظامت فاصلاتی تعلیم کے ڈائرکٹر پروفیسر کے آر اقبال احمد نے تمام حاضرین کا استقبال کیا اور نظامت فاصلاتی تعلیم کی کارکردگی اور اس شعبے کو درپیش مسائل پر مختصر روشنی ڈالی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 12 مارچ 2016

جموں کشمیر

آئینِ جموں و کشمیر کا اردو ترجمہ

جموں کشمیر: مشہور ادیب و سینئر ایڈوکیٹ شری شام سندر آنند لہر نے آئین جموں و کشمیر کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا ہے کہ ریاستی آئین ریاست کی سرکاری زبان میں لوگوں کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اسے جے کے لا ہاؤس نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں ریاستی ہائی کورٹ کے جج صاحبان جناب محمد یعقوب میر، مظفر حسین عطار و سینئر ایڈوکیٹ پی ایس دتہ کے علاوہ شہاب عنایت ملک صدر شعبۂ اردو جموں یونیورسٹی، مشتاق صدف پروگرام ایکزیکیوٹو و سکریٹری انجمن ترقی اردو ادب، اطہر فاروقی کے پیغامات شامل ہیں۔ آنند لہر نے اردو کی تیرہ کتابیں لکھی ہیں۔ ٹی وی سیریل بھی لکھے ہیں۔

رپورٹ: آنند لہر، پلاٹ نمبر 19، بخشی نگر، جموں، مارچ 2016

'معاصر اردو افسانہ: مزاج و منہاج' کے موضوع پر منعقدہ سمینار کا منظر

معاصر اردو افسانہ: مزاج و منہاج

نظامت فاصلاتی تعلیم کشمیر یونی ورسٹی کے کانفرنس ہال میں جموں و کشمیر اردو فکشن رائٹرس گلڈ کے اشتراک سے دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'معاصر اردو افسانہ: مزاج و منہاج' کی افتتاحی نشست 23 مارچ 2016 بروز بدھ صبح ساڑھے گیارہ بجے منعقد ہوئی۔ نشست کی صدارت مشہور ماہر اقبالیات پروفیسر بشیر احمد نحوی نے کی جب کہ ریاست اور بیرون ریاست سے تشریف لائے مہمانان ذی وقار میں جناب بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر غضنفر علی، ڈاکٹر ترنم ریاض، پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، پروفیسر عارفہ بشریٰ اور نظامت فاصلاتی تعلیم جامعہ کشمیر کی ناظمہ پروفیسر نیلوفر خان موجود تھیں۔ سمینار میں ریاست اور بیرون ریاست سے متعدد نامور فکشن نگاروں کے ساتھ ساتھ ریسرچ اسکالرس اور طلباء و طالبات کی ایک کثیر تعداد نے حصہ لیا۔ پروفیسر نیلوفر خان نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا اور اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں ادارۂ فاصلاتی تعلیم کے رول کو فخر کے ساتھ سراہا۔ ڈاکٹر عرفان عالم نے سمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار اپنی نوعیت کے اعتبار سے اس لیے اہم اور دلچسپ ہے کہ اس میں افسانہ نگاروں کا نام مخفی رکھ کر تجزیہ نگار کو ہر طرح سے آزادی فراہم کی گئی ہے تاکہ وہ کسی بھی قسم کی بندش یا مجبوری کا شکار نہ ہوکر خالص اور معیاری تجزیہ پیش کرے۔ دہلی سے تشریف لائے مشہور فکشن نگار ڈاکٹر غضنفر علی نے بصیرت افروز اور کثیر الجہت کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس سمینار سے معاصر فکشن کو نئی روشنی حاصل ہوگی۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے نظامت فاصلاتی تعلیم کی

ادبی سرگرمیوں کو سراہا جبکہ مشہور افسانہ نگار بشیر مالیر کوٹلوی نے افسانے کو کسی ایک خاص سانچے میں نہ رکھنے کی بات کی۔ پروفیسر بشیر احمد نحوی نے دلّی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فکر انگیز صدارتی خطبہ پیش کیا۔ نشست کی نظامت ڈاکٹر الطاف انجم نے کی۔ جبکہ شکریے کی تحریک جموں و کشمیر اردو فکشن رائٹرس گلڈ سے وابستہ جناب سلیم سالک نے پیش کی۔

سمینار کی دوسری نشست کے ایوانِ صدارت میں جناب غلام نبی شاہد، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اور جناب ناصر مرزا براجمان تھے۔ اس نشست میں کل دو افسانے پڑھے گئے۔ پہلا افسانہ جناب راجہ یوسف نے ''نقشِ فریادی' کے عنوان سے پڑھا جس پر ڈاکٹر پرویز اعظمی نے افسانے کے اجزائے ترکیبی کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا۔ دوسرا افسانہ جناب مشتاق مہدی نے پڑھا جس کا تجزیاتی مطالعہ ڈاکٹر مشتاق حیدر نے پیش کیا۔ اس نشست میں ڈاکٹر ریاض توحیدی نے اپنا افسانہ 'سفید کبوتر' حاضرینِ مجلس کے سامنے پیش کیا جس کا تجزیہ سبزار احمد بٹ نے سنایا۔

دو روزہ قومی سمینار بعنوان 'معاصر اردو افسانہ: مزاج و منہاج' کے دوسرے روز یعنی 24 مارچ 2015 کو دو نشستیں منعقد ہوئیں۔ تیسری نشست صبح گیارہ بجے شروع ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر غضنفر، پروفیسر شہاب عنایت ملک اور ڈاکٹر ترنم ریاض نے کی۔ اس میں تین افسانے اور ان کے تجزیے پیش کیے گئے۔ مشہور افسانہ نگار حسین الحق کا افسانہ 'مٹی کے ڈھیر سے' سرتاج احمد نے پڑھ کر سنایا، دوسرا افسانہ ڈاکٹر عرفان عالم نے 'ستی' کے عنوان سے اور تیسرا افسانہ ایثار کشمیری نے 'لہو بھرا وطن' کے عنوان سے پیش کیا جب کہ ان افسانوں پر بالترتیب ڈاکٹر کوثر رسول، ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اور پروفیسر شہاب عنایت ملک نے تجزیے پیش کیے۔ آخری نشست ظہرانے کے وقفے کے بعد منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر نذیر احمد ملک، جناب ناصر مرزا اور پروفیسر نیلوفر ناز نحوی نے کی۔ اس نشست میں جو افسانے پڑھے گئے اُن میں غضنفر کا 'حکمت' غلام نبی شاہد کا 'سلام الدین اداس کیوں ہے'، بشیر مالیر کوٹلوی کا 'اہلِ کتاب'، رافعہ ولی کا 'کھیت' اور ترنم ریاض کا 'مجسمہ' شامل ہیں۔ ان کہانیوں کے تجزیے جناب بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر الطاف انجم اور ڈاکٹر محی الدین زور نے پیش کیے۔ پہلی نشست کی نظامت ڈاکٹر الطاف انجم نے جب کہ دوسری نشست کی نظامت ڈاکٹر عرفان عالم نے انجام دی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر الطاف انجم، اسسٹنٹ پروفیسر اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، کشمیر یونیورسٹی 6 اپریل 2016

تہذیب و ثقافت

اردو سروس کی مجلس نشاط

نئی دهلی: آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروسیز ڈویژن کی اردو سروس کی 50 سال مکمل ہونے کے اعزاز میں ایوان غالب آڈیٹوریم میں 'مجلس نشاط' محفل قوالی کا اہتمام کیا گیا، جس میں دورِ حاضر کے مشہور معروف قوال اسلم صابری، چنچل بھارتی اور غلام صابر و غلام وارث نے اپنے فن سے لوگوں کو مسحور کیا۔ اس موقعے پر پرسار بھارتی کے چیئرمین سوریہ پرکاش نے کہا کہ اردو سروس نے محنت و مشقت کے ساتھ آدھی صدی مکمل کرلی ہے۔ پڑوسی ملک کے ساتھ ساتھ بے شمار لوگ اردو سروس کو چاہنے والے ہیں۔ پروگرام کی نظامت صحافی تحسین منور نے کی۔ انھوں نے قوالی کے حوالے سے کہا کہ یہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت بن چکی ہے، صوفیہ کی بارگاہ سے اس کی شروعات ہوئی، حضرت امیر خسرو نے حضرت نظام الدین اولیا کے لیے قوالی گائی اور آج ہمارے محفل کی زینت بن چکی ہے۔ واضح رہے کہ عوام کے ذریعے رابطہ کاری کے استحکام اور مشترکہ ثقافتی وراثت کے احیا کے لیے 24 اکتوبر 1956 کو اردو سروس کا آغاز کیا گیا۔ چند برسوں میں ای ایس ڈی کی اردو سروس مقبول اور اہم ترین سروس کی حیثیت سے مضبوط ہوتی چلی گئی، جس کے شائقین کی پاکستان میں بھی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ اس سروس نے سرحد پار سے فنکاروں اور دانشوروں کو دعوت دے کر سیاسی تقسیم سے پیدا ہوجانے والی کمی کو پاٹنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اے آئی آر کے ڈی جی فیاض شہریار نے کہا کہ اردو سروس کے سننے والے بیرون ممالک کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اردو کسی فرقے یا مذہب کی زبان نہیں ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 مارچ 2016

اعزاز و اکرام

اتر پردیش اردو اکادمی کے انعامات برائے سال 2015

لکھنئو: اتر پردیش اردو اکادمی نے 2015 کے انعامات کا اعلان کردیا ہے۔ پانچ لاکھ روپے پر مشتمل مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ ندا فاضلی کو پس از مرگ دیا گیا ہے۔ مجموعی ادبی خدمات کے لیے پانچ انعام ایک لاکھ روپے کے شاعری کے لیے اجمل سلطانپوری، محترمہ مسرور جہاں کو برائے فکشن، پروفیسر فضل امام کو تحقیق و تنقید، ادب اطفال کے لیے ماہ نامہ نور، رامپور اور دیگر علوم میں طنز و مزاح کے لیے نصرت ظہیر دہلی اور منظور عثمانی دہلی کو منتخب کیا گیا ہے۔ امیر خسرو انعام سابق گورنر عزیز قریشی کو دیا جائے گا۔ اس کی رقم ایک لاکھ پچاس ہزار روپے ہے۔ ڈاکٹر صغریٰ مہدی قومی یکجہتی انعام ایک ایک لاکھ روپ کے دو انعامات پروفیسر اختر الواسع، دہلی اور ڈاکٹر صغیر افراہیم، علی گڑھ کو دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پریم چند سے منسوب ایک لاکھ روپے کا انعام ڈاکٹر علی احمد فاطمی، الہ آباد کو دیا جائے گا۔ صحافت کے شعبے میں 50-50 ہزار کے تین انعامات کے لیے پرنٹ میڈیا میں وضاحت حسین رضوی، الیکٹرانک میڈیا کے شعبے میں ثروت عثمانی ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو رامپور اور میڈیا ہاؤس کے انعام کے لیے روزنامہ صحافت کو منتخب کیا گیا ہے۔ کتابت کیلی گرافی کے زمرے میں 25 ہزار روپے پر مشتمل انعام کے لیے وہاج الحق، مراد آباد کاشف کو منتخب کیا گیا۔ ناشر انعام کے لیے عرشیہ پبلی کیشنز دہلی کو 25 ہزار روپے کا انعام دینے کا اعلان کیا گیا۔ اس کے علاوہ مختلف زمروں میں کتابوں پر بھی انعامات دینے کا اعلان کیا گیا۔ تحقیق و تنقید، فکشن شاعری، ناول، سائنس اور ادب اطفال وغیرہ پر مبنی کتابوں میں 20-20 ہزار روپے کے آٹھ انعامات، 15-15 ہزار روپے کے دس انعامات، 10-10 ہزار روپے کے 21 اور پانچ پانچ ہزار روپے کے 114 انعامات کا اعلان ہوا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مارچ 2016

بہار اردو اکادمی ایوارڈ

پٹنہ: بہار اردو اکادمی نے ادبا، شعرا اور صحافیوں کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں سال 2014 اور 2015 کے ایوارڈ کا اعلان کردیا۔ اکادمی کے سکریٹری مشتاق احمد نوری نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ اربابِ علم و قلم کی عزت افزائی، زبان و ادب کے روشن حال و مستقبل کی ضمانت بھی ہے اور اس کی موثر علامت بھی۔ اکادمی کے سکریٹری نے ضروری تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ ایک لاکھ اکیاون ہزار کے سید سلیمان ندوی اور شاد عظیم آبادی ایوارڈ دیے جائیں گے، ایک لاکھ ایک ہزار کا اختر اورینوی ایوارڈ فکشن کے لیے عبدالقادر بیدل عظیم آبادی ایوارڈ شاعری کے لیے اور قاضی عبدالودود ایوارڈ تحقیق و تنقید کے لیے دیا جائے گا۔ اکیاون ہزار کا تنقید کے لیے کلیم الدین احمد ایوارڈ، فکشن کے لیے سہیل عظیم آبادی ایوارڈ، شاعری کے لیے بسمل عظیم آبادی ایوارڈ اور صحافت کے لیے غلام سرور ایوارڈ دیا جائے گا۔ سال 2015 کے لیے ایوارڈ کی تفصیل

کچھ اس طرح ہے: محترمہ جیلانی بانو (شاد عظیم آبادی ایوارڈ)، جناب ابوالکلام قاسمی (سید سلیمان ندوی ایوارڈ)، جناب عبدالصمد (اختر اورینوی ایوارڈ)، ڈاکٹر عبدالمنان طرزی (عبدالقادر بیدل عظیم آبادی)، ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین (قاضی عبدالودود ایوارڈ)، جناب اسلم آزاد، جناب انور پاشا، جناب ابرار رحمانی، ڈاکٹر منظر اعجاز، جناب صفدر امام قادری، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر محفوظ الحسن (کلیم الدین احمد ایوارڈ)، جناب زبیر الحسن غافل، جناب اجے کمار بیباک (بسمل عظیم آبادی ایوارڈ)، پروفیسر طارق جمیلی، جناب غضنفر، پروفیسر قمر جہاں جناب مشرف عالم ذوقی (سہیل عظیم آبادی ایوارڈ)، جناب اشرف استھانوی، جناب عابد انور (غلام سرور ایوارڈ)، سال 2014 کے لیے ایوارڈ کی تفصیلات درج ذیل ہیں: پروفیسر شکیل الرحمن (سید سلیمان ندوی ایوارڈ)، جناب جوگندر پال (شاد عظیم آبادی ایوارڈ)، جناب ارتضیٰ کریم (قاضی عبدالودود ایوارڈ)، جناب شمویل احمد، ڈاکٹر حسین الحق محترمہ ذکیہ مشہدی، جناب پیغام آفاقی (سہیل عظیم آبادی ایوارڈ)، جناب ظہیر صدیقی، جناب علیم صبا نویدی، جناب قوس صدیقی، جناب معین کوثر، جناب سیف سہسرامی، جناب پروین کمار اشک، جناب ناشاد اورنگ آبادی (بسمل عظیم آبادی ایوارڈ)، جناب نورالہدیٰ (کلیم الدین احمد ایوارڈ)، جناب سید رضی حیدر، جناب ریاض عظیم آبادی، جناب احمد جاوید، جناب ایس ایم اشرف فرید، جناب خورشید پرویز صدیقی، جناب سید عبدالرافع (غلام سرور ایوارڈ)۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 17 مارچ 2016

مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی انعامات

ممبئی: مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے یہاں شعراء، ادبا، اردو صحافیوں، ممتاز مسلم شخصیات، اساتذہ کرام اور دیگر کے ناموں کا اعلان کیا ہے جنھیں سال 2014 کے اکادمی انعامات سے نوازا جائے گا۔ یہ اطلاع اکادمی کے کارگزار صدر عبدالرؤف خان نے ایک اخباری کانفرنس کے دوران دی۔ انھوں نے بتایا کہ قومی، ریاستی اور مطبوعہ کتابوں پر پہلا انعام سنت گیانیشور قومی انعام ڈاکٹر پنڈت آنند موہن زتشی عرف گلزار دہلوی کو دیا جائے گا جو کہ اکیاون ہزار روپے اور ایک مومنٹو پر مشتمل ہوگا۔ اسی طرح سے ولی دکنی قومی ایوارڈ مالیگاؤں کے مقیم اثر بیالوی، سراج اورنگ آبادی ریاستی ایوارڈ ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر، ستو مادھو راؤ پگڑی مراٹھی اردو ترجمہ انعام ڈاکٹر اکشے کمار کالے ناگپور اور ساحر لدھیانوی ایوارڈ نوجوان فلم رائٹر رئیس سہری کو دیے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔

نامور اردو صحافی ہارون رشید (علیگ) کے نام سے منسوب صحافتی ایوارڈ چار اردو صحافیوں کو دیا جائے گا جس میں اورنگ آباد ٹائمز کے مدیر شعیب خسرو، خبر رساں ایجنسی یو این آئی اردو سروس کے نمائندے اعجاز احمد، ایشیا ایکسپریس کے نمائندے سلیم احمد اور ناگپور سے شائع ہونے والے ہفتہ روزہ اردو اخبار کے مدیر نظام الدین انصاری کا نام شامل ہے۔ ان چاروں ایوارڈ یافتگان کو دس ہزار روپے کی رقم بھی دی جائے گی۔ اسی طرح سے لے آؤٹ ڈیزائن کے لیے کامل شیخ کے نام کا اعلان کیا گیا جن ادبا کو ایوارڈ دینے کا فیصلہ دیا گیا ہے اس میں خلیق الزماں نصرت بھیونڈی، محمود حسن الہ آبادی بھیونڈی، پروفیسر ظہیر علی، انصاری محمود پرویز، شاہد رشید اور عبدالحمید محمد ہاشم شامل ہیں۔ اردو اکادمی کے کارگزار صدر عبدالرؤف خان نے مزید کہا کہ شعرائے کرام کو ان کے مجموعہ کلام کی اشاعت پر بھی مختلف انعامات سے نوازا جائے گا جن میں ارتضیٰ نشاط، احمد سوز، اعلیٰ پولیس افسر و شاعر قیصر خالد اور شکیل اعظمی کا نام شامل ہے۔ مختلف شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والی نمائندہ مسلم شخصیات کو بھی ایوارڈ دیے جانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس میں عبدالمجید پاریکھ، صفدر کرمالی، اقبال میمن آفیسر، فرید شیخ، عبدالکریم سالار کے علاوہ دو اعلیٰ پولیس افسران ڈاکٹر بھوشن کمار اپادھیائے اور کرشن پرکاش کا نام بھی شامل ہے۔ اردو اساتذہ کرام کو مثالی ٹیچر ایوارڈ بھی دیا جائے گا جس میں زینت جاوید خان، نعیم الدین افضل الدین، زاہدہ حامد اقبال صدیقی اور دیگر کا نام شامل ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 18 مارچ 2016

ڈاکٹر تنویر گوہر کو ایوارڈ

مظفر نگر: اردو کے مشہور شاعر اور تین کتابوں کے مصنف ڈاکٹر تنویر گوہر کو ان کے تیسرے مجموعہ کلام عکس تنویر کے لیے پاشا اردو لائبریری کی جانب سے غالب ایوارڈ پیش کیا گیا۔ صبح پیغام انسانیت کے میٹنگ ہال میں ایک تقریب میں لائبریری کے صدر پچاس سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور اسلامی اسکالر قاضی فرید پاشا آزاد نے تنویر گوہر کو یہ ایوارڈ پیش کیا۔ پیغام انسانیت کے صدر حاجی محمد آصف راہی نے صدارت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 مارچ 2016

گلزار دہلوی، شاہد علی خان اور وقار مانوی کے اعزاز میں تقریب

نئی دہلی: ادبی مرکز غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی نے دہلی کی 3 شخصیات پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی، مکتبہ جامعہ کے سابق سرگرم کارکن شاہد علی خان اور معروف شاعر وقار مانوی کی خدمات کے اعتراف میں ایک جلسے کا انعقاد کیا۔ پروگرام کے آغاز میں افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکادمی کی 47 سالہ تاریخ میں آج پہلا موقع ہے جب ہم اکادمی کی طرف سے اپنے بزرگوں کی خدمات کے اعتراف میں جلسہ کررہے ہیں۔ تینوں حضرات نے اپنے اپنے میدان میں اردو کی بےلوث خدمت کی ہے۔ اس موقع پر غالب اکادمی کے صدر اور معروف نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ گلزار دہلوی ایک معروف علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں انھوں نے پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور نواب سراج الدین احمد سائل دہلوی سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ انھوں نے دہلی اسکول کی روایت کو زندہ رکھا بلکہ اسے نئی منزلوں سے بھی روشناس کرایا۔ شاہد علی خاں کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ شاہد علی خاں نے مکتبہ جامعہ ممبئی میں اپنی ملازمت کے دوران اسے ادیبوں و شاعروں کا مرکز بنا دیا اور دہلی آئے تو مکتبہ جامعہ کو اردو کا سب سے بڑا اشاعت گھر اور ادبی مرکز بنا دیا، بے شمار علمی و ادبی کتابیں شائع کیں۔ وقار مانوی کے بارے میں پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ وقار مانوی ایک انفرادی حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے دہلی کے ادبی و شعری ماحول پر گہری چھاپ چھوڑی ہے اور اپنے شاگردوں کے ساتھ شہر دہلی کی شعری روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اس موقع پر پروفیسر شمیم حنفی نے تینوں حضرات کو غالب اکادمی کی طرف سے ایک شال، مومنٹو اور نذرانہ پیش کیا۔ اس موقع پر پروفیسر خالد محمود اور پروفیسر وہاج الدین علوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ آخر میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 12 مارچ 2016

ایک شام مسرور جہاں کے نام

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول میں 'ایک شام مسرور جہاں کے نام' موضوع پر علمی و ادبی تقریب کا انعقاد کیا۔ تقریب کی صدارت آل انڈیا ریڈیو دہلی کی انگلش نیوز ریڈر سائرہ مجتبیٰ اور نظامت اسکول کے بانی منیجر ڈاکٹر منصور حسن خان نے کی۔ بطور مہمان خصوصی سہرش مجتبیٰ اور ڈاکٹر ثروت تقی شریک ہوئے۔ استقبالیہ شکیل گیاوی نے پیش کیا۔ واضح رہے کہ مسرور جہاں اردو ادب کی عالمی شہرت یافتہ افسانہ نگار، ناول نگار اور مضمون نگار ہیں۔ ان کے تقریباً پانچ درجن ناول اور پانچ سو سے زیادہ افسانے منظر عام پر آچکے ہیں

اور حکومت ہند کی اردو نصابی کتابوں میں ان کی تخلیقات بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ ان دنوں سائرہ مجتبیٰ ان کی تخلیقات کو انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے غیر اردو داں طبقے تک پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اس موقعے پر سائرہ مجتبیٰ نے کہا کہ میری پرورش خالص اردو ماحول میں ہوئی مگر انگریزی کی طرف میرا رجحان صرف اس لیے ہوا کہ عام طور اردو جاننے والے انگریزی سے ناواقف ہوتے ہیں اور ان کے رجحانات وافکار اردو تک ہی محدود ہو کر رہ جاتے ہیں۔ مسرور جہاں کی کتابوں کے ترجمے کا اصل مقصد یہ ہے کہ انگریزی داں طبقہ بھی مسرور جہاں کے افکار و خیالات سے روشناس ہو سکے۔ مسرور جہاں نے گذشتہ نصف صدی کے تجربے کی روشنی میں اسکول کے بچوں اور دیگر سامعین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ موجودہ حالات میں نثری ادب میں زوال آیا ہے خصوصاً الیکٹرانک میڈیا پر نشر ہونے والی کہانی اور افسانے بچوں پر اخلاقیات کے حوالے سے مضر اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ انھوں نے بال بھارتی کتاب میں مطبوعہ کہانی 'شال فروش' سناتے ہوئے نہ صرف بچوں اور سامعین کو رلا دیا بلکہ خود بھی نمدیدہ ہو گئیں۔ پروگرام کے آخر میں ڈاکٹر منصور حسن نے تمام شرکا اور مندوبین خصوصاً مسرور جہاں کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 15 مارچ 2016

رسم اجرا

ہفت رنگ تحریریں

علی گڑھ: اردو ایک زبان ہی نہیں تہذیب ہے جو ہندوستانی تمدن و راست ہے۔ اردو غیر منقسم ہندوستان میں رابطے کی زبان تھی آج عالمی سطح پر اس کو مقبولیت حاصل ہے۔ ان خیالات کا اظہار مہمانِ خصوصی معروف ناول نگار عارف مارہروی (راجونش) نے کیا۔ وہ بزمِ ہم قلم علی گڑھ کے زیر اہتمام منعقد معروف ادیب وصحافی ایس آر پوری کی مرتب کردہ مطبوعہ تخالیق کا انتخاب 'ہفت رنگ تحریریں' کی رسم اجرا کی تقریب کے موقعے پر کیا۔ مہمان ذی وقار شعبہ فارسی اے ایم یو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر قمر عالم نے ہفت رنگ تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس انتخاب میں اردو دنیا کے جن نامور ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے، ان میں عصمت چغتائی، سعات حسن منٹو، سجاد ظہیر، جوش ملیح آبادی، رضا جعفری، مشتاق یوسفی، مجتبیٰ حسین، پرکاش پنڈت، آنند لہر، سوہیل وحید، محمد قیوم میو اور اختر آزاد جیسے معروف ادیبوں کی مقبولِ عام تحریریں شامل ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 مارچ 2016

پیغام شریعت

نئی دھلی: ادارہ پیغام شریعت کے زیر اہتمام غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین میں 'ماہنامہ پیغام شریعت' کی رسم اجرا کے موقعے پر 'اسلامی صحافت: دائرہ کار اور تقاضے' کے عنوان سے ایک سمپوزیم کا انعقاد عمل میں آیا۔ مولانا قاسم مصباحی نے استقبالیہ کلمات پیش کرتے ہوئے ماہنامہ کے اغراض و مقاصد اور اس کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ عصر حاضر کے مطابق اسلامی اور عصری مسائل کا حسین امتزاج قارئین کے سامنے پیش کریں۔ پروگرام کی نظامت ماہنامہ کنز الایمان کے ایڈیٹر مولانا محمد ظفر الدین برکاتی نے کی۔ پیغام شریعت کے نائب مدیر مولانا آفتاب عالم مصباحی نے ماہنامہ کے حوالے سے اپنے تجربات پیش کیے۔ کلیدی خطاب پیش کرتے ہوئے مولانا کوثر امام قادری نے کہا کہ آج اسلامی صحافت کو پوری ذمہ داری کے ساتھ لوگوں تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ مولانا غلام جابر شمس مصباحی نے افتتاحی تقریر میں مکاتیب نبوی جو انھوں نے مختلف بادشاہوں کو پیش کیے، کو صحافت کا نقطۂ آغاز قرار دیا۔ مولانا تاج محمد خان ازہری نے صحافت کے حوالے سے بہت اہم و مفید مشورے دیے۔ صحافی اسفر فریدی نے کہا کہ ہم روزانہ 5 وقت اذان سنتے ہیں جو کہ اسلامی صحافت کی ایک قسم ہے۔ انھوں نے صحافت کی باریکیوں کے سلسلے میں اپنے تجربات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 مارچ 2016

عورت خود کو پہچانے: بھارت میں عورتوں سے متعلق قانون

نئی دھلی: دورِ حاضر میں غالب اور شیرازی جیسی حاضر دماغی اور ذہانت کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ ان خیالات کا اظہار ہندوستان کے چیف جسٹس آف انڈیا جسٹس تیرتھ سنگھ ٹھاکر نے اپنی رہائش گاہ میں 'عورت خود کو پہچانے: بھارت میں عورتوں سے متعلق قانون' نامی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اس کتاب کا پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔ ایک مختصر اور پروقار تقریبِ اجرا میں گفتگو کرتے ہوئے چیف جسٹس نے دونوں مصنّفین کی تحریروں اور شخصی کارناموں کی ستائش کرتے ہوئے انھیں مبارکباد بھی دی۔ کتاب کا اجرا کرتے ہوئے چیف جسٹس نے حافظ شیرازی، مرزا غالب اور علامہ اقبال کے اشعار بھی سنائے۔ اقبال کے مشہور شعر کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس زمانے میں صرف تغیر کے علاوہ کسی چیز کو ثبات حاصل نہیں۔ یہ کتاب دہلی ہائی کورٹ کی جج ڈاکٹر سنگیتا ڈھینگرہ سہگل اور قانونی معاملات کے ماہر صحافی حسن خورشید نے مشترکہ طور پر انگریزی زبان میں تصنیف کی ہے۔ تقریب میں حاضرین سے گفتگو کرتے ہوئے مصنّفین نے بتایا کہ اس کتاب میں تاریخی تناظر میں عورتوں کی عظمت اور ان کی سماجی و معاشی حیثیت کو اجاگر کر کے خواتین میں اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں کتاب میں لڑکیوں کی جنین کشی، عصمت دری اور دست اندازی کی وارداتیں روکنے کی تجاویز، ناموس کی خاطر قتل، اغوا کاری، تیزابی حملوں اور عورتوں کے تحفظ سے متعلق دیگر پہلوؤں پر بھی تفصیل سے تبادلۂ خیال کیا گیا۔

'عورت خود کو پہچانے: بھارت میں عورتوں کے متعلق قانون' کا اجرا

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 مارچ 2016

تمہاری یاد میں اکثر

دیو بند: بزم ادب دیوبند کی جانب سے ایڈوکیٹ فرحا علی کے مکان پر ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں دیوبند کے نوجوان شاعر ڈاکٹر صادق دیوبندی کے مجموعۂ کلام 'تمہاری یاد میں اکثر' کا رسم اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام کا افتتاح طنز و مزاح کے شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کیا۔ سماجی کارکن ڈاکٹر ایس اے عزیز عاشق علی کی صدارت میں منعقدہ پروگرام میں مہمان خصوصی کے طور پر معروف شاعر عبداللہ راہی نسیم سہارنپوری اور ناظم اشرف کرت پوری نے شرکت کی، پروگرام سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کتاب کی ستائش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 19 مارچ 2016

اسلم جمشید پوری کی کتاب 'عیدگاہ سے واپسی' کا اجرا

ظہیر علی صدیقی نے بھی اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 مارچ 2016

عیدگاہ سے واپسی

میرٹھ: نئی نسل کے ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے تازہ افسانوی مجموعے 'عیدگاہ سے واپسی' نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ بارہ افسانوں پر مشتمل اس مجموعے کی پہلی اشاعت اگست 2015 میں ہوئی تھی۔ اس کا پہلا اجرا، 13 اکتوبر کو جمشید پور میں محترم سید رضا عباس رضوی کی صدارت میں مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد کے ہاتھوں اور دوسرا اجرا، 20 دسمبر کو میرٹھ میں اتراکھنڈ کے سابق گورنر عالی جناب عزیز قریشی کے دستِ مبارک سے عمل میں آیا تھا۔ چھ ماہ کی قلیل مدت کے بعد اس مجموعے کا دوسرا ایڈیشن پروفیسر حسین الحق، ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی اور ابرار مجیب کے تنقیدی مضامین کے ساتھ پھر منظر عام پر آ گیا ہے۔ دوسرے ایڈیشن کا اجرا میرٹھ یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر این کے تنیجا، پروفیسر شہپر رسول (صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ)، پروفیسر فاروق بخشی (صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڈیہ یونیورسٹی، اودے پور) اور ڈاکٹر معراج الدین احمد (سابق وزیر، اتر پردیش) کے ہاتھوں ہوا۔ دونوں ایڈیشنز کی اشاعت کا اہتمام عرشیہ پبلی کیشنز کے اظہار ندیم نے کیا ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 23 مارچ 2016

کلیاتِ ثروت

رامپور: خانقاہوں کے ذریعے نہ صرف طریقت اور تصوف کی تشہیر ہوئی بلکہ شعر و سخن اور ادب معلی کی ترقی و ترویج بھی ہوئی۔ یہ بات رامپور جامع مسجد کے امام اور مفتی شہر مولوی محبوب علی شمسی نے مشہور صوفی شاعر مرحوم سید درویش احمد ثروت قادری کے مجموعہ کلام 'کلیات ثروت' کی تقریب اجرا میں کتاب کی رونمائی کرتے ہوئے کہی۔ اس موقعے پر کلیات ثروت کے مرتب ڈاکٹر جاوید نسیمی نے اپنے مقالے میں ثروت قادری کی شاعرانہ خدمات کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے خانقاہ سادات کے بارے میں بھی تفصیل بتائی۔ چیئرمین صولت پبلک لائبریری س ش عالم، آکاشوانی ڈائریکٹر ثروت عثمانی، ڈاکٹر حسن احمد نظامی، پروفیسر سید سعید احمد، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ڈاکٹر

تاریخ علم الادویہ

لکھنؤ: یوپی پریس کلب لکھنؤ میں کونسل برائے فروغ اردو زبان کی شائع کردہ کتاب تاریخ علم الادویہ مولفہ حکیم سید محمد حسان نگرامی کا رسم اجرا جلسہ کے مہمان خصوصی، حکومت ہند کے وزارت آیوش میں یونانی طب کے ایڈوائزر اور سی سی آر یو ایم نئی دہلی کے ڈائرکٹر جنرل پروفیسر رئیس الرحمان کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقع پر اتر پردیش یونانی خدمات کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سکندر حیات صدیقی نے یونانی طب میں وسیع تصنیفی کاموں کے لیے ڈاکٹر حسان نگرامی کو مبارکباد دیتے ہوئے اس طرح کے تحقیقی کاموں کے لیے ایک اکادمی قائم کرنے کا مشورہ دیا۔ مہمان ذی وقار ڈاکٹر وسیم احمد اعظمی ڈپٹی ڈائرکٹر سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن لکھنؤ نے طبی تحقیق کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر حسان نگرامی نے تاریخ علم الادویہ کے علمی سفر کا تفصیلی جائزہ پیش کیا۔ اس کے علاوہ دمہ کا علاج نامی کتاب مولفہ پروفیسر ڈاکٹر عارف اصلاحی اور امراض جلد اور ان کا یونانی علاج کے مولف ڈاکٹر احسان روف کی کتاب کا رسم اجرا بھی کیا گیا۔ جلسہ کو یونانی انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد، تکمیل الطب کے سابق پروفیسر ڈاکٹر سید غیاث الدین ندوی، آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اتر پردیش کے جنرل سکریٹری محمد خالد لکھنوی نے بھی خطاب کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر ایس ایم حسن، سابق ڈپٹی ڈائرکٹر (یونانی)

CRIUM، لکھنؤ، 28 مارچ 2016

وفیات:

انور سدید

اسلام آباد: سرکردہ پاکستانی صحافی اور مشہور اردو شاعر و ناقد انور سدید کا 20 مارچ 2016 کو سرگودھا میں انتقال ہوگیا۔ وہ 88 برس کے تھے۔ انور سدید جن کا اصل نام محمد انوار الدین تھا، غیر منقسم ہندوستان میں 4 دسمبر 1928 کو قصبہ میانی بھلوال سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ افسانہ، تنقید، انشائیہ، خاکہ، ادارت، شاعری، تبصرہ، ادبی صحافت، جائزہ نویسی اور شخصیت نگاری میں انھوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انور سدید نے پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو کیا۔ اس کے بعد 'اردو ادب کی تحریکیں' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا۔ یہ تحقیق اب بھی بیشتر یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ انور سدید اردو ادب کے حوالے سے عہد ساز شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ انور سدید پاکستان کے محکمہ آبپاشی سے بحیثیت ایگزیکیوٹیو انجینئر ریٹائرڈ ہوئے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں اردو زبان اور ادب کی خدمت اور ترویج کے لیے وقف کر دی تھیں۔ ان کی مشہور تصانیف میں اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، اردو ادب میں انشائیہ، اردو ادب کی مختصر تاریخ، اردو افسانے کی کروٹیں، اردو ادب میں سفرنامہ شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 مارچ 2016

رئیس الدین رئیس

علی گڑھ: اردو دنیا کے معروف استاد شاعر رئیس الدین رئیس کا یکم اپریل 2016 کو طویل علالت کے بعد علی گڑھ میں انتقال ہوگیا۔ وہ 66 سال کے تھے۔ رئیس الدین رئیس ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر تھے ان کی شاعری عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے یہاں عصر حاضر کے مسائل، طبقاتی کشمکش، فرقہ وارانہ منافرت، مادہ پرستی، افلاس، غربت، بے روزگاری، ظلم و ستم کی عکس ریزی کے ساتھ ساتھ معاشرتی ناہمواری کے خلاف پرعزم جدوجہد ہے۔ رئیس الدین رئیس کے پانچ مجموعہ کلام شائع ہوکر مقبول عام ہوچکے ہیں۔ انھیں متعدد انعامات سے سرفراز کیا گیا، رواں سال بھی اتر پردیش اردو اکادمی نے انھیں انعام سے سرفراز کیا۔ ان کے ادبی کارناموں پر مراٹھواڑہ پربھنی میں تحقیقی مقالہ پر سمیع اللہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی ہے جس کا عنوان 'رئیس الدین رئیس کی تنقیدی غزلوں کا جائزہ' ہے۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' علی گڑھ، 2 اپریل 2016

فاطمہ ثریا بجیا

کراچی: پاکستان کی معروف ادیبہ اور ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا

طویل علالت کے باعث 85 برس کی عمر میں انتقال کرگئی تھیں جنھیں کراچی کے مقامی قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ پاکستان کی معروف ڈراما نگار اور ادیبہ فاطمہ ثریا بجیا یکم ستمبر 1930 کو بھارتی شہر حیدرآباد دکن کے ضلع کرناٹک میں پیدا ہوئیں اور قیام پاکستان کے فوراً بعد اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی۔ فاطمہ ثریا بجیا ملک کی معروف ادبی شخصیت انور مقصود کی بہن تھیں۔ فاطمہ ثریا بجیا نے ٹیلی ویژن کے علاوہ ریڈیو اور اسٹیج کے لیے بے شمار ڈرامے لکھے جبکہ ان کے معروف ڈراموں میں 'شمع، افشاں، عروسہ، انا، تصویر، سمیت متعدد ڈرامے شامل ہیں۔ انھوں نے طویل دورانیے کا پہلا ڈراما 'مہمان' لکھا جبکہ انھوں نے بچوں کے لیے بھی ادبی پروگرام تحریر کیے۔ فاطمہ ثریا بجیا 1960 میں پی ٹی وی سے منسک ہوئیں اور 1966 میں آغا ناصر کے ڈرامے سے اداکاری کا آغاز کیا۔ ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا کی ادبی خدمات کے اعتراف میں 1997 میں حکومت پاکستان کی طرف سے تمغہ حسن کارکردگی سے نوازا گیا جبکہ 2012 میں ہلال امتیاز سے نوازا گیا۔ فاطمہ ثریا بجیا کو کئی قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے بھی نوازا گیا جس میں جاپان کا اعلیٰ ترین سول ایوارڈ بھی شامل ہے۔ معروف ادیبہ اور ڈراما نگار فاطمہ ثریا بجیا طویل عرصے سے علیل تھیں جس کے باعث وہ 86 سال کی عمر میں خالق حقیقی سے جاملیں۔

بی بی سی اردو، 11 فروری 2016

ندیم عرشی

امروهه: امروہہ کے مشہور شاعر ندیم عرشی کا دل کا دورہ پڑھنے سے ان کے آبائی شہر میں 65 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کا پورا نام علی منتظم رضا تھا۔ وہ اپنی نظموں، غزلوں، نعت، منقبت، سلام اور نوحوں کے لیے کافی مقبول تھے۔ وہ خود بھی کئی محافل کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی علی محتشم رضا دوردرشن نیوز میں خبریں پڑھتے تھے اور آج کل آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے وابستہ ہیں۔ مرحوم ندیم عرشی کو اعزا، اقربا اور چاہنے والوں کی کثیر تعداد کے درمیان امروہہ میں بجنور روڈ پر واقع کربلا میں ان کے آبائی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 اپریل 2016

خراج عقیدت

سرسید احمد خاں

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں کے 118 ویں یوم ارتحال پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے یونیورسٹی میں کئی پروگرام منعقد کیے گئے۔ نماز فجر کے بعد یونیورسٹی کی جامع مسجد میں قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، مختلف مساجد کے ائمہ حضرات اور دیگر ملازمین نے شرکت کی، نیز سرسید احمد خاں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے پرووائس چانسلر برگیڈیئر سید احمد علی نے سرسید کے مزار پر پھولوں کی چادر کی شکل میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر رجسٹرار ڈاکٹر اسفر علی خاں اور ڈی ایس ڈبلیو پروفیسر انیس اسماعیل کے علاوہ یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ اور ملازمین موجود تھے۔ سرسید احمد خاں کی ولادت 17 اکتوبر 1817 کو دہلی میں ہوئی تھی اور انھوں نے 27 مارچ 1898 کو علی گڑھ میں اس دارِ فانی سے رخصت لی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 مارچ 2016

ظفر اوگانوی کی یاد میں تقریب

پٹنه: محکمہ اقلیتی فلاح کے وزیر ڈاکٹر عبدالغفور نے کہا کہ بہار کے ان تمام گاؤں میں جہاں اردو آبادی ہے وہاں ایک اردو لائبریری قائم کی جائے گی جس کی نگرانی بہار اردو اکادمی کے ذمے ہوگی۔ حکومت نے یہ کام شروع کردیا ہے۔ ان لائبریریوں میں اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کی کتابیں، رسائل اور اخبارات بھی موجود ہوں گے۔ ڈاکٹر عبدالغفور ٹی پی ایس کالج میں معروف فکشن نگار ظفر اوگانوی کی یادگاری تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ جن اضلاع میں ایم ایس ڈی پی منصوبہ کے تحت کام ہورہا ہے ان اضلاع میں ہم اسی سال سے لائبریری کی عمارت کی تعمیر بھی شروع کردیں گے۔ وہاں یہ کام آسان بھی ہے، مگر جن اضلاع کو اس منصوبے میں شامل نہیں کیا گیا ہے وہاں بھی اقلیتی فلاح بھون کے نام سے عمارت کی تعمیر کرائی جائے گی۔ اس عمارت میں میٹنگ ہال بھی ہوں گے جہاں اقلیتوں کی پسماندگی دور کرنے کے لیے انھیں ہنرمند بنانے کا نظم بھی ہوگا۔ انھوں نے اردو زبان کے فروغ کے لیے اردو اخبارات خرید کر پڑھنے کا مشورہ دیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ظفر اوگانوی کے تعلق سے کہا کہ وہ ایک اچھے استاد اور ناقد کے ساتھ ایک بڑے فکشن نگار تھے اور انھوں نے اپنی امتیازی شان درج کرائی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ظفر اوگانوی نے اپنے تدریسی کریئر کا آغاز بھی اسی ٹی پی ایس کالج سے کیا تھا، جہاں آج ان کا پہلا یادگاری خطبہ منعقد کیا جارہا ہے۔ پروفیسر علیم اللہ نے اپنے صدارتی خطبے میں ظفر اوگانوی سے اپنی گہری وابستگی کا اظہار کیا اور ان کے ساتھ زندگی کے گزارے ہوئے خوبصورت لمحوں کا ذکر بھی کیا۔ اس سے پہلے مشہور افسانہ نگار شوکت حیات نے بھی ظفر اوگانوی کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ٹی پی ایس کالج کے پرنسپل تپن کمار نے استقبالیہ کلمات پیش کیے۔ انھوں نے کہا کہ ظفر اوگانوی کی یادگاری تقریب اب اس کالج میں ہر سال ہونی چاہیے۔ اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر ابوبکر رضوی نے کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مارچ 2016

پروفیسر محمود الٰہی کی دوسری برسی

لکھنؤ: اردو تحریک کے روحِ رواں ڈاکٹر احمد عباس ردولوی نے کہا کہ پروفیسر محمود الٰہی کو سب سے بڑا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ اردو داں طبقہ اپنے بچوں کو اردو تعلیم کی طرف راغب کرے۔ ڈاکٹر احمد عباس گورکھپور یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر محمود الٰہی کی دوسری برسی کے موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کررہے تھے۔ تقریب کی صدارت کرتے ہوئے ماہنامہ 'نیا دور' کے مدیر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے اپنے استاد پروفیسر محمود الٰہی کو جذباتی خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہ صرف ایک عظیم انسان بلکہ ایک مشفق استاد بھی تھے۔ اردو تحقیق اور تنقید کے میدان میں بھی ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ جلسے کی نظامت کرتے ہوئے اردو صحافی غفران نسیم نے اپنے مقالہ میں پروفیسر محمود الٰہی کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے انھیں اردو کا ایک معتبر خادم قرار دیا۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر سلیم احمد نے اپنے کو پروفیسر محمود الٰہی کا شاگرد ہونے پر فخر کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی کا اصل مقصد اردو زبان اور تعلیم کو انتہائی بلندیوں تک پہنچانا تھا۔ ان کے شاگردوں میں پروفیسر فضلِ امام، ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد، ڈاکٹر فیروز احمد، پروفیسر قاضی افضال، قاضی جمال وغیرہ نے اردو کی شمع روشن رکھنے میں اپنی فعال سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس موقعے پر صدر جلسہ ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو اردو زبان کی خدمات کے لیے ایک علامتی نشان اور شال پیش کی گئی۔ پروگرام کا اختتام ایک شعری نشست پر ہوا اور ڈاکٹر سلیم احمد نے سبھی مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 21 مارچ 2016

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

جگت موہن لال رواں (مونوگراف)

مصنف: صفیر افراہیم
صفحات: 146
قیمت: -/86 روپے

میر غلام حسن دہلوی (مونوگراف)

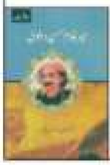

مصنف: قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
صفحات: 128
قیمت: -/77 روپے

محمد حسین آزاد (مونوگراف)

مصنف: ابوالکلام قاسمی
صفحات: 152
قیمت: -/85 روپے

غلام رسول نازکی (مونوگراف)

مصنف: قدوس جاوید
صفحات: 87
قیمت: -/65 روپے

رام لعل: حیات وفن (مونوگراف)

مصنف: مظہر محمود
صفحات: 201
قیمت: 105 روپے

شاد عارفی (مونوگراف)

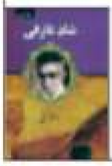

مصنف: مظفر حنفی
صفحات: 142
قیمت: 85 روپے

آغا حشر کاشمیری (مونوگراف)

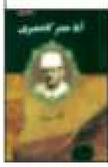

مصنف: یعقوب یاور
صفحات: 132
قیمت: -/81 روپے

شیخ محمد ابراہیم ذوق (مونوگراف)

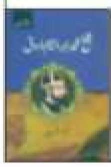

مصنف: کوثر مظہری
صفحات: 109
قیمت: -/72 روپے

ملا رموزی (مونوگراف)

مصنف: محمد نعمان خاں
صفحات: 128
قیمت: -/80 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد دوازدہم)

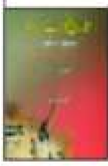

مصنف: محمد انصاراللہ
صفحات: 572
قیمت: -/243 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد سیزدہم)

انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 618
قیمت: -/259 روپے

تاریخ ادب اُردو (1838 تا 1857) (جلد چہاردہم)

انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 505
قیمت: -/215 روپے

تاریخ ادب اُردو (1858 تا 1911) (جلد پانزدہم)

انتخاب: محمد انصاراللہ
صفحات: 667
قیمت: -/277 روپے

پنجاب میں انقلابی وطن پرستی کی تحریک

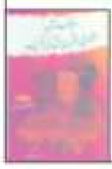

مصنف: ڈاکٹر ملیش موہن
مترجم: ڈاکٹر ہمت سنگھ سنہا
صفحات: 472
قیمت: -/206 روپے

ملاقاتیں (مشاہیر کے انٹرویو)

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 578
قیمت: -/241 روپے

گیت گاتے رہو

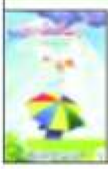

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 65
قیمت: -/14 روپے

آؤ گیت گائیں

مصنف: شبنم کمالی
صفحات: 73
قیمت: -/17 روپے

بچوں کا باغ

مصنف: ظفر کمالی
صفحات: 64
قیمت: -/24 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, May-2016, Vol.18, Issue:05
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication **24/04/2016**
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025